ہندوستان کے بہترین افسانے

مرتّب

حسن عبّاس رضا

منتخب ادب

Dost

ہندی کہانیاں-۲

پھنیشور ناتھ رینو　　ہردیش　　رام درش مشر

گری راج کشور　　سنجے کھاتی　　موہن راکیش

راجیند ریادو　　وجے موہن سنگھ　　نریندر جین

ستین کمار　　اُدے پرکاش

ترجمے

سلام بن رزاق　　بشیر عنوان

اگر سین نارنگ　　رفیق احمد نقش　　یعقوب خاور

عبدالعظیم سومرو　　اجمل کمال

انتخاب اور ترتیب

اجمل کمال

ہندی کہانیاں - ۲

ہندی کہانیاں - ۲

انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال

ISBN 969-8379-58-4

پہلی اشاعت (سہ ماہی ''آج''، شمارہ ۳۷): ۲۰۰۲ء
دوسری اشاعت (کتاب کی صورت میں): ۲۰۰۳ء

زیر اہتمام
آج کی کتابیں

کمپوزنگ: حمزہ گبول، انتظار علی
صفحہ سازی: امجد علی، عامر انصاری

طباعت: علمی گرافکس، کراچی

سٹی پریس بک شاپ
316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی 74400
فون: 5213916 - 5650623 (92-21)
ای میل: cp@citypress.cc
انٹرنیٹ: www.citypress.cc

ترتیب

پھنیشور ناتھ رینو	۹	تیسری قسم
پھنیشور ناتھ رینو	۳۹	لال پان کی بیگم
ہردیش	۵۰	توتے
رام درش مشر	۶۰	سڑک
گری راج کشور	۶۶	پانچواں پراٹھا
سنجے کھاتی	۷۴	پنٹی کا صابن
موہن راکیش	۸۳	اُس کی روٹی
موہن راکیش	۹۵	ایک اور زندگی
راجیندر یادو	۱۲۴	ٹوٹنا
وجے موہن سنگھ	۱۵۴	شیر پور ۱۵ میل
نریندر جین	۱۶۸	قلعہ
ستین کمار	۱۷۸	جہاز
اُدے پرکاش	۲۰۷	دلّی کی دیوار

پھنیشور ناتھ رینو

ہندی سے ترجمہ: اگر سین نارنگ

تیسری قسم

عرف مارے گئے گلفام

ہیرامن گاڑی بان کی پیٹھ میں گدگدی ہوتی ہے...

ہیرامن پچھلے بیس سال سے گاڑی ہانک رہا ہے، بیل گاڑی۔ وہ سرحد کے اس پار مورنگ راج نیپال سے دھان اور لکڑی ڈھو چکا ہے۔ کنٹرول کے زمانے میں اس نے چور بازاری کا مال اِس پار سے اُس پار پہنچایا ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس کی پیٹھ میں ایسی گدگدی کبھی نہیں ہوئی۔

کنٹرول کا زمانہ — ہیرامن اس زمانے کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایک بار چار کھیپ سیمنٹ اور کپڑے کی گانٹھوں سے بھری گاڑی جوگ بنی سے وراٹ نگر پہنچانے کے بعد ہیرامن کا دل مضبوط ہو گیا تھا۔ فاربس گنج کا ہر چور بیوپاری اس کو پکا گاڑی بان مانتا تھا۔ اس کے بیلوں کی تعریف بڑی گدّی کے بڑے سیٹھ خود اپنی زبان سے کرتے تھے۔

پانچویں بار، سرحد کے اس پار ترائی میں اس کی گاڑی پکڑی گئی۔

مہاجن کا منیم اسی گاڑی پر گاڑی پر گانٹھوں کے درمیان اکڑوں بیٹھا، چھپا ہوا تھا۔ ہیرامن جانتا تھا کہ داروغہ صاحب کی ڈیڑھ ہاتھ لمبی چور بتّی کی روشنی کتنی تیز ہوتی ہے — اگر اس کی ایک کرن بھی آنکھوں میں پڑ جائے تو کم از کم ایک گھنٹے کے لیے آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ روشنی کے ساتھ کڑکتی ہوئی آواز، ''اے... ے! گاڑی روکو! سالے، گولی مار دیں گے!...''

بیس کی بیس گاڑیاں ایک ساتھ رُک گئیں۔ ہیرامن نے پہلے ہی کہا تھا، یہ زہر گھولے گا۔ داروغہ صاحب اس کی گاڑی میں دبکے ہوئے منیم جی پر روشنی ڈال کر وحشیانہ انداز میں ہنسے، ''ہا۔ ہا۔ ہا۔ مُریم جی! مُریم جی!

ہی ہی! اے ے، سالا گاڑی بان منھ کیا دیکھتا ہے رے ے! کمبل ہٹاؤ اس بورے کے منھ پر سے!'' انھوں نے ہاتھ کی چھوٹی لاٹھی کو منیم جی کے پیٹ میں چبھاتے ہوئے کہا تھا، ''اس بورے کو... س سالا!'

داروغہ صاحب اور منیم جی میں کوئی بہت پرانی اور بڑی شدید عداوت ہوگی، وگرنہ اتنے روپوں کی پیشکش پر داروغہ کا من نہ ڈول جاتا؟ منیم جی چار ہزار تو گاڑی پر بیٹھے بیٹھے ہی دے رہے تھے۔ داروغہ صاحب نے دوسری بار ان کے پیٹ میں لاٹھی چبھوئی۔ ''پانچ ہزار''۔ لاٹھی پھر چلی۔ ''اترو پہلے!''

منیم کو گاڑی سے نیچے اتار کر داروغہ نے اس کی آنکھوں میں روشنی ڈال دی۔ پھر اسے دو سپاہیوں کے ہمراہ سڑک سے بیس پچیس گز دور جھاڑی کے پاس لے گیا۔ گاڑی بانوں اور گاڑیوں پر بندوقوں سے لیس سپاہیوں کا پہرہ بٹھا دیا گیا۔ ہیرامن سمجھ گیا، اس بار چھٹکارا نہیں... جیل! ہیرامن کو جیل کا ڈر نہیں تھا۔ لیکن اس کے بیل؟ نہ جانے کتنے دنوں تک چارے پانی کے بغیر پھاٹک کے اندر پڑے رہیں گے، بھوکے پیاسے۔ پھر نیلام کر دیے جائیں گے۔ بھیا اور بھابی کو وہ کبھی منھ نہیں دکھا سکے گا... نیلام کی بولی اس کے کانوں میں گونجنے لگی — ایک... دو... تین! — داروغہ اور منیم جی میں بات شاید طے نہیں ہو پا رہی تھی۔

ہیرامن کی گاڑی کے قریب کھڑے سپاہی نے اپنی زبان میں دوسرے سپاہی سے دھیمی آواز میں پوچھا، ''کا ہو؟ ماملہ گول ہوکھی کا؟'' پھر ایک چٹکی تمباکو دینے کے بہانے اس سپاہی کے پاس چلا گیا...

ایک... دو... تین! تین چار گاڑیوں کی آڑ اور... اُڑن چھو! ہیرامن نے فیصلہ کر لیا۔ اور پھر اس نے دھیرے سے اپنے بیلوں کے گلے کی رسیاں کھول دیں۔ گاڑی پر بیٹھے ہی بیٹھے دونوں بیلوں کو جڑواں باندھ دیا۔ بیل سمجھ گئے کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ ہیرامن گاڑی پر سے اترا، جتی ہوئی گاڑی میں بانس کی ٹکٹی لگا کر اس نے بیلوں کے کندھوں کو بے لاگ کیا اور دونوں کے کانوں کے پاس گدگدی مچا دی۔ اور دل ہی دل میں کہا کہ چلو بھیّن، جان بچ جائے گی تو ایسی ایسی کتنی ہی بڑھیا گاڑیاں مل جائیں گی... ایک... دو... تین! — نو دو گیارہ!

گاڑیوں کی اوٹ میں سڑک کے کنارے دور تک گھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں — اور ان تینوں نے سانس روک کر، کوئی آہٹ کیے بغیر بڑی جی داری سے ان جھاڑیوں کو پار کیا۔ پھر دونوں بیل سینہ تان کر دُلکی چال چلے اور ترائی کے گھنے جنگلوں میں گھس گئے۔ پھر راہ سونگھتے، ندی نالے پار کرتے ہوئے، دُم اٹھا کر بھاگے۔ ہیرامن ان کے پیچھے پیچھے تھا — اور اس طرح وہ تینوں رات بھر بھاگتے رہے تھے...

گھر پہنچ کر ہیرامن دو دن تک بے سُدھ پڑا رہا اور ہوش میں آتے ہی اس نے کان پکڑ کر قسم کھائی: اب کبھی چور بازاری کا مال نہیں ڈھوئے گا — توبہ توبہ!

پتا نہیں منیم جی پر کیا بیتی۔ رام جانے ہیرامن کی گاڑی کا کیا ہوا جس کی دُھری اصلی اسپات کی تھی۔ جس کے دونوں پہیے تو نہیں، البتہ ایک پہیہ بالکل نیا تھا۔ گاڑی میں رنگین ڈبّوں کے پھندنے بڑے جتن سے گوندھے گئے تھے۔

ہیرامن اب تک دو قسمیں کھا چکا تھا۔ پہلی: چور بازاری کا مال نہیں لادیں گے۔ دوسری: بانس نہیں ڈھوئیں گے۔

اور اب ہیرامن اپنے ہر بھاڑے دار سے پہلے ہی پوچھ لیتا، چوری چکاری والی چیز تو نہیں؟

اور بانس لادنے کے لیے اگر کوئی پچاس روپے بھی دے تو بھی اُسے ہیرامن کی گاڑی نہیں ملے گی۔ کسی دوسرے کی گاڑی دیکھے...

بانس لدی ہوئی گاڑی — گاڑی سے چار ہاتھ آگے بانس کا اگوا نکلا رہتا ہے اور پیچھے کی طرف چار ہاتھ پچھوا۔ گاڑی ہمیشہ قابو سے باہر رہتی ہے۔ ہاں، تو بے قابو والی لدنی اور کھریا شہر والی بات۔ بھاڑے دار کا بے حد باتونی نوکر بانس کا اگوا پکڑ کر چل رہا تھا کہ لڑکیوں کے اسکول کی طرف دیکھنے لگا۔ بس، موڑ پر گھوڑا گاڑی سے ٹکر ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ ہیرامن بیلوں کی رسّی کھینچتا، گھوڑا گاڑی کی چھتری بانس کے اگوا میں پھنس گئی۔ گھوڑا گاڑی کے کوچوان نے اسے بے تحاشا چابک مارتے ہوئے گالی دی تھی...

بانس کا لادنا تو دور رہا، ہیرامن نے کھریا شہر کا راستہ ہی چھوڑ دیا۔ اور جب مال فاربس گنج سے مورنگ کے لیے ڈھونا شروع کیا تو گاڑی ہی دھرلی گئی...

ہیرامن نے کئی سالوں تک بیلوں کو ساجھے پر جوتا۔ آدھا بھاڑا گاڑی والے کا اور آدھا بیل والے کا — اور گاڑی بانی مفت! ساجھے کی کمائی سے تو بیلوں کے ہی پیٹ نہیں بھرتے تھے۔

ہیرامن نے پچھلے سال ہی اپنی گاڑی بنوائی ہے۔

دیوی میّا اس سرکس کمپنی کے شیر کا بھلا کریں۔ پچھلے سال اسی میلے میں شیر کی گاڑی کو کھینچنے والے دونوں گھوڑے مر گئے تھے۔ چمپانگر سے فاربس گنج کے میلے جانے کے لیے سرکس کمپنی کے منیجر نے گاڑی بانوں کے حلقے میں اعلان کیا، ''سو روپیہ بھاڑا ملے گا۔''

دو ایک گاڑی بان راضی بھی ہوئے، لیکن ان کے بیل شیر کی گاڑی سے دس ہاتھ دور ہی ڈر کر بدکنے لگے، اور رسّی تڑوا کر بھاگ بھی گئے۔

ہیرامن نے اپنے بیلوں کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا، ''دیکھو بھیّن! ایسا موقع پھر ہاتھ نہیں آوے گا۔ یہی موقع ہے اپنی گاڑی بنوانے کا، نہیں تو پھر ساجھے داری ہی چلتی رہے گی... ارے، پنجرے میں بند باگھ کا کیا ڈر؟ مورنگ کی ترائی میں دہاڑتے ہوئے شیروں کو دیکھ چکے ہو۔ پھر پیٹھ پر میں جو ہوں...''

گاڑی بانوں کے حلقے میں ایک ساتھ تالیاں بج اٹھیں۔ ہیرامن کے بیلوں نے سب کی آبرو رکھ لی۔ وہ ہمک کر آگے بڑھے اور ایک ایک کر کے باگھ گاڑی میں جُت گئے — صرف دائیں طرف کے بیل نے جُتنے کے بعد ڈھیر سارا پیشاب کیا تھا۔ ہیرامن نے دو دن تک اپنی ناک پر سے پٹی نہیں کھولی تھی۔ بڑی گدی کے بڑے سیٹھ جی کی طرح، ناک پر پٹی باندھے بغیر کوئی بھی شیر کی بو برداشت نہیں کر سکتا۔

...ہیرامن نے باگھ گاڑی کی گاڑی بانی کی ہے لیکن اس کی پیٹھ میں ایسی گدگدی کبھی نہیں ہوئی۔ آج رہ رہ کر اس کی گاڑی میں چمپا کا پھول مہک اٹھتا ہے۔ پیٹھ میں گدگدی ہونے پر وہ انگوچھے سے اپنی پیٹھ جھاڑ لیتا ہے۔

ہیرامن کو لگتا ہے، دو سال سے چمپانگر میلے کی بھگوتی میّا اس پر مہربان ہیں۔ پچھلے سال اسے جوتنے کے لیے باگھ گاڑی مل گئی تھی اور ایک سو روپے نقد۔ کرائے کے علاوہ بے حساب چائے بسکٹ اور سارے راستے ریچھ، بندر اور جوکر کا تماشا مفت میں دیکھنے کو ملا۔

اور اس بار زنانہ سواری — عورت ہے یا چمپا کا پھول! جب سے گاڑی میں بیٹھی ہے، گاڑی مہک مہک رہی ہے۔

کچی سڑک کے ایک چھوٹے سے گڑھے میں گاڑی کا دایاں پہیہ بے موقع ہچکولا کھا گیا۔ ہیرامن کی گاڑی میں سے ہلکی سی ''سی'' کی آواز آئی۔ ہیرامن نے دائیں طرف کے بیل کو چابک سے پیٹتے ہوئے کہا، ''سالا، کیا سمجھتا ہے، بورا لدا ہے کیا؟''

''اہا! مارو مت!''

ان دیکھی عورت کی آواز نے حیرت میں ڈال دیا۔ اس عورت کی آواز بچوں کی جیسی مہین تھی۔

متھرا موہن نوٹنکی میں لیلیٰ بننے والی ہیرابائی کا نام بھلا کس نے نہیں سنا ہوگا۔ لیکن ہیرامن کی بات نرالی تھی۔ اس نے سات سال تک لگاتار میلوں کا مال ڈھویا ہے، لیکن کبھی نوٹنکی، تھیٹر بائیسکوپ یا سینما نہیں دیکھا۔ لیلیٰ یا ہیرابائی کو دیکھنا تو درکنار، ہیرامن نے اس کا کبھی نام بھی نہیں سنا۔ لہٰذا میلہ ٹوٹنے سے پندرہ دن پہلے آدھی رات کے وقت کالی اوڑھنی میں لپٹی عورت کو دیکھ کر اس کے دل کو ایک خدشہ ضرور محسوس ہوا تھا۔ بکس اٹھانے والے ملازم نے کرائے میں مول تول کرنے کی کوشش کی تو اوڑھنی والی نے سر ہلا کر اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ ہیرامن نے گاڑی جوتتے ہوئے، ملازم سے پوچھا، ''کیوں بھیا، کوئی چوری چکاری کا مال وال تو نہیں؟'' ہیرامن کو پھر حیرت ہوئی کیوں کہ وہ ملازم اُسے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی ہانکنے کے لیے کہہ کر خود اندھیرے میں غائب ہو گیا تھا۔

ہیرامن کو میلے میں تمباکو بیچنے والی بڑھیا کی کالی اوڑھنی یاد آ گئی...

ایسے میں کوئی کیا گاڑی ہانکے۔

ایک تو پیٹھ میں گدگدی ہورہی ہے۔ دوسرا اس کی گاڑی میں چمپا کا پھول رہ رہ کر کھل اٹھتا ہے۔ بیلوں کو ڈانٹو تو بھی اس کی سواری ٹوکتی ہے...اس کی سواری، تنہا اکیلی عورت— کہیں تمبا کو بیچنے والی بڑھیا کی طرح تو نہیں؟ اس کی آواز سننے کے بعد وہ بار بار مڑ کر ''ٹپر'' پر ایک نظر ڈالتا ہے، انگوچھے سے اپنی پیٹھ جھاڑتا ہے...رام جانے اس بار اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ گاڑی جب مشرق کی جانب مڑی تو چاندنی کا ایک ٹکڑا اس کی گاڑی میں سما گیا۔ سواری کی ناک پر ایک جگنو جگمگا اٹھا۔ ہیرامن کو یہ سب کچھ بڑا پُراسرار اور عجیب وغریب لگا۔ سامنے چمپانگر سے سندھیا گاؤں تک پھیلا ہوا سنسان میدان...کہیں یہ عورت کوئی ڈائن یا چڑیل تو نہیں؟

ہیرامن کی سواری نے کروٹ بدلی۔ چاندنی اس کے چاند مکھڑے پر پڑی تو ہیرامن چیختے چیختے رہ گیا، ''ارے باپ! اِی تے پری ہے!''

پری کی آنکھیں کھل گئیں۔ ہیرامن نے اپنا منھ سڑک کی طرف گھمالیا اور بیلوں کو ٹٹکاری دی۔ ہیرامن نے زبان کو تالو سے لگا کر ٹی ٹی ٹی کی آواز نکالی۔ اس کی زبان جانے کب سے سوکھ کر لکڑی کی مانند ہوگئی تھی۔

''بھیا، تمھارا نام کیا ہے؟''

ہو بہو پھینو گلاس... ہیرامن کا رواں رواں گنگنا اٹھا۔ اس کے گلے سے آواز تک نہ نکلی۔ اس کے دونوں بیلوں نے بھی کان کھڑے کر کے اس سواری کی آواز کو پرکھا۔

''میرا نام؟...میرا نام ہے ہیرامن۔''

اس کی سواری مسکرادی...مسکراہٹ میں خوشبو تھی۔

''تب تو میتا کہوں گی بھیا نہیں...میرا نام بھی ہیرا ہے...''

سس! ہیرامن کو معلوم نہیں کہ مرد اور عورت کے نام میں فرق ہوتا ہے۔

''ہاں جی، میرا نام بھی ہیرابائی ہے۔''

کہاں ہیرامن اور کہاں ہیرابائی— بہت فرق ہے!

ہیرامن نے اپنے بیلوں کو جھڑک کر کہا، ''کان چُنیا کر گپ سننے سے ہی تیس کوس منزل کٹے گی کیا؟ اس بائیں ناٹے کے پیٹ میں شیطانی بھری ہے۔'' ہیرامن نے بائیں بیل کو چابک سے ہلکی ضرب لگائی۔

''مارومت! دھیرے دھیرے چلنے دو، جلدی کیا ہے؟''

ہیرامن کے دل میں سوال اٹھا کہ اب اگر وہ ہیرابائی سے گپ کرے تو اسے کن الفاظ میں مخاطب

کرے؟ ''تو ہیں'' کہے یا ''آن ہاں'' اس کی زبان میں بڑوں کو ''آن ہاں'' یعنی ''آپ'' کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ مہذب بولی میں تو محض دو چار سوال جواب ہو سکتے ہیں، ورنہ دل کھول کر گپ تو گاؤں کی بولی ہی میں کی جا سکتی ہے۔

آشون کارتک کی صبح میں چھا جانے والے کہرے سے ہیرامن کو پرانی چڑ ہے۔ وہ کئی بار سڑک بھول کر بھٹک چکا ہے۔ لیکن آج کی صبح کے اس گہرے کہرے میں بھی وہ مسرور ہے۔ ندی کے کنارے کھیتوں میں سے دھان سے لدے ہوئے پودوں کی خوشبو ہوا میں تیرتی ہوئی آتی ہے۔ متبرک تہوار کے روز گاؤں میں ایسی ہی خوشبو پھیلی رہتی ہے۔ اس کی گاڑی میں چمپا کا پھول کھلا۔ اُس پھول میں ایک پری بیٹھی ہے... جے بھگوتی!

ہیرامن نے کنکھیوں سے دیکھا کہ اس کی سواری— ہیرابائی، اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے۔ ہیرامن کے دل میں کوئی انجانی سی راگنی بج اٹھی اور اس کا سارا جسم جھنجھنا اٹھا۔ وہ بولا، ''بیل کو مارتے ہیں تو آپ کو بُرا لگتا ہے؟''

ہیرابائی نے پرکھ لیا کہ ہیرامن سچ مچ ہیرا ہے۔

چالیس سال کا ہٹا کٹا، کالا کلوٹا، دیہاتی نوجوان اپنی گاڑی اور اپنے بیلوں کے سوا دنیا کی کسی بات میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ گھر میں بڑا بھائی ہے جو کھیتی کرتا ہے۔ وہ بال بچے دار ہے۔ ہیرامن اپنے بھائی سے زیادہ اپنی بھابی کی عزت کرتا ہے۔ وہ اپنی بھابی سے ڈرتا بھی ہے۔ ہیرامن کی بھی شادی ہوئی تھی— بچپن میں۔ لیکن گونے سے پہلے ہی دلہن مر گئی۔ ہیرامن کو اپنی دلہن کی صورت یاد نہیں... دوسری شادی؟ دوسری شادی نہ کرنے کی کئی وجہیں ہیں۔ بھابی کی یہ ضد ہے کہ وہ ہیرامن کی شادی کسی کنواری لڑکی سے ہی کروائے گی۔ کنواری کا مطلب یہ ہے کہ پانچ سات سال کی لڑکی۔ کون مانتا ہے شاردا قانون؟ اور کوئی لڑکی والا دوہاجو کو اپنی لڑکی کسی خاص وجہ سے ہی دے سکتا ہے۔ اس کی بھابی تین ست کر کے بیٹھی ہے، سو بیٹھی ہے۔ بھابی کے آگے بھیا کی بھی نہیں چلتی۔ اب ہیرامن نے طے کر لیا ہے کہ وہ شادی نہیں کرے گا۔ کون بلا مول لینے جائے؟ بیاہ کر کے گاڑی بانی کیا کرے گا کوئی! ہیرامن اور سب کچھ چھوڑ سکتا ہے لیکن گاڑی بانی نہیں چھوڑ سکتا۔

ہیرابائی نے ہیرامن جیسا معصوم آدمی کہاں دیکھا تھا۔ ہیرامن نے پوچھا، ''آپ کا گھر کون ضلع میں پڑتا ہے؟'' اور کانپور کا نام سنتے ہی جو اس کی ہنسی چھوٹی ہے تو بیل بھڑک اٹھے۔ ہیرامن ہنستے وقت اپنے سر کو جھکا لیتا ہے۔ ہنسی رکنے پر اس نے کہا، ''واہ رے کان پور! تب تو ناک پور بھی ہوگا؟'' اور جب ہیرابائی نے کہا کہ ناک پور بھی ہے، تو وہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔

''واہ رے دنیا! کیا کیا نام ہوتے ہیں! کان پور، ناک پور!'' ہیرامن نے ہیرابائی کے کان کے پھول کو غور سے دیکھا— لہو کی بوند۔

ہیرامن نے ہیرابائی کا نام کبھی نہیں سنا تھا۔ نوٹنکی کمپنی کی عورت کو وہ بائی جی نہیں سمجھتا ہے۔ کمپنی میں کام کرنے والی عورتوں کو وہ دیکھ چکا ہے۔ سرکس کمپنی کی مالکن اپنی دونوں جوان بیٹیوں کے ساتھ شیر کی گاڑی کے پاس آتی تھی، شیر کو چارہ پانی دیتی تھی، خوب پیار بھی کرتی تھی۔ اس کی بڑی بیٹی نے ہیرامن کے بیلوں کو بھی ڈبل روٹی اور بسکٹ کھلائے تھے۔

ہیرامن ہوشیار ہے۔ کہرا چھٹنے پر اس نے اپنی چادر سے ٹپر میں پردہ کر دیا اور بولا، ''بس دو گھنٹے۔ اس کے بعد راستہ چلنا مشکل ہے۔ کارتک کی صبح کی دھوپ آپ برداشت نہ کر سکیں گی۔ کجری ندی کے کنارے تیگ چھیا کے پاس گاڑی لگا دیں گے اور دوپہریا کاٹ کر...''

سامنے سے آتی ہوئی گاڑی کو دور سے ہی دیکھ کر ہیرامن چوکنا ہو گیا اور اس نے اپنی توجہ لیک اور بیلوں پر مرکوز کر دی۔ راستہ کاٹتے ہوئے گاڑی بان نے پوچھا، ''میلہ ٹوٹ رہا ہے کیا بھائی؟''

ہیرامن نے جواب دیا کہ وہ میلے کی بات نہیں جانتا۔ اس کی گاڑی میں ''بداگری'' (مائیکے یا سسرال جاتی ہوئی لڑکی) ہے، اور پھر ہیرامن نے اس گاڑی بان کو نہ جانے کس گاؤں کا نام بتا دیا۔

''چھتا پور پچیرا کہاں ہے؟''

''کہیں ہو، یہ جان کر آپ کیا کیجیے گا؟'' پھر ہیرامن اپنی چالاکی پر ہنسا۔ پردہ ڈال دینے پر بھی پیٹھ میں گدگدی ہوتی ہے۔

ہیرامن پردے کے چھید میں سے دیکھتا ہے۔ ہیرابائی دیا سلائی کی ایک ڈبیا کے برابر آئینے میں اپنے دانت دیکھ رہی ہے... ہیرامن نے ایک بار مدن پور میلے میں اپنے بیلوں کے لیے ننھی چٹی کوڑیوں کی مالا خریدی تھی— چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی کوڑیوں کی قطار۔

تیگ چھیا کے تینوں درخت دور سے ہی دکھائی پڑتے ہیں۔ ہیرامن نے پردے کو ذرا سا سرکاتے ہوئے کہا، ''دیکھیے، یہی ہے تیگ چھیا— دو پیڑ جٹا ماسی بڑھ رہے ہیں اور ایک... اس پھول کا کیا نام ہے؟ آپ کے کرتے پر جیسا پھول چھپا ہوا ہے، ویسا ہی، خوب مہکتا ہے— دو کوس دور تک سگندھ جاتی ہے۔ اس پھول کو خمیرہ تمباکو میں ڈال کر پیتے بھی ہیں لوگ۔''

ہیرابائی بولی، ''اور اس امرائی کی آڑ سے کئی مکان دکھائی پڑتے ہیں— وہاں گاؤں ہے یا مندر؟''

ہیرامن نے بیڑی سلگانے سے پہلے پوچھا، ''بیڑی پیں؟ آپ کو گندھ تو نہیں لگے گی؟... وہی ہے نام لگر ڈیوڑھی۔ جس راجہ کے میلے سے ہم لوگ آ رہے ہیں اسی کا داماد گوتیا ہے... واہ رے زمانے!''

ہیرامن نے 'واہ رے زمانے' کہہ کر بات کو چاشنی میں ڈال دیا۔ ہیرابائی نے ٹپر کے پردے کو ترچھا کھونس دیا... ہیرابائی کے دانتوں کی قطار۔

''کون زمانے؟'' ٹھڈی پر ہاتھ رکھ کر ہیرابائی نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

''نام لگر ڈیوڑھی کا زمانہ— کیا تھا، اور کیا سے کیا ہوگیا!''

ہیرامن قصہ گوئی کا فن جانتا تھا۔

ہیرابائی بولی، ''تم نے دیکھا تھا وہ زمانہ؟''

''دیکھا نہیں سُنا ہے... راج کیسے گیا، بڑی دردناک کہانی ہے۔ کہتے ہیں گھر میں دیوتا نے جنم لیا۔ کہیے بھلا، دیوتا آخر دیوتا ہے— ہے یا نہیں؟ اِندر آسن چھوڑ کر مرتیو بھون میں جنم لے لے تو اس کا تیج کیسے سنبھال سکتا ہے کوئی؟ سورج مکھی پھول کی طرح ماتھے کے پاس تیج کھلا رہتا، لیکن نظر کا پھیر کسی نے نہیں پہچانا۔ ایک بار آپ لین میں لاٹ صاحب مع لاٹنی کے ہوا گاڑی سے آئے تھے۔ لاٹ نے بھی نہیں پہچانا— پہچانا آخر لاٹنی نے۔ سورج مکھی تیج دیکھتے ہی بول اٹھی: اے مین، راجہ صاحب! سنو، یہ آدمی کا بچہ نہیں ہے، دیوتا ہے۔''

ہیرامن نے لاٹنی کی بولی کی نقل اتارتے وقت، خوب ڈیم، فیٹ، لیٹ کیا۔ ہیرابائی بہت کھل کر ہنسی... ہنستے وقت اس کا سارا جسم ہلتا تھا۔ ہیرابائی نے اپنی اوڑھنی ٹھیک کی۔ تب ہیرامن کو لگا کہ... کہ...

''پھر؟ اس کے بعد کیا ہوا میتا؟''

''اسس! کتھا۔ سننے کا بڑا شوق ہے آپ کو؟... لیکن کالا آدمی راجہ کیا، مہاراجہ بھی ہوجائے، رہے گا کالا آدمی ہی۔ صاحب کی جیسی عقل کہاں سے پائے گا؟ ہنس کر بات اڑادی سبھی نے— تب رانی کے سپنے میں دیوتا بار بار آنے لگے۔ سیوا نہیں کر سکتے تو جانے دو، نہیں رہیں گے تمھارے یہاں۔ اس کے بعد دیوتا کا کھیل شروع ہوا۔ سب سے پہلے دونوں ہاتھی مرے، پھر گھوڑے، پھر پٹ پٹانگ...''

''پٹ پٹانگ کیا؟''

ہیرامن کے دل میں پل پل خوشی بڑھتی جارہی تھی۔ دل میں ست رنگا چھاتا دھیرے دھیرے کھل رہا تھا۔ اسے لگا کہ جیسے اس کی گاڑی پر دیوکل کی عورت سوار ہے۔ دیوتا آخر دیوتا ہے۔

''پٹ پٹانگ— دھن دولت، مال مویشی سب صاف۔ دیوتا اِندر آسن چلا گیا۔'' ہیرابائی نے اوجھل ہوتے ہوئے مندر کے کنگورے کی طرف دیکھ کر لمبی سانس لی۔

''لیکن دیوتا نے جاتے جاتے کہا، اس راج میں کبھی کسی گھر میں ایک چھوڑ کر دو بیٹے نہیں ہوں گے۔ دھن ہم اپنے ساتھ لیے جارہے ہیں، کُن چھوڑے جاتے ہیں۔ دیوتا کے ساتھ سبھی دیوی دیوتا چلے

گئے۔صرف سرسوتی میا رہ گئیں۔اسی کا وہ مندر ہے۔"

دیسی گھوڑوں پر پٹوں کا بوجھ لادے ہوئے بنیوں کو آتا دیکھ کر ہیرامن نے ٹپر کے پردے کو گرا دیا۔ بیلوں کو للکارا اور بدیسیا ناچ کا وندنا گیت گانے لگا — "نجے میا سرسوتی ارجی کرت بانی، ہمرا پر ہوکھو سہائی ہے میا، ہمرا پر ہوکھو سہائی۔"

گھوڑوں پر لدے بنیوں سے ہیرامن نے ہنس کر پوچھا، "کیا بھاؤ پٹوا خریدتے ہیں مہاجن؟"

لنگڑے گھوڑے والے بنیے نے تاجرانہ جواب دیا، "نیچے ستائیس اٹھائیس، اوپر تیس۔ جیسا مال ویسا بھاؤ۔"

جوان بنیے نے پوچھا، "میلے کا کیا حال چال ہے بھائی؟ کون نوٹنکی کمپنی کا کھیل ہو رہا ہے، اروتہ کمپنی یا متھرا موہن؟"

"میلے کا حال میلے والا جانے۔" ہیرامن نے پھر چھتا پور پچیرا کا نام سُنا دیا۔

سورج دو بانس اوپر آ گیا تھا۔ ہیرامن اپنے بیلوں سے بات کرنے لگا، "ایک کوس زمین۔ ذرا دم باندھ کر چلو۔ پیاس کی بیلا ہو گئی نا؟ یاد ہے، اس بار تیگ چھیا کے پاس سرکس کمپنی کے جوکر اور بندر نچانے والے صاحب میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ جوکر ٹھیک بندر کی طرح دانت کٹکٹا کر گھگھیانے لگا تھا... نہ جانے کس کس دیش اور ملک کے آدمی آتے ہیں۔"

ہیرامن نے پھر پردے کے چھید میں سے دیکھا، ہیرابائی کی نظریں کاغذ کے ایک ٹکڑے پر مرکوز تھیں۔ ہیرامن کا دل آج ہلکے سُر میں گا رہا تھا۔ اسے طرح طرح کے گیتوں کی یاد آ رہی تھی۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے، بدیشیا، بلواہی، چھوکرا ناچ والے ایک سے بڑھ کر ایک گیت اور غزل گاتے تھے۔ اب تو بھونپو میں بھوں پو، بھوں پو، نہ جانے کون سے گیت گاتے ہیں — واہ رے زمانے! اور ہیرامن کو چھوکرا ناچ کا گیت یاد آ گیا —

سجنوا بیری ہو گئے ہمارو! سجنوا...

ارے، چٹھیا ہو تو سب کوئی بانچے، چٹھیا ہو تو...

ہائے کرموا! ہوے کرموا...

ہیرامن نے گاڑی کی ٹلی پر انگلیوں سے تال دے کر گیت ادھورا چھوڑ دیا۔ چھوکرا ناچ کے مُنوا نٹوا کا چہرہ ہیرابائی جیسا ہی تھا... کہاں چلا گیا وہ زمانہ! ہر مہینے گاؤں میں ناچ دکھانے والے آتے تھے۔ ہیرامن نے اسی چھوکرا ناچ کی وجہ سے اپنی بھابی کی نہ جانے کتنی سخت سست سنی تھیں۔ بڑے بھائی نے تو اسے گھر سے نکل جانے کے لیے بھی کہہ دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے آج ہیرامن پر ماں سرسوتی مہربان ہیں۔ ہیرابائی

بولی، ''واہ! کتنا بڑھیا گاتے ہو تم!''

ہیرامن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ سر جھکا کر ہنسنے لگا۔

آج تیگ چھیا پر رہنے والے مہابیر سوامی بھی ہیرامن پر مہربان ہیں۔ تیگ چھیا کے نیچے ایک بھی گاڑی نہیں ہے، جب کہ یہاں ہمیشہ گاڑیوں اور گاڑی بانوں کی ایک بھیڑ لگی رہتی ہے۔ لیکن آج یہاں صرف ایک سائیکل والا بیٹھ کر ستا رہا ہے۔ ہیرامن نے مہابیر سوامی کا نام لے کر گاڑی روک دی۔ ہیرابائی پردہ ہٹانے لگی تو ہیرامن نے پہلی بار آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے بات کی— سائیکل والا ادھر ہی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

ہیرامن نے بیلوں کو کھولنے سے پہلے بانس کی روک لگا کر گاڑی کو ٹکا دیا، پھر سائیکل والے کی طرف بار بار گھورتے ہوئے پوچھا، ''کہاں جانا ہے؟ میلہ؟ کہاں سے آنا ہو رہا ہے؟ بسن پور سے؟ بس اتنے ہی دور چل کر تھک گئے؟... واہ رے جوانی!''

سائیکل والا، دبلا پتلا نوجوان، منمنا کر کچھ بولا اور بیڑی سلگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

ہیرامن، ہیرابائی کو زمانے بھر کی نگاہوں سے چھپا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا— آس پاس کہیں بھی کوئی گاڑی یا گھوڑا نہیں تھا۔

کجری ندی کی دبلی پتلی دھار تیگ چھیا کے قریب آ کر مشرق کی جانب مڑ گئی تھی۔

پانی میں بیٹھی ہوئی بھینسوں اور ان کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے بگلوں کو ہیرابائی دیکھتی رہی۔ ہیرامن بولا، ''جائیے، گھاٹ پر منھ دھو آئیے۔''

ہیرابائی گاڑی سے نیچے اتری۔ ہیرامن کا دل دھڑک اٹھا... نہیں، نہیں! پاؤں سیدھے ہیں ٹیڑھے نہیں۔ لیکن تلوا اتنا لال کیوں ہے؟ ہیرابائی گاؤں کی بہو بیٹی کی طرح سر جھکائے دھیرے دھیرے گھاٹ کی طرف چلی گئی۔ کون کہے گا کہ کمپنی کی عورت ہے... عورت نہیں، لڑکی۔ شاید کنواری ہی ہے۔

ہیرامن روک پر نکی گاڑی پر بیٹھ گیا۔ اس نے پیر میں جھانک کر دیکھا۔ پھر ایک بار اِدھر اُدھر دیکھ کر ہیرابائی کے تکیے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور تکیے پر کہنی ٹیک کر جھک گیا، جھکتا گیا! خوشبو اس کے تمام وجود میں سما گئی۔ تکیے کے غلاف پر کڑھے پھولوں کو انگلیوں سے چھو کر اُسے سونگھا، ''ہائے رے ہائے! اتنی مگندھ!''

ہیرامن کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک ساتھ پانچ چلم گانجا پھونک کر اٹھا ہے۔ ہیرابائی کے چھوٹے سے آئینے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں اتنی سرخ کیوں ہیں؟

ہیرابائی لوٹ کر آئی تو ہیرامن نے ہنس کر کہا، ''اب آپ گاڑی کا پہرا دیجیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

ہیرامن نے اپنے سفری جھولے میں سے لپٹی ہوئی گٹھری نکالی، انگوچھا جھاڑ کر کندھے پر رکھا اور

ہاتھ میں بالٹی لٹکا کر جیسے ہی چلا، اس کے بیلوں نے باری باری سے ہنک کر کچھ کہا تو ہیرامن پلٹ کر بولا، ''ہاں ہاں، پیاس سب کو لگی ہے۔ لوٹ کر آتا ہوں تو گھاس دوں گا۔ بدمعاشی مت کرو!''

بیلوں نے کان ہلا دیے۔

ہیرامن نہا دھو کر کب لوٹا، ہیرابائی کو کچھ پتا نہ چلا۔ کجری کی دھارا کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں رات کی اچٹی ہوئی نیند لوٹ آئی تھی۔ ہیرامن قریبی گاؤں سے ناشتے کے لیے دہی، چوڑا، چینی لے آیا تھا۔

''اٹھیے جاگیے! جل پان کر لیجیے!''

ہیرابائی نے آنکھیں کھولیں تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ ہیرامن کے ایک ہاتھ میں مٹی کے نئے برتن میں دہی، کیلے کے پتے، دوسرے ہاتھ میں پانی کی بالٹی تھی اور اس کی آنکھوں میں بڑا محبت بھرا اصرار تھا۔

''اتنی چیزیں کہاں سے لے آئے؟''

ہیرامن بولا، ''اس گاؤں کا دہی نامی ہے... چاہے تو فاربس گنج پہنچ کر بھی مل سکے گی۔''

ہیرامن کے جسم میں گدگدی جاگ اٹھی۔ ہیرابائی نے کہا، ''تم بھی پتّل بچھاؤ... کیوں؟ تم نہیں کھاؤ گے؟ تو سمیٹ کر رکھ لو اپنی جھولی میں۔ میں بھی نہیں کھاؤں گی۔''

''ارے!'' ہیرامن لجا کر بولا، ''اچھی بات، آپ کھا لیجیے پہلے۔''

''پہلے پیچھے کیا؟ تم بھی بیٹھو۔''

ہیرامن کا دل باغ باغ ہو گیا۔ ہیرابائی نے اپنے ہاتھ سے اس کے لیے پتّل بچھایا، پانی کا چھینٹا دیا اور چوڑا نکال کر رکھ دیا۔

اِسس! دھنیہ ہے، دھنیہ ہے! ہیرامن نے دیکھا، بھگوتی مَیّا بھوگ لگا رہی ہے۔ سرخ ہونٹوں پر دہی کا موتی... پہاڑی طوطے کو دودھ بھات کھاتے دیکھا ہے؟

دن ڈھل گیا۔

ٹپر میں سوئی ہیرابائی اور زمین پر دری بچھا کر سوئے ہیرامن کی نیند ایک ساتھ ہی کھلی... میلے کی طرف جانے والی گاڑیاں تیگ چھیا کے پاس آ کر ٹھہری ہوئی تھیں۔ بچے کھسر پھسر کر رہے تھے۔

ہیرامن ہڑبڑا کر اٹھا۔ اس نے ٹپر کے اندر جھانک کر اشارے سے کہا— دن ڈھل گیا۔

پھر گاڑی میں بیلوں کو جوتتے وقت، ہیرامن نے دوسرے گاڑی بانوں کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا البتہ گاڑی ہانکتے ہوئے بولا، ''سرپور بازار کے اسپتال کی ڈاگ ڈرنی ہیں۔ پاس ہی کڑماں گاؤں میں روگی دیکھنے جا رہی ہیں۔''

ہیرابائی چھتاپور پچیرہ کا نام بھول گئی۔ گاڑی جب کچھ دور نکل آئی تو اس نے ہنس کر پوچھا، ''پتا پور

چھپیرہ؟''

ہنستے ہنستے ہیرامن کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ''پتا پور چھپیرہ! ہاہا! وہ لوگ چھتا پور پچیرہ کے ہی گاڑی بان تھے، ان سے کیسے کہتا؟ ہی ہی!''

ہیرابائی مسکراتی ہوئی گاؤں کی طرف دیکھنے لگی۔ سڑک تیگ چھیا گاؤں کے بیچ سے نکلتی تھی۔ گاؤں کے بچوں نے پردے والی گاڑی دیکھی تو تالیاں بجا بجا کر رٹی ہوئی سطریں دہرانے لگے—

لالی لالی ڈولیا میں

لالی رہی دلہنیا

پان کھائے...!

ہیرامن ہنسا... دُلہنیا.... لالی لالی ڈولیا! دلہنیا پان کھاتی ہے، دولہا کی پگڑی سے منہ پونچھتی ہے— اور دلہنیا، تیگ چھیا گاؤں کے بچوں کو یاد رکھنا۔ لوٹتی بار گڑ کا لڈو لیتی آنا۔ لاکھ برس تیرا دولھا جیے۔ ہیرامن کا کتنا پرانا سپنا پورا ہوا ہے۔ ایسے کتنے ہی سپنے اس نے دیکھے ہیں... وہ اپنی دلہن کو لے کر لوٹ رہا ہے۔ ہر گاؤں کے بچے تالیاں بجا بجا کر گا رہے ہیں۔ ہر آنگن سے عورتیں جھانک رہی ہیں۔ مرد پوچھتے ہیں، کہاں کی گاڑی ہے؟ کہاں جائے گی؟ اس کی دلہن ذرا سا پردہ کھسکا کر دیکھتی ہے۔ اور ایسے کتنے ہی سپنے...

گاؤں سے باہر نکل کر ہیرامن نے کنکھیوں سے پٹر کے اندر دیکھا۔ ہیرابائی کچھ سوچ رہی تھی۔ ہیرامن بھی کسی سوچ میں کھو گیا اور تھوڑی دیر بعد وہ گنگنانے لگا—

سجن رے جھوٹ متی بولو، خدا کے پاس جانا ہے

نہ ہاتھی ہے، نہ گھوڑا ہے، نہ گاڑی—

بس پیدل ہی جانا ہے۔ سجن رے...

ہیرابائی نے پوچھا، ''کیوں میتا؟ تمھاری اپنی بولی میں کوئی گیت نہیں ہے کیا؟''

ہیرامن اب بلا جھجک ہیرابائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔

کیا کمپنی کی عورت بھی ایسی ہوتی ہے؟ سرکس کمپنی کی مالکن میم تھی لیکن ہیرابائی— گاؤں کی بولی میں گیت سننا چاہتی ہے۔ وہ کھل کر مسکرایا اور اس نے پوچھا، ''گاؤں کی بولی آپ سمجھیے گا؟''

''ہوں...ں!'' ہیرابائی نے گردن ہلائی۔ کان کے جھمکے ہل گئے۔ ہیرامن نے پھر پوچھا، ''گیت ضرور ہی سنیے گا؟ نہیں مانیے گا؟... اتنا شوق گاؤں کا گیت سننے کا ہے آپ کو؟ تب لیک چھوڑنی ہوگی، چالو راستے میں کیسے گیت گا سکتا ہے کوئی!'' ہیرامن نے بائیں بیل کی رسی کھینچ کر دائیں بیل کو لیک سے باہر کیا اور بولا، ''ہری پور ہو کر نہیں جائیں گے تب۔''

چالو لیک کو کاٹتے دیکھ کر ہیرامن کی گاڑی کے پیچھے والے گاڑی بان نے چلّا کر پوچھا، ''کا ہے ہو گاڑی وان، لیک چھوڑ کر بے لیک کہاں اُدھر؟''

ہیرامن نے ہوا میں چابک گھماتے ہوئے جواب دیا، ''کہاں ہے بے لیک؟ وہ سڑک متن پور تو نہیں جائے گی؟'' اور پھر وہ بڑبڑایا، ''اس ملک کے لوگوں کی یہ عادت بہت بری ہے۔ راہ چلتے ایک سو جرح کریں گے۔ ارے بھائی، تم کو جانا ہے، جاؤ... دیہاتی اُجڈ سب!''

متن پور کی سڑک پر گاڑی لاکر ہیرامن نے بیلوں کی رسّی ڈھیلی کردی۔ بیلوں نے دلکی چال چھوڑ کر قدم چال پکڑی۔

ہیرابائی نے دیکھا کہ متن پور کی سڑک واقعی بڑی سونی تھی۔ ہیرامن اس کی آنکھوں کی بولی سمجھتا تھا— بولا، ''گھبرانے کی بات نہیں۔ یہ سڑک بھی فاربس گنج جائے گی۔ راہ گھاٹ کے لوگ بہت اچھے ہیں... ایک گھڑی رات تک ہم لوگ پہنچ جائیں گے۔''

ہیرابائی کو فاربس گنج پہنچنے کی جلدی نہیں تھی اور ہیرامن پر اس کو اتنا بھروسا ہوگیا تھا کہ اب ڈر یا خوف کی کوئی بات اس کے دل میں سر اٹھا ہی نہیں سکتی تھی۔

ہیرامن مسکراتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ کون سا گیت گائے؟ ہیرابائی کو گیت اور کتھا دونوں کا شوق ہے ...مہوا گھٹوارن؟ اور پھر وہ بولا، ''اچھا، جب آپ کو اتنا شوق ہے تو سنیے مہوا گھٹوارن کا گیت۔ اس میں گیت بھی ہے، کتھا بھی ہے۔''

... کتنے دنوں کے بعد بھگوتی نے یہ سپنا بھی پورا کردیا۔ جے بھگوتی! آج ہیرامن اپنے دل کے سارے ارمان پورے کرلے گا۔ وہ ہیرابائی کی تھمی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھتا رہا۔

پھر بولا، ''سنیے! آج بھی پرمان ندی میں مہوا گھٹوارن کے کئی پرانے گھاٹ ہیں۔ اسی ملک کی تھی مہوا۔ تھی تو گھٹوارن، لیکن سوستونتی میں ایک تھی۔ اس کا باپ داروتاڑی پی کر دن رات بے ہوش پڑا رہتا۔ مہوا کی سوتیلی ماں ساکشات راکشنی، بہت تیز نظر، چالاک۔ رات میں گانجا، دارو اور افیم چوری چوری بیچنے والوں سے لے کر طرح طرح کے لوگوں سے اس کی جان پہچان تھی۔ سب سے خوب میل جول۔ مہوا کنواری تھی لیکن اس کی ماں راکشنی نے کام کراتے کراتے مہوا کی ہڈیاں نکال دی تھیں۔ مہوا جوان ہوگئی، کہیں شادی بیاہ کی بات بھی نہیں چلائی۔ ایک رات کی بات سنیے۔''

ہیرامن نے دھیرے دھیرے گنگنا کر گلا صاف کیا—

''ہے۔ آ۔ آ۔ آ ساونا بھادوا کے۔ ر۔ امرل ندیا۔ گے۔ مے۔ یو۔ او۔ او،

میّو گے رینی بھیاونی۔ ہے۔ اے۔ اے۔ اے

تڑ کا تڑ کے دھڑ کے کریجا۔آ۔آ۔مورا
کہ ہم ہوں جے باری۔ نا نہی رے۔اے۔اے...''

(اوہ ماں! ساون بھادوں کی اُمڈتی ہوئی ندی، بھیانک رات، بجلی کڑکتی ہے، میں بالی کنواری ننھی بچی، میرا کلیجہ دھڑکتا ہے— اکیلی کیسے جاؤں گھاٹ پر؟ سو بھی ایک پردیسی راہی بٹوہی کے پیر میں تیل لگانے کے لیے۔ ست ماں نے اپنی بجر کواڑی بند کرلی۔ آسمان میں میگھ ہڑ بڑا اٹھے اور لگا تار بارش ہونے گی۔ مہوا رونے لگی اپنی مَری ماں کو یاد کر کے۔ آج اس کی ماں ہوتی تو ایسے بُرے وقت میں کلیجے سے لگا کر رکھتی اپنی مہوا بیٹی کو۔ ہے میّا، اسی دن کے لیے، یہی دن دکھانے کے لیے، تم نے کوکھ میں رکھا تھا؟ مہوا اپنی ماں پر جھنجھلائی۔ کیوں وہ اکیلی مرگئی— جی بھر کوستی ہوئی بولی...)

ہیرامن نے محسوس کیا کہ ہیرا بائی تکیے پر کہنی ٹیک کر گیت میں مگن ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔اس انداز میں ہیرا بائی اسے بہت بھلی لگی۔

ہیرامن نے اپنے گلے میں کپکپی پیدا کی—

ہوں دانیاں رے دانیا، میّا موری۔ی۔ی! نونوا چٹائی کا ہے نا ہیں
مارلی سوری گھر آ۔آ— ایہی دنوا خاطر چھنرو دھیا تہو۔
پوسیل کہ نینو۔دودھ۔اٹکن ...—

ہیرامن نے دم لیتے ہوئے پوچھا، ''بھاشا بھی سمجھتی ہیں یا خالی گیت ہی سنتی ہیں؟''

ہیرا بولی، ''سب سمجھتی ہوں۔اٹکن معنی ابٹن... جو دیہہ میں لگاتے ہیں۔''

ہیرامن نے حیرانی سے کہا، ''اوہ!'' اور پھر قصہ سنانا شروع کیا۔ ''سو رونے دھونے سے کیا ہووے۔ سوداگر نے پورا دام چکا دیا تھا مہوا کا۔ بال پکڑ کر گھسیٹتا ہوا ناؤ پر چڑھایا اور مانجھی کو حکم دیا: ناؤ کھولو۔ پال باندھو۔ پال والی ناؤ، پروالی چڑیا کی طرح اڑ چلی۔ رات بھر مہوا روتی رہی، تڑپتی رہی۔ سوداگر کے نوکروں نے بہت ڈرایا دھمکایا— چپ رہو، نہیں تو اٹھا کر پانی میں پھینک دیں گے! بس، مہوا کو بات سوجھ گئی۔ بھور کا تارا میگھ کی آڑ سے ذرا باہر آیا، پھر چھپ گیا۔ اِدھر مہوا بھی چھپاک سے پانی میں کود پڑی... سوداگر کا ایک نوکر مہوا کو دیکھتے ہی موہت ہو گیا تھا۔ مہوا کے پیچھے وہ بھی کودا۔ الٹی دھارا میں تیرنا کھیل نہیں، سو بھی بھری بھادوں کی ندی میں۔ مہوا اصل گھٹوارن کی بیٹی تھی۔ مچھلی بھلا تھکتی ہے پانی میں! سُفری مچھلی جیسی پھرپھراتی ہوئی پانی چیرتی، بھاگی چلی جارہی تھی اور اس کے پیچھے سوداگر کا نوکر پکار پکار کر کہتا ہے— مہوا، ذرا تھمو! تم کو پکڑنے نہیں آرہا— تمھارا ساتھی ہوں۔ زندگی بھر ساتھ رہیں گے ہم لوگ۔ لیکن...''

یہ ہیرامن کا بڑا پسندیدہ گیت ہے۔ مہوا گھٹوارن گاتے وقت اس کی آنکھوں کے سامنے ساون

بھادوں کی ندی بپھرنے لگتی ہے۔ اماوس کی رات، جب گھنے بادلوں میں رہ رہ کر بجلی چمک اٹھتی ہے۔ اسی چمک سے لہروں سے لڑتی ہوئی بالی کنواری مہوا کی جھلک اسے مل جاتی ہے۔ سفری مچھلی کی چال اور تیز ہو جاتی ہے۔ اس کو لگتا ہے، وہ خود سوداگر کا نوکر ہے۔ لیکن مہوا اس کی کوئی بات نہیں سنتی، کچھ محسوس نہیں کرتی، پلٹ کر بھی نہیں دیکھتی — اور وہ تیرتے تیرتے تھک گیا ہے...

لیکن اس بار لگتا ہے مہوا نے خود کو پکڑوا دیا ہے۔ اس نے مہوا کو چھو لیا ہے، پا لیا ہے۔ اس کی تھکن دور ہو گئی ہے۔ بپھری ہوئی ندی کے الٹے بہاؤ میں پندرہ بیس سال سے تیرتے ہوئے اس کے دل کو کنارہ مل گیا ہے۔ خوشی کے آنسو روکے سے نہیں رکتے۔

اس نے اپنی بھیگی آنکھیں ہیرابائی سے چرانے کی کوشش کی۔ لیکن ہیرابائی تو اس کے دل میں بیٹھی نہ جانے کب سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ہیرامن نے اپنی بھرائی ہوئی آواز پر قابو پاتے ہوئے، بیلوں کو جھڑکی دی۔ اس گیت میں نہ جانے کیا تھا کہ ہیرامن اور ہیرابائی دونوں ہی کھو گئے تھے۔

اچانک ہیرابائی نے ایک لمبی سانس لی اور بولی، ''تم تو استاد ہو میتا!''

ہیرامن کے انگ انگ میں ایک امنگ سما گئی۔

— شی ی ی!

آشون کارتک کا سورج دوبانس دن رہتے ہی ڈھل جاتا ہے۔ سورج ڈوبنے سے پہلے ہی متن پور پہنچنا ہے۔ ہیرامن اپنے بیلوں کو سمجھاتا ہے، ''قدم کھول کر اور کلیجہ باندھ کر چلو... اے... چھی چھی! بڑھ کے بھیّن! لے... لے... لے... اے... ہے... ہے!''

متن پور تک وہ اپنے بیلوں کو للکارتا رہا۔ ہر للکار سے پہلے وہ اپنے بیلوں کو بیتی باتوں کی یاد دلاتا۔ ''یاد نہیں، چودھری کی بیٹی کی بارات میں کتنی گاڑیاں تھیں۔ سب کو کیسے مات دی تھی! ہاں ہاں، وہی قدم نکالو! لے... لے... لے! متن پور سے فاربس گنج تین کوس ہے۔ دو گھنٹے اور!''

متن پور کے ہاٹ پر آج کل چائے بھی بکنے لگی ہے۔ ہیرامن اپنے لوٹے میں چائے بھر کر لے آیا ...وہ کمپنی کی عورت کو جانتا ہے جو سارا دن، ہر گھڑی چائے پیتی رہتی ہے۔ چائے ہے یا جان؟

ہیرابائی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہی ہے۔ ''ارے تم سے کس نے کہہ دیا کہ کنوارے آدمی کو چائے نہیں پینا چاہیے؟''

ہیرامن لجا گیا۔ اب وہ کیا کہتا... لاج کی بات تھی۔ لیکن ایک بار بھگت چکا ہے۔ اس نے سرکس کمپنی کی میم کے ہاتھ سے چائے پی تھی — تاثیر بڑی گرم تھی۔

''پیجئے گرو جی۔'' ہیرا ہنسی۔

''شی!''

متن پور کے ہاٹ پر ہی دیا بتی جل چکی تھی۔ ہیرامن نے اپنی سفری لالٹین جلا کر پچھوا میں لٹکا دی... آج کل شہر سے پانچ کوس دور گاؤں والے بھی خود کو شہری بابو سمجھنے لگے ہیں۔ روشنی کے بغیر جا رہی گاڑی کو پکڑ کر چالان کر دیتے ہیں۔ ایک جان، سو ستم۔

''آپ مجھے گرو جی مت کہیے۔''

''تم میرے استاد ہو۔ ہمارے شاستر میں لکھا ہے، ایک اکھشر سکھانے والا بھی گرو اور ایک راگ سکھانے والا بھی استاد۔''

''شی! شاستر پُران بھی جانتی ہیں؟... میں نے کیا سکھایا ہے؟ میں کیا...''

ہیرابائی ہنس کر گنگنانے لگی ہے: ''... آ... آ... ساونا... بھادوا کے... رے...!'' ہیرامن حیرت کے مارے گونگا ہو گیا... اُف اتنا تیز ذہن! ہو بہو مہوا گھٹوارن!

بیل گاڑی سیتادھار کی ایک خشک ڈھلوان پر گڑ گڑا کر نیچے اتری۔ ہیرابائی نے ایک ہاتھ سے ہیرامن کا کندھا پکڑ لیا اور بہت دیر تک اس کے کندھے پر ہیرابائی کی انگلیاں رکھی رہیں۔ ہیرامن نے اپنی آنکھیں کئی بار گھما کر اپنے کندھے پر مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ گاڑی چڑھائی پر پہنچی تو ہیرابائی کی ڈھیلی انگلیاں پھر تن گئیں۔

سامنے فاربس گنج کی روشنی جھلملا رہی تھی اور شہر سے تھوڑی دور میلے کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں... ٹپر میں لٹکی لالٹین کی روشنی میں پرچھائیں اِدھر اُدھر ناچتی رہی... ڈبڈبائی آنکھوں سے ہر روشنی سورج مکھی پھول کی طرح دکھائی دیتی ہے۔

فاربس گنج تو ہیرامن کے گھر کی دہلیز ہے۔

نہ جانے وہ کتنی بار فاربس گنج آیا ہے۔ میلے کا سامان لادا ہے۔ کسی عورت کے ساتھ؟ ہاں ایک بار — جس سال اس کی بھابی گونے میں آئی تھی، اسی طرح ترپال سے گاڑی کو چاروں طرف سے گھیر کر اس نے پردہ بنایا تھا۔

اور آج گاڑی بانوں کے حلقے میں ہیرامن اپنی گاڑی کو ترپال سے گھیر رہا ہے۔ صبح ہوتے ہی ہیرابائی منیجر سے بات کر کے روتا نوٹنکی کمپنی میں بھرتی ہو جائے گی۔ پرسوں میلہ کھل رہا ہے۔ اس بار میلے میں خوب رونق ہے۔

ہیرابائی، ایک رات — بس آج کی رات — ہیرامن کی گاڑی میں رہے گی... ہیرامن کی گاڑی میں — گھر میں نہیں۔

وہاں جمع گاڑی بانوں کی ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں۔ ''کہاں کی گاڑی ہے؟''

''کون، ہیرامن؟''

''کس میلے سے؟''

''کیا سامان؟''

گاؤں گاؤں کے گاڑی بان ایک دوسرے کو ڈھونڈھ کر، آس پاس گاڑیاں لگا کر پڑاؤ ڈالتے ہیں۔ اپنے گاؤں کے لال موہر، دھنی رام اور پٹیل داس جیسے گاڑی بانوں کے جمگھٹے کو دیکھ کر ہیرامن چکرا گیا۔ ادھر پٹیل داس پٹر میں جھانک کر یوں بدکا جیسے باگھ پر نظر پڑ گئی ہو۔

ہیرامن نے اشارے سے سب کو چپ کرایا۔ پھر گاڑی کی طرف آنکھ مار کر پھسپھسایا، ''چُپ! کمپنی کی عورت ہے، نوٹنکی کمپنی کی۔''

''کمپنی کی...ی...ی...ی؟''

؟؟...؟...؟...!

اب وہاں ایک نہیں بلکہ چار ہیرامن تھے۔ چاروں نے ایک دوسرے کی طرف بڑی حیرت سے دیکھا... کمپنی کے نام میں کتنا اثر ہے۔ ہیرامن نے محسوس کیا کہ اس کے تینوں ساتھی ہکا بکا رہ گئے ہیں۔ لال موہر نے ذرا پرے ہٹ کر، اشارے سے ہی ہیرابائی کی آواز سننے کی خواہش ظاہر کی۔ ہیرامن نے پٹر کی طرف منھ پھیر کر کہا، ''ہوٹل تو نہیں کھلا ہوگا کوئی، حلوائی کے یہاں سے کچھ لے آویں؟''

''ہیرامن، ذرا ادھر سنو... میں کچھ نہیں کھاؤں گی ابھی۔ لو، تم کھا آؤ۔''

''کیا ہے؟ پیسہ؟ پیچ!...'' پیسہ دے کر ہیرامن نے فاربس گنج میں کچی پکی نہیں کھائی۔ اس کے گاؤں کے اتنے گاڑی بان ہیں، کس دن کے لیے؟ وہ چھو نہیں سکتا پیسہ۔ اس نے ہیرابائی سے کہا، ''بیکار میلہ بازار میں حجت مت کیجیے۔ پیسہ رکھیے۔''

موقع پا کر لال موہر بھی پٹر کے قریب آ گیا۔ اس نے ہیرابائی کو سلام کرتے ہوئے کہا، ''چار آدمی کے بھات میں دو آدمی خوشی سے کھا سکتے ہیں۔ بھات پک رہا ہے۔ جی ی ی! ہم لوگ ایک ہی گاؤں کے ہیں۔ ہمارے رہتے ہوئے کیا ہوٹل اور حلوائی کے یہاں کھائے گا ہیرامن؟''

ہیرامن نے لال موہر کا ہاتھ دبا دیا۔ ''بے فجول مت بکو!''

گاڑی سے چار رسی دور جاتے ہوئے دھنی رام نے اپنے کلبلاتے ہوئے دل کی بات کہہ دی، ''تم بھی خوب ہو ہیرامن! اُس سال کمپنی کا باگھ، اِس بار کمپنی کی جنانہ!''

ہیرامن نے دبی آواز میں کہا، ''بھائی رے، یہ ہم لوگوں کے ملک کی جنانہ نہیں کہ لٹ پٹ بولی سن

کر بھی چپ رہ جائے۔ ایک تو پچھم کی عورت، تس پر کمپنی کی۔''

دھنی رام نے اپنا شبہ ظاہر کرتے ہوئے کہا، ''لیکن کمپنی میں تو سنتے ہیں بیسوا ہوتی ہے۔''

''دھت!'' سب نے ایک ساتھ اسے پھٹکارا۔ ''کیسا آدمی ہے! بیسوا رہے گی کمپنی میں بھلا؟ دیکھو اس کی بڑھی!... سنا ہے، دیکھا تو نہیں ہے کبھی؟''

دھنی رام نے اپنی غلطی مان لی۔ پلٹ داس کو بات سوجھی۔ ''ہیرامن بھائی، جنانہ جات اکیلی رہے گی گاڑی پر؟ کچھ بھی ہو، جنانہ آخر جنانہ ہی ہے۔ کوئی جرورت ہی پڑ جائے۔''

یہ بات سب کو اچھی لگی۔ ہیرامن نے کہا، ''بات ٹھیک ہے۔ پلٹ، تم جاؤ، گاڑی کے پاس ہی رہنا۔ اور دیکھو گپ شپ ذرا ہوشیاری سے کرنا، ہاں!''

ہیرامن کے جسم سے گلاب کے عطر کی خوشبو آ رہی ہے۔ اُس بار مہینوں اس کے جسم سے شیر کی بو نہیں گئی تھی، اور اِس بار لال موہر نے ہیرامن کا انگوچھا سونگھ لیا... اے...!

ہیرامن چلتے چلتے رک گیا۔ ''کیا کریں لال موہر بھائی، ذرا کہو تو۔ بڑی ضد کرتی ہے، کہتی ہے نوٹنکی دیکھنی ہی ہوگی۔''

''پھوکٹ میں ہی؟''

''اور گاؤں نہیں پہنچے گی یہ بات؟''

ہیرامن بولا، ''نہیں جی، ایک رات نوٹنکی دیکھ کر زندگی بھر بولی ٹھولی کون سنے؟ ویسی مرغا، ولایتی چال!''

دھنی رام نے پوچھا، ''پھوکٹ میں دیکھنے پر بھی تمھاری بھوجائی بات بنائے گی؟''

لال موہر کی گاڑی کے پہلو میں، لکڑی کی دکانیں لاد کر لائے ہوئے گاڑی بانوں کا پڑاؤ ہے۔ میر گاڑی بان بوڑھے میاں جان نے سفری گڑگڑی پیتے ہوئے پوچھا، ''کیوں بھائی، مینا بازار کی لادنی لاد کر کون آیا ہے؟''

''مینا بازار؟ مینا بازار تو بیسواؤں کے اڈے کو کہتے ہیں... کیا بولتا ہے یہ بوڑھا؟'' لال موہر نے ہیرامن کے کان میں پھسپھسا کر کہا، ''تمھاری دیہہ مہکتی ہے — سچ!''

لال موہر کے نوکر کا نام لہسنواں ہے۔ عمر میں سب سے چھوٹا ہے۔ پہلی بار آیا ہے تو کیا؟ بابوؤں کے ہاں بچپن سے نوکری کر چکا ہے۔ وہ رہ رہ کر ناک سکیڑ کر ہوا میں کچھ سونگھتا ہے۔ ہیرامن نے دیکھا، کہ لہسنواں کا چہرہ تمتما گیا ہے۔

...کون آ رہا ہے دھڑ دھڑاتا ہوا؟ — ''کون، پلٹ داس؟ کیا ہے؟''

پلٹ داس آ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ بھی تمتمایا ہوا تھا۔ ہیرامن نے پوچھا، ''کیا ہوا؟ بولتے کیوں نہیں؟''

اب پلٹ داس کیا جواب دیتا۔ ہیرامن نے اس سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ ذرا عقلمندی سے گپ شپ کرے۔ لیکن پلٹ داس گاڑی کی آسنی پر ہیرامن کی جگہ پر جا بیٹھا تھا۔ ہیرابائی نے پوچھا تھا، ''تم بھی ہیرامن کے ساتھی ہو؟'' پلٹ داس نے اپنی گردن ہلا کر ''ہاں'' کہی تھی۔ اس کے بعد ہیرابائی لیٹ گئی... اس کا چہرہ مہرہ دیکھ کر اور بات چیت سن کر پلٹ داس کا دل نہ جانے کیوں زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ ہاں، رام لیلا میں سیتا سوکماری اسی طرح تھکی لیٹی ہوئی تھی۔ جے! سیاور رام چندر کی جے... پلٹ داس کے دل میں جے جے کار ہونے لگا تھا۔ وہ ویشنو بھگت تھا۔ کیرتن بھی کیا کرتا تھا۔ اس نے تھکی سیتا مہارانی کے پاؤں دابنے کی خواہش کا اظہار اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے اس طرح کیا تھا جیسے وہ انھیں ہارمونیم کے سُروں پر نچا رہا ہو۔ ہیرابائی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ ''ارے، پاگل ہے کیا؟ جاؤ، بھاگو!''

پلٹ داس کو لگا کہ غصے سے بپھری ہوئی کمپنی کی عورت کی آنکھوں میں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں — اور وہ وہاں سے بھاگ آیا تھا۔

اب پلٹ داس کیا جواب دیتا! وہ میلے سے بھی بھاگنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ بولا، ''کچھ نہیں۔ ہم کو بیوپاری مل گیا۔ ابھی ٹیشن جا کر مال لادنا ہے۔ بھات میں تو ابھی دیر ہے۔ میں لوٹ آتا ہوں تب تک۔''

بھات کھاتے ہوئے دھنی رام اور لہسنواں نے پلٹ داس کی بہت برائی کی۔ ''چھوٹا آدمی ہے۔ کمینہ ہے۔ پیسے پیسے کا حساب جوڑتا ہے۔''

کھانے پینے کے بعد لال موہر کے ساتھی الگ الگ ہو گئے۔ دھنی اور لہسنواں گاڑی جوت کر ہیرامن کے ساتھ چل دیے۔ ہیرامن نے چلتے چلتے رک کر لال موہر سے کہا، ''ذرا میرے اس کندھے کو سونگھ تو۔ سونگھ کر دیکھو نا!''

لال موہر نے کندھا سونگھ کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے منھ سے ایک مبہم سا لفظ نکلا، ''اے... ہے..!''

ہیرامن نے کہا، ''ذرا سا ہاتھ رکھنے پر اتنی خوشبو... سمجھے؟''

لال موہر نے ہیرامن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''کندھے پر ہاتھ رکھا تھا؟ سچ؟... سنو ہیرامن، نوٹنکی دیکھنے کا ایسا موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں لگے گا۔ ہاں!''

''تم بھی دیکھو گے؟''

لال موہر کی باچھیں کھل اٹھیں۔

گاڑی کے پاس پہنچ کر ہیرامن نے دیکھا کہ ٹپر کے پاس کھڑا کوئی ہیرابائی سے باتیں کر رہا ہے۔ دھنسی اور لہسنواں نے ایک ساتھ کہا، ''کہاں رہ گئے تھے پیچھے؟ بہت دیر سے کھوج رہی ہے کمپنی!''

ہیرامن نے ٹپر کے پاس جا کر دیکھا تو وہ چونک اٹھا— ارے، یہ تو وہی بکس ڈھونے والا نوکر ہے جو چمپانگر میلے میں ہیرابائی کو گاڑی میں بٹھا کر اندھیرے میں غائب ہو گیا تھا۔

''آ گئے ہیرامن؟ اچھی بات ہے۔ اِدھر آؤ... یہ لو اپنا کرایہ، اور یہ لو اپنا انعام۔''

— پچیس، پچیس، پچاس!

ہیرامن کو لگا کہ کسی نے دھکا دے کر اسے آسمان سے دھرتی پر پٹخ دیا ہے— کسی نے کیوں؟ اسی بکس ڈھونے والے ملازم نے۔ کہاں سے آن مرا؟ زبان پر آئی ہوئی بات زبان پر ہی رہ گئی... ہائے، انعام! اور ہیرامن چپ چاپ کھڑا رہا۔

ہیرابائی بولی، ''لو، پکڑو! اور سنو، کل صبح اروتہ کمپنی میں آ کر مجھ سے بھینٹ کرنا۔ پاس بنوا دوں گی... بولتے کیوں نہیں؟''

لال موہر نے کہا، ''اِلام، بکسیس دے رہی ہیں مالکن۔ لے لو ہیرامن۔'' ہیرامن نے بگڑ کر لال موہر کی طرف دیکھا... بولنے کا ذرا بھی ڈھنگ نہیں اس لال موہر کو!

دھنی رام نے زیرلب کہا، ''بیل گاڑی چھوڑ کر میلے میں نوٹنکی کیسے دیکھ سکتا ہے کوئی گاڑی بان!'' لیکن دھنی کی یہ بات نہ صرف سب نے بلکہ ہیرابائی نے بھی سن لی تھی۔

ہیرامن نے روپے لیتے ہوئے کہا، ''کیا بولیں گے!'' اس نے ہنسنے کی کوشش کی... کمپنی کی عورت کمپنی میں جا رہی ہے، ہیرامن کا کیا!

بکس ڈھونے والا راستہ دکھاتا ہوا آگے بڑھا۔ ''اِدھر سے۔''

ہیرابائی جاتے جاتے رُک گئی۔ ہیرامن کے بیلوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولی، ''اچھا میں چلی بھیّن!''

بیلوں نے بھیّن لفظ پر کان ہلا دیے۔

؟؟...؟؟...؟...!

''بھائیو! آج رات! دی اروتہ سنگیت نوٹنکی کمپنی کے اسٹیج پر! گلبدن دیکھیے، گلبدن! آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ متھرا موہن کمپنی کی مشہور ایکٹریس مس ہیرا دیوی، جن کی ایک ایک ادا پر ہزار جانیں فدا ہیں،

اس بار ہماری کمپنی میں آ گئی ہیں۔ یاد رکھیے۔ آج کی رات۔ مس ہیرادیوی گلبدن...!''

نوٹنکی والوں کے اس اعلان سے میلے میں ہر جگہ ہیرابائی کا چرچا ہورہا ہے... ہیرابائی؟ مس ہیرا دیوی؟ لیلے، گلبدن...؟ فلم ایکٹریس کو مات کرتی ہے!...

تیری بانکی ادا پر میں خود ہوں فدا
تیری چاہت کا دلبر بیاں کیا کروں
یہی خواہش ہے تو مجھ کو دیکھا کرے
اور دل و جان میں تجھ کو دیکھا کروں

کرررر...کڑ ڑ ڑ ڑ ڑ ڑ ر ر رگھن۔گھن۔گھن۔دھڑام!

ہر آدمی کا دل نقارے کی طرح بج رہا ہے۔

لال موہر دوڑتا ہانپتا ٹھکانے پر آیا۔''اے اے ہیرامن! یہاں کیا بیٹھے ہو؟ چل کر دیکھو کیسی جے جے کار ہورہی ہے۔ باجے گاجے چھاپی فارم (پوسٹر) کے ساتھ ہیرابائی کی جے جے ہورہی ہے۔''

ہیرامن بڑبڑا کر اٹھا۔ لہنسواں نے کہا،''دھنی کا کا، تم ٹھکانے پر رہو، میں بھی دیکھ آؤں۔''

دھنی کی بات کون سنتا ہے! وہ تینوں نوٹنکی کمپنی کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کے پیچھے پیچھے ہولیے۔ ہر موڑ پر رک کر، باجا بند کر کے، اعلان کیا جاتا ہے۔ اعلان کے ہر لفظ پر ہیرامن کا دل خوشی سے کھل اٹھتا ہے۔ ہیرابائی کا نام، نام کے ساتھ ادا، فدا وغیرہ سن کر اس نے لال موہر کی پیٹھ تھپتھپادی۔''دھنیہ ہے! ہے یا نہیں؟''

لال موہر نے کہا،''اب بولو! اب بھی نوٹنکی نہیں دیکھو گے؟''

صبح سے ہی دھنی رام اور لال موہر سمجھا رہے تھے اور سمجھاتے سمجھاتے تھک ہار چکے تھے۔

''کمپنی میں جا کر بھینٹ کر آؤ۔''

''جاتے جاتے پکی کر گئی ہے۔''

لیکن ہیرامن کے پاس ہر بات کا ایک ہی جواب تھا:''دھت، کون بھینٹ کرنے جائے! کمپنی کی عورت، کمپنی میں گئی۔ اب اسے کیا لینا، پہچانے گی بھی نہیں۔''

ہیرامن دل ہی دل میں روٹھا ہوا تھا۔ اعلان سننے کے بعد اس نے لال موہر سے کہا،''ضرور دیکھنا چاہیے، کیوں لال موہر؟''

دونوں آپس میں صلاح مشورہ کر کے اروتہ کمپنی کی طرف چل دیے۔ خیمے کے پاس پہنچ کر ہیرامن نے لال موہر کو اشارہ کیا کہ اب وہ پوچھ تاچھ کرے کیوں کہ یہ اسی کی ذمہ داری تھی۔ لال موہر مہذب بولی جانتا تھا۔ اس نے ایک کالے کوٹ والے سے کہا،''بابو صاحب، ذرا سنیے تو۔''

کالے کوٹ والے نے ناک بھوں چڑھا کر کہا، ''کیا ہے؟ ادھر کیوں؟''

لال موہر کی مہذّب بولی ہڑ بڑا گئی۔ تیور دیکھ کر بولا، ''گُل گُل ...نہیں ـنہیں ...بُلبُل ...بُلبُل ...!''

ہیرامن نے جھٹ بات سنبھال لی۔ ''ہیرا دیوی کدھر رہتی ہیں، بتا سکتے ہیں؟''

اس آدمی کی آنکھیں یکدم لال ہوگئیں۔ اس نے سامنے کھڑے نیپالی سپاہی کو پکار کر پوچھا، ''ان لوگوں کو کیوں آنے دیا اِدھر؟''

''ہیرامن!'' وہی رس بھری آواز آئی۔ خیمے کے پردے کو ہٹا کر ہیرابائی نے بلایا۔ ''یہاں آجاؤ اندر ...دیکھو، بہادر! اس کو پہچان لو۔ یہ میرا ہیرامن ہے۔ سمجھے؟''

نیپالی ہیرامن کی طرف دیکھ کر ذرا مسکرایا اور وہاں سے جاکر کالے کوٹ والے سے کہا، ''ہیرابائی کا آدمی ہے۔ نہیں روکنے کو بولا۔''

لال موہر نیپالی کے لیے پان لے آیا۔ ''کھائیے۔''

ایک نہیں، پانچ پاس— چاروں اٹھنیا! بولی کہ جب تک میلے میں ہو، روز رات میں آکر دیکھنا۔ سب کا خیال رکھتی ہے۔ بولی کہ تمھارے اور ساتھی ہیں، سب کے لیے پاس لے جاؤ۔ کمپنی کی عورتوں کی بات ہی نرالی ہوتی ہے۔ ہے یا نہیں؟

لال موہر نے سرخ کاغذ کے ٹکڑے کو چھوکر دیکھا۔ ''پاس! واہ رے ہیرامن بھائی!...لیکن پانچ پاس لے کر کیا ہوگا؟ پلٹ داس پھر پلٹ کر آیا ہی نہیں ہے ابھی تک۔''

ہیرامن نے کہا، ''جانے دو ابھاگے کو۔ تقدیر میں لکھا نہیں... ہاں پہلے گرو کی قسم کھانی ہوگی سبھی کو، کہ گاؤں گھر میں یہ بات ایک پنچھی بھی نہ جان پائے گا!''

لال موہر نے بھڑک کر کہا، ''کون سالا بولے گا جاکر؟ پلٹا نے اگر بدمعاشی کی تو دوسری بار سے پھر ساتھ نہیں لاؤں گا۔''

ہیرامن نے اپنے روپوں کی تھیلی آج ہی ہیرابائی کی تحویل میں دے دی ہے۔ میلے میں کیا بھروسا۔ قسم قسم کے جیب کترے ہر سال میلے میں آتے ہیں۔ اپنے ساتھیوں اور ہمراہیوں کا بھی کیا بھروسا۔ ہیرابائی نے ہیرامن کے روپوں کی تھیلی کو چمڑے کے اٹیچی کیس میں رکھ دیا۔ اٹیچی کیس کے اوپر بھی کپڑے کا غلاف اور اندر بھی جھلمل ریشمی استر۔

لال موہر اور دھنی رام نے مل کر ہیرامن کی عقلمندی کی تعریف کی۔ اس کے مقدر کو بار بار سراہا۔ دبی زبان میں اس کے بھائی اور بھاوج کی بُرائی کی کہ انھیں ہیرامن جیسا ہیرا بھائی ملا ہے، کوئی دوسرا ہوتا تو...

لہسنواں جب لوٹا تو اس کا منھ لٹکا ہوا تھا۔ اعلان سنتے سنتے وہ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا کہ اب شام

ہونے کے بعد ہی لوٹا ہے۔ لال موہر نے اسے ایک گالی کے ساتھ مالکانہ جھڑکی دی۔ ''شہدا کہیں کا!''

دھنی رام نے چولھے پر کھچڑی چڑھاتے ہوئے کہا، ''پہلے یہ فیصلہ کرلو کہ گاڑی کے پاس کون رہے گا؟''

''رہے گا کون؟ یہ لہسنواں کہاں جائے گا؟''

لہسنواں رو پڑا۔ ''ہے ہے ے ے۔ مالک، ہاتھ جوڑتا ہوں۔ اِکے جھلک! بس ایک جھلک!''

ہیرامن نے فراخ دلی سے کہا، ''اچھا اچھا، ایک جھلک کیوں، ایک گھنٹہ بھر دیکھنا— میں آجاؤں گا۔''

نوٹنکی شروع ہونے سے دو گھنٹے پہلے ہی نقارہ بجنا شروع ہوگیا اور نقارہ بجتے ہی لوگ پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ ٹکٹ گھر کے پاس جمع بھیڑ کو دیکھ کر ہیرامن کو بڑی ہنسی آئی۔ ''لال موہر، اُدھر دیکھ، کیسی دھکا مکّی کر رہے ہیں لوگ!''

''ہیرامن بھائی۔''

''کون، پلٹ داس؟ کہاں کا سامان لادلائے؟'' لال موہر نے پرائے گاؤں کے آدمی کی طرح پوچھا۔

پلٹ داس نے ہاتھ ملتے ہوئے معافی مانگی۔ ''قصور وار ہیں، جو سزا دو تم لوگ سب منظور ہے لیکن سچی بات کہیں کہ سیا سوکماری...''

ہیرامن کے دل کا کنول نقارے کے تال پر کھل گیا ہے۔ بولا، ''دیکھ پلٹا۔ یہ مت سمجھنا کہ گاؤں گھر کی جنانہ ہے۔ دیکھو تمھارے لیے بھی پاس دیا۔ پاس لے لو اپنا، تماشا دیکھو۔''

لال موہر نے کہا، ''لیکن ایک شرط پر ملے گا۔ بیچ بیچ میں لہسنواں کو بھی...''

پلٹ داس کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی لہسنواں سے بات کر آیا تھا۔

لال موہر نے دوسری شرط سامنے رکھی۔ ''گاؤں میں یہ بات اگر کسی کو معلوم ہوئی کسی طرح...''

''رام رام!'' پلٹ داس نے اپنے دانتوں سے اپنی زبان کو کاٹتے ہوئے کہا۔

پلٹ داس نے بتایا، اٹھنیا پھاٹک اِدھر ہے۔ پھاٹک پر کھڑے دربان نے ان سے پاس لے کر ان کے چہروں کو باری باری دیکھا اور بولا، ''یہ تو پاس ہیں! کہاں سے ملے؟''

اب لال موہر کی مہذب بولی کے جوہر کھلے۔ اس کے تیور دیکھ کر دربان گھبرا گیا۔ ''ملے گا کہاں سے؟ اپنی کمپنی سے پوچھ لیجیے جا کر! چار ہی نہیں، دیکھیے ایک اور ہے۔'' جیب سے پانچواں پاس نکال کر لال موہر نے دکھایا۔

ایک روپے والے پھاٹک پر نیپالی دربان کھڑا تھا۔ ہیرامن نے پکار کر کہا، ''اے سپاہی راجو! صبح کو

ہی پچھوا دیا اور ابھی بھول گئے؟''

نیپالی دربان وہیں سے بولا، ''ہیرابائی کا آدمی ہے سب، جانے دو۔ پاس ہے تو پھر کا ہے کو روکتا ہے؟''

اٹھنیا درجہ!

تینوں نے ''کپڑ گھر'' کو اندر سے پہلی بار دیکھا۔ سامنے بنچ کرسی والے درجے تھے۔ پردے پر رام بن باس کا منظر تھا۔ پلٹ داس پہچان گیا۔ اس نے پردے پر بنے رام، سیا سوکماری اور لکھن کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ ''جے ہو، جے ہو!'' اور پلٹ داس کی آنکھیں بھر آئیں۔

ہیرامن نے کہا، ''لال موہر، چھاپی سبھی کھڑے ہیں یا چل رہے ہیں؟''

لال موہر اپنے دائیں بائیں بیٹھے تماشائیوں سے جان پہچان پیدا کر چکا تھا۔ اس نے ہیرامن کی بات کا جواب دیا، ''کھیل ابھی پردے کے بھیتر ہے۔ لوگ جمانے کے لیے پردہ ہلا رہے ہیں۔''

پلٹ داس ڈھولک بجانا جانتا تھا، اس لیے نقارے کی تال پر وہ اپنی گردن ہلاتا تھا اور دیا سلائی کی ڈبیا پر تال دیتا تھا۔ بیڑی کے ذریعے ہیرامن نے بھی ایک آدھ جان پہچان پیدا کر لی تھی۔ لال موہر کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے اپنے جسم کو چادر سے لپیٹتے ہوئے کہا، ''ناچ شروع ہونے میں ابھی دیر ہے، تب تک ایک نیند ہی لے لیں... سب درجے سے اچھا اٹھنیا درجہ! یہ سب سے پیچھے سب سے اونچی جگہ پر ہے! زمین پر گرم پیال! ہے ہے! کرسی پر بیٹھ کر اس سردی کے موسم میں تماشا دیکھنے والے، دیکھو ابھی کیسے اٹھ اٹھ کر چائے پینے کے لیے جاتے ہیں!''

پھر اس آدمی نے اپنے ساتھی سے کہا، ''کھیل شروع ہونے پر جگا دینا۔ نہیں نہیں، کھیل شروع ہونے پر نہیں، بلکہ ہیریا جب اسٹیج پر آئے، ہم کو جگا دینا۔''

ہیرامن کا جی جل گیا۔ وہ بڑبڑایا، ''ہیریا! بڑا لٹ پٹیا آدمی معلوم پڑتا ہے۔'' اور پھر ہیرامن نے آنکھ کے اشارے سے لال موہر سے کہا، ''اس آدمی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔''

دھن دھن دھن دھنز ام... پردہ اٹھ گیا۔

ہے... ہے... ے! ہیرابائی شروع میں ہی آ گئی اسٹیج پر۔

پنڈال کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ ہیرامن کا منھ حیرت سے کھل گیا۔ لال موہر کو نہ جانے کیوں بے تحاشا ہنسی آ رہی تھی۔ وہ ہیرابائی کے ہر بول پر بلاوجہ ہنس رہا تھا۔

گلبدن دربار لگائے بیٹھی ہے۔ اعلان کر رہی ہے، ''جو آدمی تخت ہزارہ بنا کر لا دے گا، منھ مانگی چیز انعام میں پائے گا!... اجی ہے کوئی ایسا فنکار، تو ہو جائے تیار، بنا کر لائے تخت ہز...ا...رہ!''

کڑکڑ...کررر...''گبب ناچتی ہے!''

''کیا گلا ہے! معلوم ہوتا ہے،'' یہ آدمی کہتا ہے،''کہ ہیرابائی پان بیڑی، سگریٹ زردہ، کچھ نہیں کھاتی۔''

''ٹھیک کہتا ہے۔ بڑی نیئم (اصول) والی رنڈی ہے۔''

ہیرامن بلبلا اٹھا۔''کون کہتا ہے کہ رنڈی ہے؟ دانت میں مسی کہاں ہے؟''

'پوڈر سے دانت دھولیتی ہوگی۔''

''ہرگز نہیں۔''

''کون آدمی ہے؟ بے بات کی بات کرتا ہے۔''

''کون ہے جو کمپنی کی عورت کو بیسوا کہتا ہے؟''

''تم کو بات کیوں لگی؟ کون ہے تو؟ رنڈی کا بھڑوا؟''

''مارو سالے کو!''

''مارو!''

''تیری...!''

اس ہنگامے میں ہیرامن کی آواز پنڈال کو پھاڑ رہی تھی،''آؤ، ایک ایک کی گردن اتار لیں گے۔''

لال موہرا اپنے چابک سے سامنے بیٹھے لوگوں کو بری طرح پیٹ رہا تھا۔ پلٹ داس ایک آدمی کی چھاتی پر سوار تھا۔''سالا، سیاسو کماری کو گالی دیتا ہے، سو بھی مسلمان ہوکر؟''

دھنی رام شروع سے ہی چپ تھا۔ مار پیٹ شروع ہوتے ہی وہ وہاں سے باہر بھاگ گیا تھا۔

کالے کوٹ والے نوٹنکی کے منیجر صاحب اپنے نیپالی سپاہی کے ساتھ وہاں آن پہنچے۔ ایک داروغہ صاحب نے بلوا کرنے والوں کو ہنٹر سے پیٹنا شروع کر دیا۔ ہنٹر کی پہلی چوٹ پر لال موہر تلملا اٹھا۔ اس نے مہذب بولی میں تقریر شروع کر دی،''داروغہ صاحب، آپ مارتے ہیں تو ماریے، کوئی حرج نہیں، لیکن یہ پاس دیکھ لیجیے، ایک پاس پاکٹ میں بھی ہے۔ دیکھ سکتے ہیں ہجور! ٹکٹ نہیں، پاس! تب ہم لوگوں کے سامنے کمپنی کی عورت کو کوئی بُری بات کہے تو ہم کیسے چھوڑ دیں گے؟''

کمپنی کے منیجر صاحب کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ انھوں نے داروغہ صاحب کو سمجھایا،''حضور، میں سمجھ گیا۔ یہ ساری بدمعاشی متھرا موہن کمپنی والوں کی ہے۔ تماشے میں جھگڑا کر کے کمپنی کو بدنام کرنا چاہتے ہیں...حضور آپ ان لوگوں کو چھوڑ دیجیے۔ یہ ہیرابائی کے آدمی ہیں— بیچاری کی جان خطرے میں ہے۔ حضور سے کہا تھا نا؟''

ہیرابائی کا نام سنتے ہی داروغہ صاحب نے تینوں کو چھوڑ دیا، لیکن تینوں کی چابکیں چھین لی گئیں۔ منیجر صاحب نے تینوں کو ایک روپے والے درجے میں کرسیوں پر بٹھایا۔ ''آپ لوگ یہیں بیٹھیے۔ پان بھجوائے دیتا ہوں۔''

ہنگامہ ختم ہوتے ہی ہیرابائی اسٹیج پر لوٹ آئی۔

نقارہ پھر بج اٹھا۔

تھوڑی دیر بعد تینوں کو یکبارگی دھنی رام کا خیال آیا۔ ''ارے دھنی رام کہاں گیا؟''

''مالک، او مالک!'' لہسنواں خیمے باہر چلّا چلّا کر پکار رہا تھا، ''او لال موہر ما...ل..ک!''

لال موہر نے اسی لہجے میں جواب دیا، ''اِدھر سے، اِدھر سے! ایک ٹنگیا پھانک سے!''

سب تماشائیوں نے اپنی گردنیں گھما کر لال موہر کی طرف دیکھا۔ اتنے میں لہسنواں کو وہی نیپالی سپاہی لال موہر کے پاس لے آیا۔ لال موہر نے جیب سے پاس نکال کر دکھا دیا۔ لہسنواں نے آتے ہی پوچھا، ''مالک، کون آدمی کیا بول رہا تھا؟ بولیے تو ذرا۔ چہرہ تو دکھلا دیجیے۔ اس کی ایک جھلک!''

لوگوں نے لہسنواں کا چوڑا چکلا سینہ دیکھا۔ سردی کے موسم میں بھی اس کا جسم نیم برہنہ تھا۔

لال موہر نے لہسنواں کو ٹھنڈا کیا۔

...ان تینوں چاروں سے مت پوچھیے کہ نوٹنکی میں کیا دیکھا! قصہ کیسے یاد رہتا، کیوں کہ ہیرامن کو لگتا تھا کہ ہیرابائی شروع سے ہی اُسے نٹنکی باندھے دیکھ رہی ہے، گا رہی ہے، ناچ رہی ہے۔ لال موہر کو محسوس ہو رہا تھا کہ ہیرابائی ہیرامن کو نہیں بلکہ اُسے دیکھ رہی ہے، اور سمجھ گئی ہے کہ لال موہر ہیرامن سے بھی زیادہ ''پاور والا'' آدمی ہے! پلٹ داس قصہ سمجھاتا ہے... ''قصہ اور کیا ہوگا، رامائن کی بات! وہی رام، وہی سیتا، وہی لکھن اور وہی راون۔ سیتا سوکماری کو رام جی سے چھیننے کے لیے راون طرح طرح کے روپ دھار کر آتا ہے۔ رام اور سیتا بھی روپ بدل لیتے ہیں۔ یہاں بھی تخت ہزارہ بنانے والا مالی کا بیٹا رام ہے، گلبدن سیا کماری ہے۔ مالی کے لڑکے کا دوست لکھن ہے اور سلطان ہے راون...''

لہسنواں کو سب سے اچھا پارٹ جوکر کا لگا ہے... چریا تو ہنکے لے کے نہ جئی دے نرہٹ کے بجریا! لہسنواں اس جوکر سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔ وہ وہیں سے چلّایا، ''نہیں لگائیے گا دوستی جوکر صاحب؟''

ہیرامن کے ہاتھ ایک گیت کی آدھی کڑی لگی تھی، ''مارے گئے گلفام...'' کون تھا یہ گلفام؟ ہیرابائی روتی ہوئی گا رہی تھی، ''اجی ہاں مارے گئے گلفام...'' بیچارہ گلفام!

تینوں کو چابک واپس دیتے ہوئے پولیس کے سپاہی نے کہا، ''لاٹھی چابک لے کر ناچ دیکھنے آتے ہو؟''

دوسرے دن سارے میلے میں یہ بات پھیل گئی — ہیرابائی متھرا موہن کمپنی سے بھاگ کر آئی ہے۔ اسی لیے اس بار میلے میں متھرا موہن کمپنی نہیں آئی ہے، اس کے غنڈے آئے ہیں۔ ہیرابائی بھی کم نہیں۔ بڑی کھلاڑی عورت ہے جو طرح طرح کے دیہاتی لٹھ باز پال رہی ہے... ''واہ میری جان'' بھی کہے تو کوئی — مجال ہے!

دس دن — دن رات...

دن بھر ہیرامن مال و اسباب ڈھوتا۔ شام ہوتے ہی نوٹنکی کا نقارہ بج اٹھتا۔ نقارے کی آواز سنتے ہی ہیرامن کو یوں لگتا جیسے ہیرابائی اس کے کانوں میں رس گھول رہی ہو — ''بھیّا... میتا... ہیرامن... استاد... گرو جی...'' دن بھر اس کے کانوں میں کوئی نہ کوئی باجا بجتا رہتا — کبھی ہارمونیم، کبھی نقارہ، کبھی ڈھولک اور کبھی ہیرابائی کی پازیب۔ انھیں سازوں کی گت پر ہیرامن اٹھتا بیٹھتا، چلتا پھرتا تھا۔ نوٹنکی کمپنی کے منیجر سے لے کر پردہ کھینچنے والے تک اس کو پہچانتے تھے — ہیرابائی کا آدمی ہے۔

پلٹ داس ہر شب نوٹنکی شروع ہونے سے پہلے ہاتھ جوڑ کر بڑی عقیدت سے اسٹیج کو نمسکار کرتا تھا۔ لال موہر ایک دن اپنی مہذب بولی ہیرابائی کو سنانے گیا تھا۔ ہیرابائی نے اسے پہچانا تک نہیں۔ تب سے لال موہر کا دل چھوٹا ہوگیا ہے۔ اس کا نوکر لہسنواں اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے اور نوٹنکی کمپنی میں بھرتی ہوگیا ہے۔ جوکر سے اس کی دوستی ہوگئی ہے۔ دن بھر پانی بھرتا ہے، کپڑے دھوتا ہے۔ کہتا ہے، گاؤں میں کیا ہے جو جائیں گے۔ لال موہر اُداس رہتا ہے۔ دھنی رام بیمار ہوکر گھر چلا گیا ہے۔

ہیرامن آج صبح سے تین بار مال لاد کر اسٹیشن پر آچکا ہے۔ آج نہ جانے کیوں اس کو اپنی بھاوج کی یاد آرہی ہے... کہیں دھنی رام نے بخار کی جھونک میں کچھ کہہ نہ دیا ہو۔ یہاں کتنا انٹ شنٹ بک رہا تھا — گلبدن، تخت ہزارہ۔ لہسنواں موج میں ہے۔ دن بھر ہیرابائی کو دیکھتا ہوگا۔ کل کہہ رہا تھا، ''ہیرامن مالک، تمھارے اقبال سے خوب موج میں ہوں۔ ہیرابائی کی ساڑھی دھونے کے بعد کٹھوتے کا پانی عطر گلاب ہو جاتا ہے۔ اس میں اپنی مچھی ڈبو کر چھوڑ دیتا ہوں۔ لو سونگھو گے؟'' ہر رات کسی نہ کسی کے منھ سے وہ سنتا ہے، ''ہیرابائی رنڈی ہے۔'' کتنے لوگوں سے وہ الجھے! بنا دیکھے ہی لوگ کیسے کوئی بات کہہ دیتے ہیں۔ راجا کو بھی لوگ پیٹھ پیچھے گالی دیتے ہیں... آج وہ ہیرابائی سے ملے گا اور کہے گا کہ نوٹنکی کمپنی میں رہنے پر لوگ بہت بدنام کرتے ہیں۔ سرکس کمپنی میں کیوں نہیں کام کرتی؟ سب کے سامنے جب ہیرابائی ناچتی ہے اُس وقت بھی ہیرامن کا دل جلتا رہتا ہے۔ سرکس کمپنی میں جائے گی تو وہاں باگھ کو نچائے گی۔ اور وہاں باگھ کے پاس کوئی دم بھی نہیں مار سکے گا۔ وہاں ہیرابائی ایسے لوگوں سے بچی رہے گی۔

''ہیرامن، اے ہیرامن بھیا!'' لال موہر کی آواز سن کر ہیرامن نے گردن موڑ کر دیکھا اور پوچھا، ''کیا لادکر آیا ہے لال موہر؟''

''تم کو ڈھونڈھ رہی ہے ہیرابائی اسٹیشن پر۔ جارہی ہے،'' لال موہر ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔ اسی کی گاڑی پر ہیرابائی میلے سے اسٹیشن گئی تھی۔

''جارہی ہے؟ کہاں؟ ریل گاڑی سے جارہی ہے؟''

ہیرامن نے گاڑی کھول دی۔ مال گودام کے چوکیدار سے کہا، ''بھیا، ذرا بیل گاڑی دیکھتے رہیے۔ آ رہے ہیں۔''

''استاد!'' زنانہ مسافر خانے کے پھاٹک کے قریب ہی ہیرابائی اپنی اوڑھنی سے منھ ہاتھ ڈھانپ کر کھڑی تھی۔ تھیلی آگے بڑھاتے ہوئے بولی، ''لو۔ ہے بھگوان، بھینٹ ہوگئی، چلو۔ میں تو امید کھو چکی تھی۔ تم سے اب بھینٹ نہیں ہوسکے گی... میں جارہی ہوں گروجی۔''

بکس ڈھونے والا ملازم آج کوٹ پتلون پہن کر بابو صاحب بن گیا تھا۔ وہ مالکوں کی طرح قلیوں کو حکم دے رہا تھا ''جنانہ درجے میں چڑھانا، اچھا!''

ہیرامن ہاتھ میں تھیلی لیے چپ چاپ کھڑا رہا۔ ہیرابائی نے اپنے کرتے کے اندر سے تھیلی نکال کر دی تھی... تھیلی چڑیا کے پوٹے کی طرح گرم تھی۔

''گاڑی آرہی ہے۔'' بکس ڈھونے والے نے عجیب سا منھ بناتے ہوئے ہیرابائی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر صاف لکھا تھا: ''اتنا زیادہ کیا ہے؟''

ہیرابائی جذباتی ہوگئی۔ بولی، ''ہیرامن، اِدھر آؤ اندر۔ میں پھر لوٹ کر متھرا موہن کمپنی میں جارہی ہوں۔ اپنے دیش کی کمپنی ہے... بنیلی کے میلے میں آؤ گے نا؟''

ہیرابائی نے ہیرامن کے کندھے پر ہاتھ رکھا... اس بار دائیں کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ پھر اپنی تھیلی سے روپے نکالتے ہوئے بولی، ''ایک گرم چادر خرید لینا...''

بڑی دیر کے بعد ہیرامن کی آواز نے اس کا ساتھ دیا۔ ''ارے، ہر دم روپیہ پیسہ! رکھیے روپیہ.... کیا کریں گے چادر؟''

ہیرابائی کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے ہیرامن کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ پھر بولی، ''تمھارا جی بہت چھوٹا ہوگیا ہے۔ کیوں میتا؟.... مہوا کو سوداگر نے خرید جو لیا ہے گروجی....''

ہیرابائی کا گلا بھر آیا۔ بکس ڈھونے والے نے باہر سے آواز دی، ''گاڑی آگئی۔'' ہیرامن کمرے سے باہر نکل آیا۔ بکس ڈھونے والے نے نوٹنکی کے جوکر کی طرح منھ بنا کر کہا، ''پلاٹ فارم سے باہر بھاگو!

بنا ٹکٹ کے پکڑے گئے تو تین مہینے کی ہوا...''

ہیرامن چپ چاپ پھاٹک سے باہر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ہیرامن نے سوچا، ''ٹیشن کی بات، ریلوے کا راج... نہیں تو میں اس بکس ڈھونے والے کا منھ سیدھا کر دیتا۔''

ہیرابائی اس کے ٹھیک سامنے والے ڈبے میں سوار ہوئی۔

''ہائے، اتنا ٹان! گاڑی میں بیٹھ کر بھی میری اور دیکھ رہی ہے ٹکر ٹکر...'' لال موہر کو دیکھ کر جی جل اٹھتا ہے۔ ''ہمیشہ پیچھے پیچھے۔ ہر دم حصہ داری سوجھتی ہے اسے!''

گاڑی نے سیٹی دی۔ ہیرامن کو لگا کہ اس کے اندر سے کوئی آواز نکل کر سیٹی کے ساتھ اوپر کی طرف چلی گئی ہے— کُو...وُ...وُ! اسس...! چھی...ی...ی... چھک...ک! گاڑی حرکت میں آئی۔ ہیرامن نے اپنے دائیں پیر کے انگوٹھے کو بائیں پیر کی ایڑی سے کچل لیا۔ دل کی دھڑکن ہموار ہو گئی۔

ہیرابائی ہاتھ کے بینگنی رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتی ہے۔ رومال ہلا کر اشارہ کرتی ہے، ''اب جاؤ!''

گاڑی کا آخری ڈبا گذرا، پلیٹ فارم خالی...سب خالی...کھوکھلے... مال گاڑی کے ڈبے، جیسے دنیا ہی خالی ہو گئی ہو۔ ہیرامن اپنی گاڑی کے پاس لوٹ آیا۔

ہیرامن نے لال موہر سے پوچھا، ''تم کب تک لوٹ رہے ہو گاؤں؟''

لال موہر بولا، ''ابھی گاؤں جا کر کیا کریں گے؟ یہی تو کمانے کا موقع ہے۔ ہیرابائی چلی گئی۔ میلہ اب ٹوٹے گا۔''

''اچھی بات۔ کوئی سندیسہ دینا ہے گھر؟''

لال موہر نے ہیرامن کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن ہیرامن نے اپنی گاڑی گاؤں جانے والی سڑک پر طرف موڑ دی۔ ''اب میلے میں کیا دھرا ہے۔ کھوکھلا میلہ!''

ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بیل گاڑی کے لیے کچی سڑک دور تک چلی گئی ہے۔ ہیرامن کبھی ریل گاڑی پر سوار نہیں ہوا ہے۔ اس کے دل میں ایک بہت پرانی حسرت جاگی— ریل گاڑی پر سوار ہو کر گیت گاتے ہوئے جگن ناتھ دھام جانے کی حسرت۔ مڑ کر اپنے خالی پٹر کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی ہے۔ پیٹھ میں آج بھی گدگدی ہوتی ہے۔ آج بھی رہ رہ کر چمپا کا پھول اس کی گاڑی میں کھل اٹھتا ہے۔ ایک گیت کی ٹوٹی کڑی پر نقارے کا تال بار بار کٹ جاتا ہے...

اُس نے مڑ کر دیکھا، بورے بھی نہیں، بانس بھی نہیں، باگھ بھی نہیں، پری... دیوی... میتا... مہوا گھٹوارن— کوئی نہیں۔

ہیرامن کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ شاید وہ تیسری قسم کھا رہا ہے۔
کمپنی کی عورت کی سواری اب نہیں لے جائے گا!
ہیرامن نے یکبارگی اپنے دونوں بیلوں کو جھڑکی دی، چابک سے مارتے ہوئے بولا، ''ریلوے لائن کی طرف بار بار کیا دیکھتے ہو؟'' دونوں بیلوں نے قدم کھول کر چال پکڑی۔ ہیرامن گنگنانے لگا—
''اجی ہاں مارے گئے گلفام...!''

پھنیشور ناتھ رینو

ہندی سے ترجمہ: عبدالعظیم سومرو

لال پان کی بیگم

''کیوں برجو کی ماں، ناچ دیکھنے نہیں جائے گی کیا؟''

برجو کی ماں شکر قند ابال کر بیٹھی من ہی من کڑھ رہی تھی اپنے آنگن میں۔ سات سال کا برجو شکر قند کے بدلے طمانچہ کھا کر آنگن میں لوٹ لوٹ کر ساری دیہہ (جسم) میں مٹی مَل رہا تھا۔ چمپیا کے سر بھی چڑیل منڈلا رہی ہے— آنگن دھوپ رہتے جوگئی ہے سہوائن کی دکان چھوا گڑ لانے، ابھی تک نہیں لوٹی۔ دیاباتی کی بیلا ہوگئی۔ آئے آج لوٹ کے ذرا! باگڑ بکرے کے جسم میں مگر ماچھی لگی تھی، اس لیے بے چارہ باگڑ رہ رہ کر کود پھاند کر رہا تھا۔ برجو کی ماں باگڑ پر من کا غصہ اتارنے کا بہانہ ڈھونڈ کر نکال چکی تھی۔ پچھواڑے کی مرچ کی پھولی گاچھ (ڈالی)۔ باگڑ کے سوا اور کس نے کلیوا (ناشتہ) کیا ہوگا؟ باگڑ کو مارنے کے لیے وہ مٹی کا ایک چھوٹا ڈھیلا اٹھا چکی تھی کہ پڑوسن مکھنی بوا کی پکار سنائی پڑی، ''کیوں برجو کی ماں، ناچ دیکھنے نہیں جائے گی کیا؟''

''برجو کی ماں کے آگے ناتھ اور پیچھے پگھیا نہ ہو تب نا، بوا۔''☆

گرم غصے کی بجھی نکیلی بات بوا کی دیہہ میں دھنس گئی اور برجو کی ماں نے ہاتھ کے ڈھیلے کو پاس ہی پھینک دیا۔ بیچارے باگڑ کو کر ماچھی پریشان کر رہی ہے۔ آ، ہا، آئے... آئے... ہرر... آئے... آئے۔

برجو نے لیٹے ہی لیٹے باگڑ کو ایک ڈنڈا لگا دیا۔ برجو کی ماں کا دل چاہا کہ جا کر اسی ڈنڈے سے برجو کا بھوت بھگا دے، لیکن نیم کے پاس کھڑی پن بھرنیوں کی کھلکھلاہٹ سن کر رک گئی۔ بولی، ''ٹھہر، تیرے

☆ ناتھ: بیل کی ناک میں ڈالی جانے والی رسی۔ پگھیا: بیل کے پیر میں باندھی جانے والی رسی۔ (مترجم۔)

بپّا نے بڑا ہتھ چھنّا بنا دیا ہے تجھے۔ بڑا ہاتھ چلتا ہے لوگوں پر۔ ٹھہر!''

مکھنی بوا نیم کے پاس جھکی کمر سے گھڑا اتار کر پانی بھر کر لوٹتی پن بھرنیوں سے برجو کی ماں کی بہکی ہوئی بات کا انصاف کر رہی تھی۔ ''ذرا دیکھو تو اس برجو کی ماں کو! چار من پاٹ (پٹ سن) کا پیسہ کیا ہوا ہے، دھرتی پر پاؤں ہی نہیں پڑتے۔ انصاف کرو۔ خود اپنے منھ سے آٹھ دن پہلے سے ہی گاؤں کی گلی گلی میں بولتی پھری ہے: ہاں، اس بار برجو کے بپّا نے کہا ہے، بیل گاڑی پر بٹھا کر بلرام پور کا ناچ دکھا لاؤں گا۔ بیل اب اپنے گھر ہے تو ہزار گاڑی منگنی مل جائے گی۔ سو میں نے بھی ٹوک دیا۔ ناچ دیکھنے والی سب تو اون پون کر تیار ہو رہی ہیں، رسوئی پانی کر رہی ہیں۔ میرے منھ میں آگ لگے، کیوں میں ٹوکنے گئی۔ سنتی ہو کیا جواب دیا برجو کی ماں نے؟''

مکھنی بوا نے اپنے پوپلے منھ کے ہونٹوں کو ایک طرف موڑ کر اینٹھتی ہوئی آواز نکالی، ''ارے... ہاں ہاں! بر ر جو کی مے... یا کے آگے ناتھ اور... پیچھے پگھیا نہ ہو، تب ب نا آ آ۔''

جنگی کی بہو برجو کی ماں سے نہیں ڈرتی۔ وہ ذرا گلا کھول کر ہی کہتی ہے، ''بوا! سر بے سیتل منٹی (سروے سیٹلمنٹ) کے حاکم کے باسا پر پھول چھاپ کناری والی ساڑھی پہن کر اگر تو بھی بھنٹا کی بھینٹ چڑھاتی تو تمھارے نام سے بھی دو تین بیگھا گھن ہر زمین کا پرچہ کٹ جاتا۔ پھر تمھارے گھر بھی آج دس من سنہرا پاٹ ہوتا۔ جوڑا بیل خریدتی، پھر آگے ناتھ اور پیچھے سیکڑوں پگھیا جھولتی۔''

جنگی کی بہو منھ زور ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے پاس کی لڑکی ہے۔ تین ہی مہینے ہوئے گونے کی نئی بہو ہو کر آئی ہے اور ساری کرُ ماٹولی کی سبھی جھگڑالو ساسوں سے ایک آدھ مورچہ لے چکی ہے۔ اس کا سسر جنگی داغی چور ہے، سیڑ کلاسی ہے۔ اس کا خصم رنگی کرما ٹولی کا نامی لٹھیت۔ اسی لیے ہمیشہ سینگ گھماتی پھرتی ہے جنگی کی بہو۔

برجو کی ماں کے آنگن میں جنگی کی بہو کی گلا کھول کر بولی غلیل کی گولیوں کی طرح دندناتی ہوئی آئی۔ برجو کی ماں نے ایک تیکھا جواب ڈھونڈ کر نکالا، لیکن من مسوس کر رہ گئی— گوبر کے ڈھیر میں کون ڈھیلا پھینکے۔

زبان کے تھوک کو گلے میں اتار کر برجو کی ماں نے اپنی بیٹی چمپیا کو آواز دی۔ ''اری چمپیا... آج لوٹے تو تیرا سر مروڑ کر چولھے میں جھونکتی ہوں۔ دن بدن بے چال ہوتی جاتی ہے... گاؤں میں تو اب ٹھیٹھر بائیسکوپ کا گیت گانے والی پُسر یا بہو سب آنے لگی ہیں۔ کہیں بیٹھ کے باجے نہ مُرلیا سیکھ رہی ہوگی ہر جائی ... اری چمپیا۔ ا۔ ا۔''

جنگی کی بہو نے برجو کی ماں کی بولی کا سواد لے کر کمر پر گھڑے کو سنبھالا اور مٹک کر بولی، ''چل دیدیا

چل! اس محلے میں لال پان کی بیگم بستی ہے۔ نہیں جانتی، دو پہر دن اور چو پہر رات بجلی کی بتی بھک بھک کر جلتی ہے۔''

بھک بھک بجلی بتی کی بات سن کر جانے کیوں سبھی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ بوا کے ٹوٹے ہوئے دانتوں کے درمیان سے ایک میٹھی گالی نکلی، ''شیطان کی نانی۔''

برجو کی ماں کی آنکھوں پر مانو کسی نے تیز ٹارچ کی روشنی ڈال کر چوندھیا دیا— بھک بھک بجلی بتی۔ تین سال پہلے سروے کیمپ کے بعد گاؤں کی جلن کی ماری عورتوں نے ایک کہانی گڑھ کے پھیلائی تھی، چمپیا کی ماں کے آنگن میں رات بھر بجلی بتی بھکھکاتی تھی۔ چمپیا کی ماں کے آنگن میں، نعل والے جوتے کی چھاپ گھوڑے کے ٹاپ کی طرح۔ جلو... جلو... اَور جلو! چمپیا کی ماں کے آنگن میں چاندی جیسے پاٹ سوکھتے دیکھ کر جلنے والی ساری عورتیں کھلیان پر سونولی دھان کے بوجھوں کو دیکھ کر بینگن کا بھرتا ہو جائیں گی۔

مٹی کے برتن سے ٹپکتے ہوئے چھواگڑ کو انگلیوں سے چاٹتی ہوئی چمپیا آئی اور ماں کا طمانچہ کھا کر چیخ پڑی، ''مجھے کیوں مارتی ہے رے؟ سہوائن جلدی سے سودا نہیں دیتی ہے، ایں ایں ایں ایں!''

''سہوائن جلدی سے سودا نہیں دیتی کی نانی! ایک سہوائن کی دکان پر ہی موتی جھرتے ہیں جو جڑ گاڑ کر بیٹھی ہوئی تھی؟ بول؟ گلے پر لات دے کر کلا توڑ دوں گی ہر جائی، جو پھر کبھی باجے نہ مُرلیا گاتے سنا۔ چال سیکھنے جاتی ہے ٹیشن کی چھوکریوں سے۔''

برجو کی ماں نے چپ ہو کر اپنی آواز کو جانچا کہ اس کی بات جنگی کے جھونپڑے تک صاف صاف پہنچ گئی ہوگی۔

برجو بیتی ہوئی باتوں کو بھول کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور دھول جھاڑتے ہوئے، برتن سے ٹپکتے گڑ کو للچائی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔ دیدی کے ساتھ وہ بھی دکان جاتا تو دیدی اسے بھی گڑ ضرور چٹاتی۔ وہ شکر قند کے لالچ میں رہا اور مانگنے پر ماں نے شکر قند کے بدلے...

'اے میّا، ایک انگلی گڑ دے دے!'' برجو نے ہتھیلی پھیلائی۔ ''دے نا میّا، ایک رتی بھر۔''

''ایک رتی کیوں؟ اٹھا کے پھینک آتی ہوں برتن کو پچھواڑے میں، جا کے چاٹنا۔ نہیں بنے گی میٹھی روٹی۔ میٹھی روٹی کھانے کا منھ ہوتا ہے،'' برجو کی ماں نے ابلے شکر قند کا سوپ روتی ہوئی چمپیا کے سامنے رکھتے ہوئے کہا، ''بیٹھ کے چھلکے اتار، نہیں تو ابھی...''

دس سال کی چمپیا جانتی ہے، شکر قند چھیلتے ہوئے کم سے کم بارہ بار ماں اس کے بال پکڑ کر جھنجھوڑے گی، چھوٹی چھوٹی کھوٹ نکال کر گالیاں دے گی۔ ''پاؤں پھیلا کے کیوں بیٹھی ہے اس طرح، بے شرم!'' چمپیا ماں کے غصے کو جانتی ہے۔

برجو نے اس موقعے پر تھوڑی سی خوشامد کر کے دیکھا۔ ''میا، میں بھی بیٹھ کر شکر قند چھیلوں؟''

''نہیں!'' ماں نے جھڑکی دی۔ ''ایک شکر قند چھیلے گا اور تین پیٹ میں۔ جا کر سدھو کی بہو سے کہو، ایک گھنٹے کے لیے کڑاہی مانگ کر لے گئی تو پھر لوٹانے کا نام ہی نہیں۔ جا جلدی۔''

منھ لٹکا کر آنگن سے نکلتے نکلتے برجو نے شکر قند اور گڑ پر نگاہ دوڑائی۔ چمپیا نے اپنے جھبرے بالوں کی آڑ سے ماں کی طرف دیکھا اور نظر بچا کر چپکے سے برجو کی طرف ایک شکر قند پھینک دیا۔ برجو بھاگا۔

''سورج بھگوان ڈوب گئے۔ دیا بتی کی بیلا ہوگئی۔ ابھی تک گاڑی...''

چمپیا بیچ میں ہی بول اٹھی، ''کوری ٹولے میں کسی نے گاڑی نہیں دی میا۔ بپا بولے، ماں سے کہنا سب ٹھیک ٹھاک کر کے تیار رہے۔ ملد ہیا ٹولے کے میاں جان کی گاڑی لینے جا رہا ہوں۔''

سنتے ہی برجو کی ماں کا چہرہ اتر گیا۔ لگا چھاتے کی کمانی اتر گئی گھوڑے سے اچانک۔ کوری ٹولے میں کسی نے گاڑی منگنی نہیں دی۔ تب مل چکی گاڑی! جب اپنے گاؤں کے لوگوں کی آنکھ میں پانی نہیں تو ملد ہیا ٹولے کے میاں جان کی گاڑی کا کیا بھروسا— نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ کیا ہوگا شکر قند چھیل کر؟ رکھ دے اٹھا کے... یہ مرد ناچ دکھائے گا۔ بیل گاڑی پر چڑھ کر ناچ دکھانے لے جائے گا۔ چڑھ چکی بیل گاڑی پر! دیکھ چکی جی بھر کے ناچ!... پیدل جانے والی سب پہنچ کر پرانی ہو چکی ہوں گی۔''

برجو چھوٹی کڑھائی سر پر اوندھا کر واپس آیا۔ ''دیکھ دِیدیا، ملٹری ٹوپی! اس پر دس لاٹھی مارنے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔''

چمپیا چپ چاپ بیٹھی رہی، کچھ بولی نہیں۔ ذرا سی مسکرائی بھی نہیں۔ برجو نے سمجھ لیا، میا کا غصہ ابھی اترا نہیں ہے پوری طرح۔

مڑھیا (جھونپڑی) کے اندر سے باگڑ کو باہر بھگاتی ہوئی برجو کی ماں بڑبڑائی، ''کل ہی پنچ کوڑی قصائی کے حوالے کرتی ہوں راکشس تجھے! ہر چیز میں منھ لگائے گا! چمپیا باندھ دے بگڑا کو۔ کھول دے گلے کی گھنٹی۔ ہمیشہ ٹونر ٹونر! مجھے ذرا نہیں سُہاتا ہے۔''

ٹونر ٹونر سنتے ہی برجو کو سڑک سے جاتی ہوئی بیل گاڑیوں کی یاد آئی۔ ''ابھی بوان ٹولے کی گاڑیاں ناچ دیکھنے جا رہی تھیں— جھنر جھنر بیلوں کی جھنکی، تم نے س...''

''بیسی بک بک مت کرو!'' باگڑ کے گلے سے جھنکی کھولتی چمپیا بولی۔

''چمپیا ڈال دے چولھے میں پانی! بپا آویں تو کہنا کہ اپنے اُڑن جہاز پر چڑھ کر ناچ دیکھ آئیں۔ مجھے ناچ دیکھنے کا سوکھ نہیں!... مجھے جگائیو مت کوئی، میرا ماتھا دُکھ رہا ہے۔''

مڑھیا کے اوسارے پر برجو نے پھسپھسا کر پوچھا، ''کیوں دیدیا، ناچ میں اڑن جہاز بھی اڑے گا؟''

چٹائی پر کتھری اوڑھ کر بیٹھتی ہوئی چمپیا نے برجو کو چپ چاپ اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مفت میں مار کھائے گا بے چارہ!

برجو نے بہن کی کتھری میں حصہ بانٹتے ہوئے چکی کی لگائی۔ جاڑے میں اس طرح گھٹنے پر ٹھڈی رکھ کر بیٹھنا سیکھ چکا ہے وہ۔ اس نے چمپیا کے کان کے پاس منھ لے جا کے کہا، ''ہم لوگ ناچ دیکھنے نہیں جائیں گے؟... گاؤں میں ایک پنچھی بھی نہیں ہے۔ سب چلے گئے۔''

چمپیا کو اب تل بھر بھی بھروسا نہیں۔ شام کا تارا ڈوب رہا ہے۔ بپا ابھی تک گاڑی لے کر نہیں لوٹے۔ ایک مہینہ پہلے سے ہی میا کہتی تھی، ''بلرام پور کے ناچ کے دن میٹھی روٹی بنے گی، چمپیا چھینٹ کی ساڑھی پہنے گی، برجو پینٹ پہنے گا۔ بیل گاڑی پر چڑھ کر...''

چمپیا کی بھیگی پلکوں پر ایک بوند آنسو آ گیا۔

برجو کا بھی دل بھر آیا۔ اس نے دل ہی دل میں املی پر رہنے والے جن بابا کو ایک بینگن کی منت مانی، پودے کا سب سے پہلا بینگن، اس نے جس پودے کو بویا ہے۔ ''جلدی سے گاڑی لے کر بپا کو بھیج دو، جن بابا۔''

مڑیا کے اندر برجو کی ماں چٹائی پر پڑی کروٹیں لے رہی تھی۔ ''اونہوں، پہلے سے کسی بات کا منصوبہ نہیں باندھنا چاہیے کسی کو۔ بھگوان نے منصوبہ توڑ دیا۔ اس کو سب سے پہلے بھگوان سے پوچھنا ہے، یہ کس چُوک کا پھل دے رہے ہو بھولا بابا؟ اپنے جانتے اس نے کسی دیوتا پتر کی مان منوتی باقی نہیں رکھی۔ سروے کے وقت زمین کے لیے جتنی منتیں کی تھیں... ٹھیک ہی تو! مہاویر جی کا روٹ تو باقی ہی ہے۔ ہائے رے دیو! بھول چوک معاف کرو مہاویر بابا! منوتی دونی کر کے چڑھائے گی برجو کی ماں۔''

برجو کی ماں کے من میں رہ رہ کر جنگی کی بہو کی باتیں چبھتی ہیں، بھک بھک بجلی بتی! چوری چماری کرنے والے کی بیٹی بہو جلے گی نہیں۔ پانچ بیگھے زمین کیا حاصل کی ہے برجو کے بپا نے، گاؤں کے لوگوں کی آنکھوں میں کرکری پڑ گئی ہے۔ کھیت میں کپاس لگا دیکھ کر گاؤں کے لوگوں کی چھاتی پھٹنے لگی۔ دھرتی پھوڑ کر پاٹ لگا ہے۔ بیساکھی بادلوں کی طرح اُمڑتے آ رہے ہیں پاٹ کے پودے۔ تو اُلان تو فلان! اتنی آنکھوں کی دھار تو بھلا فصل سہے! جہاں پندرہ من پاٹ ہونا چاہیے صرف دس من پاٹ کانٹے پر تول کے اوجن ہوا ربی بھگت کے یہاں...

اس میں جلنے کی کیا بات ہے بھلا!... برجو کے بپا نے تو پہلے ہی کرما ٹولی کے ایک ایک آدمی کو سمجھا کے کہا تھا، زندگی بھر مزدوری کرتے رہ جاؤ گے۔ سروے کا وقت آ رہا ہے، لاٹھی کڑی کرو تو دو چار بیگھے زمین حاصل کر سکتے ہو۔ سو گاؤں میں کوئی مائی کا لال سروے کے وقت بابو صاحب کے خلاف کھانسا بھی

نہیں۔ برجو کے بپا کو کم سہنا پڑا ہے! بابو صاحب غصے میں سرکس ناچ کے باگھ کی طرح ہمڑتے رہ گئے۔ ان کا بڑا بیٹا گھر میں آگ لگانے کی دھمکی دے کر گیا۔ آخر بابو صاحب نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے کو بھیجا۔ برجو کی ماں کو موسی کہہ کر پکارا۔ ''یہ زمین بابو جی نے میرے نام سے خریدی تھی۔ میری پڑھائی لکھائی اسی زمین کی پیداوار سے چلتی ہے...'' اور بھی کتنی باتیں۔ خوب موہنا جانتا ہے اتا ذرا سا لڑکا۔ زمیندار کا بیٹا ہے کہ...

''چمپیا! برجو سو گیا کیا؟ یہاں آجا برجو، اندر۔ تو بھی آجا، چمپیا... بھلا آدمی آوے تو ایک بار آج!''

برجو کے ساتھ چمپیا اندر چلی گئی۔

''ڈبھری بجھادے... بپا بلائیں تو جواب مت دینا۔ کچھی گرادے۔''

بھلا آدمی رے، بھلا آدمی! منھ دیکھو ذرا اس مرد کا— برجو کی ماں دن رات منجھانہ دیتی رہتی تو لے چکے تھے زمین۔ روز آکر ماتھا پکڑ کر بیٹھ جائیں۔ مجھے زمین نہیں لینی ہے، برجو کی ماں! مجوری ہی اچھی... جواب دیتی تھی برجو کی ماں خوب سوچ سمجھ کے۔ چھوڑ دو! جب تمھارا کلیجہ ہی نہیں ٹھکتا تو کیا ہوگا۔ جو رو زمین زور کے، نہیں تو کسی اور کے!...

برجو کے باپ پر بہت تیزی سے غصہ چڑھتا ہے، بڑھتا ہی جاتا ہے۔ برجو کی ماں کا بھاگ ہی خراب ہے جو ایسا گوبر گنیش گھر والا اسے ملا۔ کون سا سکھ موج دیا ہے اس کے مرد نے؟ کولھو کے بیل کی طرح کھٹ کر ساری عمر کاٹ دی اس کے یہاں۔ کبھی ایک پیسے کی جلیبی لاکر دی ہے اس کے خصم نے؟ پاٹ کا دام بھگت کے یہاں لے کر باہر ہی باہر بیل ہاٹ چلے گئے۔ برجو کی ماں کو ایک بار نگوڑا نوٹ دیکھنے بھی نہیں دیا آنکھ سے۔ بیل خرید لائے۔ اسی دن سے گاؤں میں ڈھنڈورا پیٹنے لگے، ''برجو کی ماں اس بار بیل گاڑی پر چڑھ کر ناچ دیکھنے جائے گی...'' دوسرے کی گاڑی کے بھروسے ناچ دکھائے گا!

آخر اسے اپنے آپ پر غصہ ہو آیا۔ وہ خود بھی کچھ کم نہیں۔ اس کی زبان میں آگ لگے۔ بیل گاڑی پر ناچ دیکھنے کی خواہش کس برے وقت میں اس کے منھ سے نکلی تھی، بھگوان جانیں۔ پھر آج صبح سے دوپہر تک کسی نہ کسی بہانے اس نے اٹھارہ بار بیل گاڑی پر ناچ دیکھنے کی چرچا چھیڑی ہے... لو، خوب دیکھو ناچ! واہ رے ناچ! کتھری کے نیچے دوشالے کا سپنا! کل بھورے پانی بھرنے کے لیے جب جائے گی، پتلی جیبھ والی پتر یا سب ہنستی آئیں گی، ہنستی جائیں گی۔ سبھی جلتے ہیں اس سے، ہاں، بھگوان داڑھی جار بھی۔ دو بچوں کی ناں ہوکر بھی وہ جس کی تس ہے۔ اس کا گھر والا اس کی بات میں رہتا ہے۔ وہ بالوں میں گری کا تیل ڈالتی ہے۔ اس کی اپنی زمین ہے۔ ہے کسی کے پاس ایک ڈھور زمین بھی اپنی اس گاؤں میں؟ جلیں گے نہیں؟ تین بیگھے میں دھان لگا ہوا ہے، اگہنی لوگوں کی بری نظر سے بچے تب تو۔

باہر بیلوں کی گھنٹیاں سنائی پڑیں۔ تینوں ہوشیار ہو گئے۔ چوکنے ہو کر سنتے رہے۔

''اپنے ہی بیلوں کی گھنٹی ہے... کیوں ری چمپیا؟''

چمپیا اور برجو نے تقریباً ایک ہی ساتھ کہا، ''ہوں ں!''

''چپ!'' برجو کی ماں نے پھسپھسا کر کہا، ''شاید گاڑی بھی ہے، گھڑگھڑاتی ہے نا؟''

''ہوں ں!'' دونوں نے پھر ہونکار بھری۔

''چپ! گاڑی نہیں ہے۔ تو چپکے سے ٹٹی میں چھید کر کے دیکھ تو آ چمپی! بھاگ کے آ، چپکے چپکے۔''

چمپیا بلی کی طرح ہولے ہولے پاؤں سے ٹٹی کے چھید سے جھانک آئی، ''ہاں میّا، گاڑی بھی ہے!''

برجو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی ماں نے اسے ہاتھ پکڑ کر سلا دیا، ''بولو مت!''

چمپیا بھی گدڑی کے نیچے گھس گئی۔

باہر بیل گاڑی کھلنے کی آواز ہوئی۔ برجو کے باپ نے بیلوں کو زور سے ڈانٹا، ''ہاں ہاں، آ گئے گھر! گھر آنے کے لیے چھاتی پھٹی جاتی تھی۔''

برجو کی ماں تاڑ گئی، ضرور ملد بیا ٹولے میں گانجے کی چلم چڑھ رہی تھی، آواز تو بڑی کھنکھناتی ہوئی نکل رہی ہے۔

''چمپیا!'' باہر سے پکار کر اس کے باپ نے کہا، ''بیلوں کو گھاس دے دے، چمپیا۔''

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ چمپیا کے باپ نے آنگن میں آ کر دیکھا تو نہ روشنی نہ چراغ، نہ چولھے میں آگ۔ بات کیا ہے؟ ناچ دیکھنے، اتاولی ہو کر پیدل ہی چلی گئی کیا؟

برجو کے گلے میں کھسکھساہٹ ہوئی اور اس نے روکنے کی پوری کوشش بھی کی، لیکن کھانسی جب شروع ہوئی تو پورے پانچ منٹ تک وہ کھانستا رہا۔

''برجو! بیٹا برج موہن!'' برجو کے باپ نے پچکار کر بلایا، ''میّا غصے کے مارے سو گئی کیا؟... ارے ابھی تو لوگ جا ہی رہے ہیں۔''

برجو کی ماں کے من میں آیا کہ کس کر جواب دے، ''نہیں دیکھنا ہے ناچ... لوٹا دو گاڑی۔''

''چمپیا! اٹھتی کیوں نہیں؟ لے، دھان کی پنچ سیس رکھ دے،'' دھان کی بالیوں کا چھوٹا جھبا جھونپڑی کے اوسارے پر رکھ کر اس نے کہا، ''دیا بالو!''

برجو کی ماں اٹھ کر اوسارے پر آئی۔ ''ڈیڑھ پہر رات کو گاڑی لانے کی کیا ضرورت تھی؟ ناچ تو اب ختم ہو رہا ہوگا۔''

ڈھبری کی روشنی میں دھان کی بالیوں کا رنگ دیکھتے ہی برجو کی ماں کے من کا سارا میل دور ہوگیا۔ دھانی رنگ اس کی آنکھوں سے اتر کر رویں رویں میں گھل گیا۔

''ناچ ابھی شروع بھی نہیں ہوا ہوگا۔ ابھی ابھی بلرام پور کے بابو کی کمپنی گاڑی موہن پور ہوٹل بنگلا سے حاکم صاحب کو لانے گئی ہے۔ اس سال آخری ناچ ہے۔ پنچ سیس ٹٹی میں کھونس دے، اپنے کھیت کا ہے۔''

''اپنے کھیت کا؟'' ہلستی ہوئی برجو کی ماں نے پوچھا، ''پک گئے دھان؟''

''نہیں، دس دن میں اگہن چڑھتے چڑھتے لال ہوکر جھک جائیں گی سارے کھیت کی بالیاں۔ ملد ہیا ٹولی جارہا تھا، اپنے کھیت میں دھان دیکھ کر آنکھیں جڑا گئیں۔ سچ کہتا ہوں، پنچ سیس توڑتے وقت انگلیاں کانپ رہی تھیں میری۔''

برجو نے دھان کی ایک بالی سے ایک دھان لے کر منھ میں ڈال لیا اور اس کی ماں نے ایک ہلکی سی ڈانٹ دی، ''کیسا لکڑ ہے تُو رے! ان دشمنوں کے مارے کوئی نیم دھرم جو بچے۔''

''کیا ہوا، ڈانٹتی کیوں ہے؟''

''نوان کے پہلے ہی نیا دھان جوٹھا کر دیا، دیکھتے نہیں؟''

''ارے، ان لوگوں کا سب کچھ معاف ہے۔ چرئی چن من ہیں یہ لوگ۔ بس ہم دونوں کے منھ میں نوان کے پہلے نیا ان نہ پڑے۔''

اس کے بعد چمپیا نے بھی دھان کی بالی سے دو دھان لے کر دانتوں تلے دبایا۔

''اومیا! اتنا میٹھا چاول!''

''اور گمکتا بھی ہے نہ دیدیا؟'' برجو نے پھر منھ میں دھان لیا۔

''روٹی پوٹی تیار کر چکی کیا؟'' برجو کے باپ نے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں!'' مان بھرے لہجے میں برجو کی ماں بولی، ''جانے کا ٹھیک ٹھکانا نہیں... اور روٹی بنتی ہے۔''

''واہ! خوب ہو تم لوگ... جس کے پاس بیل ہے اسے گاڑی منگنی نہیں ملے گی بھلا؟ گاڑی والوں کو بھی کبھی بیل کی ضرورت ہوگی... پوچھوں گا تب کوئری ٹولی والوں سے... لے جلدی سے روٹی بنالے۔''

''دیر نہیں ہوگی؟''

''ارے ٹوکری بھر روٹی تو تُو پلک مارتے بنالیتی ہے، پانچ روٹیاں بننے میں کتنی دیر لگے گی!''

اب برجو کی ماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل کر کھیلنے لگی۔ اس نے نظر بچا کر دیکھا، برجو کا بپا اس کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا ہے۔ چمپیا اور برجو نہ ہوتے تو من کی بات ہنس کر کھولتے دیر نہ لگتی۔ چمپیا اور برجو

نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خوشی سے ان کے چہرے جگمگا اٹھے۔ میا بیکار غصہ ہو رہی تھی نا!

''چمپی! ذرا گھیل سار میں کھڑی ہو کر مکھنی بوا کو آواز دے تو۔''

''اے بوا!... سنتی ہو بوا!... میا بلا رہی ہے۔''

بوا نے کوئی جواب سیدھے نہیں دیا لیکن اس کی بڑبڑاہٹ صاف سنائی پڑی۔ ''ہاں، اب بوا کو کیوں پکارتی ہے؟ سارے ٹولے میں بس ایک بوا ہی تو بنا ناتھ پگھیا والی ہے۔''

''اری بوا!'' برجو کی ماں نے ہنس کر جواب دیا۔ ''اس وقت برا مان گئی تھی کیا؟ ناتھ پگھیا والے کو آ کر دیکھو، دوپہر رات میں گاڑی لے کر آیا ہے۔ آجاؤ بوا، میں میٹھی روٹی پکانا نہیں جانتی۔''

بوا کا نکھتی کھانستی آئی۔ ''اسی سے گھڑی پہر دن رہتے ہی پوچھ رہی تھی کہ ناچ دیکھنے جائے گی کیا؟ کہتی تو میں پہلے سے ہی اپنی انگیٹھی یہاں سلگا جاتی۔''

برجو کی ماں نے بوا کو انگیٹھی دکھلا دی اور کہا، ''گھر میں اناج دانہ وغیرہ تو کچھ ہے نہیں۔ ایک باگڑ ہے اور کچھ برتن باسن۔ سورات بھر کے لیے یہاں تمبا کو رکھ جاتی ہوں۔ اپنا حقہ تو لے آئی ہو نا بوا؟''

بوا کو تمبا کو مل جائے تو رات بھر کیا، پانچ رات بیٹھ کر جاگ سکتی ہے۔ بوا نے اندھیرے میں ٹٹول کر تمبا کو کا اندازہ کیا۔ ''اوہو! ہاتھ کھول کر تمبا کو رکھا ہے برجو کی ماں نے۔ اور ایک وہ ہے سہوائن، رام کہو! اس رات کو افیم کی گولی کی طرح ایک مٹر بھر تمبا کو رکھ کر چلی گئی گلاب باغ میلے، اور کہہ گئی کہ ڈبی بھر تمبا کو ہے۔''

برجو کی ماں چولھا سلگانے لگی۔ چمپیا نے شکر قند کو مسل کر گولے بنائے اور برجو سر پر کڑھائی اوندھا کرا اپنے آپ کو دکھلانے لگا۔ ''ملٹری ٹوپی! اس پر دس لاٹھی مارنے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔''

سبھی ٹھٹھا مار کر ہنس پڑے۔ برجو کی ماں ہنس کر بولی، ''تاکھے پر تین چار موٹے شکر قند ہیں۔ دے دو برجو کو، چمپیا۔ بے چارہ شام سے ہی...''

''بے چارہ مت کہو میا، خوب سچارہ ہے!'' اب چمپیا چہکنے لگی۔ ''تم کیا جانو، کتھری کے نیچے منھ کیوں چل رہا تھا بابو صاحب کا۔''

''ہی ہی ہی!''

برجو کے ٹوٹے دودھ کے دانتوں کے درمیان سے آواز نکلی، ''بلیک مارٹن میں پانچ شکر قند کھالیا۔ ہاہاہا!''

سبھی پھر ٹھٹھا مار کر ہنس پڑے۔ برجو کی ماں نے بوا کا من رکھنے کے لیے پوچھا، ''ایک کنواں گڑ ہے۔ آدھا ڈال دوں بوا؟''

بوا نے گدگد ہو کر کہا، ''اری شکر قند تو خود میٹھا ہوتا ہے، اتنا کیوں ڈالے گی؟''

جب تک دونوں بیل دانہ گھاس کھا کر ایک دوسرے کی دیہہ کو جیبھ سے چاٹیں، برجو کی ماں تیار ہوگئی۔ چمپیا نے چھینٹ کی ساڑھی پہنی اور برجو بٹن نہ ہونے کی وجہ سے پینٹ پر پٹ سن کی ڈوری باندھنے لگا۔

برجو کی ماں نے آنگن سے نکل گاؤں کی طرف کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ ''اونہہ! اتنی دیر تک بھلا پیدل جانے والے رکے رہیں گے؟''

پورنیما کا چاند سر پر آ گیا ہے۔ برجو کی ماں نے اصلی رُوپا کا منگ ٹیکا پہنا ہے آج، پہلی بار۔ برجو کے بپا کو ہو کیا گیا ہے، گاڑی جوتتا کیوں نہیں؟ منھ کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا ہے، مانو ناچ کی لال پان کی...

گاڑی پر بیٹھتے ہی برجو کی ماں کی دیہہ میں ایک عجیب گدگدی سی لگنے لگی۔ اس نے بانس کی بلّی کو پکڑ کر کہا، ''گاڑی پر ابھی بہت جگہ ہے... ذرا داہنی سڑک سے ہانکنا۔''

بیل جب دوڑنے لگے اور پہیہ جب چوں چوں کر کے گھر گھرانے لگا تو برجو سے نہیں رہا گیا۔ ''اڑن جہاز کی طرح اڑاؤ بپا!''

گاڑی جنگی کے پچھواڑے پہنچی۔ برجو کی ماں نے کہا، ''ذرا جنگی سے پوچھو نا، اس کی بہو ناچ دیکھنے چلی گئی کیا؟''

گاڑی رکتے ہی جنگی کے جھونپڑے سے آتی ہوئی رونے کی آواز واضح ہوگئی۔ برجو کے بپا نے پوچھا، ''ارے جنگی بھائی، کا ہے؟ کون رو رہا ہے آنگن میں؟''

جنگی گھورتا پ رہا تھا۔ بولا، ''کیا پوچھتے ہو! رنگی بلرام پور سے لوٹا نہیں، بہو ناچ دیکھنے کیسے جائے؟ آسرا دیکھتے دیکھتے ادھر گاؤں کی ساری عورتیں چلی گئیں۔''

''اری ٹیشن والی، تو روتی ہے کا ہے!'' برجو کی ماں نے پکار کر کہا، ''آ، آ، جھٹ سے کپڑا پہن کر۔ ساری گاڑی پڑی ہوئی ہے۔ بے چاری!... آجا جلدی!''

بغل کے جھونپڑے سے رادھے کی بیٹی سُنری نے کہا، ''کا کی! گاڑی میں جگہ ہے؟ میں بھی جاؤں گی۔''

''آجا، جو باقی رہ گئی ہیں سب آجائیں جلدی۔''

جنگی کی بہو، لرینا کی بیوی اور رادھے کی بیٹی سنری، تینوں گاڑی کے پاس آئیں۔ بیل نے پچھلا پیر پھینکا۔ برجو کے باپ نے ایک بھدی گالی دی، ''سالا! لتاڑ مار کر لنگڑا ہی بنائے گا پتوہو (بہو) کو۔''

سبھی ٹھٹھا مار کر ہنس پڑے۔ برجو کے باپ نے گھونگھٹ میں چھپی دونوں بہوؤں کو دیکھا۔ اسے اپنے کھیت کی جھکی ہوئی بالیوں کی یاد آ گئی۔

جنگی کی بہو کا گونا تین ماہ پہلے ہی ہوا ہے۔ گونے کی رنگین ساڑھی میں کڑوے تیل اور لٹھوا سیندور

کی مہک آرہی ہے۔ برجو کی ماں کو اپنے گونے کی یاد آئی۔ اس نے کپڑے کی گٹھری سے تین میٹھی روٹیاں نکال کر کہا، ''کھالے ایک ایک کر کے۔ سمراہا کے سرکاری کوپ میں پانی پی لینا۔''

گاڑی گاؤں سے باہر ہوکر دھان کے کھیتوں کے بغل سے جانے لگی۔ چاندنی، کاتک کی! کھیتوں میں دھان کے جھرتے پھولوں کی خوشبو آتی ہے۔ بانس کی جھاڑی میں کہیں دُودھی کی لتا (بیل) پھولی ہے۔ جنگی کی بہو نے ایک بیڑی سلگا کر برجو کی ماں کی طرف بڑھائی۔ برجو کی ماں کو اچانک یاد آیا، چمپیا، سنری، لرینا کی بیوی اور جنگی کی بہو، یہ چاروں ہی تو گاؤں میں بائیسکوپ کا گیت گانا جانتی ہیں.. خوب..

گاڑی کی لکیر دھان کھیتوں کے درمیان سے ہوکر گئی ہے۔ چاروں طرف گونے کی ساڑھی کی کھسکھساہٹ جیسی آواز ہوتی ہے۔ برجو کی ماں کے ماتھے کے منگ ٹیکے پر چاندنی چھٹکتی ہے۔

''اچھا، اب ایک بائیسکوپ کا گیت گا تو چمپیا۔ ڈرتی ہے کا ہے؟ جہاں بھول جائے گی بغل میں تو ماسٹرنی بیٹھی ہی ہے۔''

دونوں بہوؤں نے تو نہیں، لیکن چمپیا اور سنری نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

برجو کے باپ نے بیلوں کو للکارا، ''چل بھیا! اور زور سے!... گارے چمپیا، نہیں تو میں بیلوں کو دھیرے دھیرے چلنے کو کہوں گا۔''

جنگی کی بہو نے چمپیا کے کان کے پاس گھونگھٹ لے جا کر کہا اور چمپیا نے دھیرے سے شروع کیا، ''چندا کی چاندنی...''

برجو کو گود میں لے کر بیٹھی اس کی ماں کا دل چاہا کہ وہ بھی ساتھ ساتھ گیت گائے۔ برجو کی ماں نے جنگی کی بہو کی طرف دیکھا، دھیرے دھیرے گنگنا رہی ہے وہ بھی۔ کتنی پیاری بہو ہے۔ گونے کی ساڑھی سے ایک خاص قسم کی مہک نکلتی ہے۔ ٹھیک ہی تو کہا ہے اس نے۔ برجو کی ماں بیگم ہے، لال پان کی بیگم! یہ تو کوئی بری بات نہیں۔ ہاں، وہ سچ مچ لال پان کی بیگم ہے۔

برجو کی ماں نے اپنی ناک پر دونوں آنکھوں کو مرکوز کرنے کی کوشش کر کے اپنے روپ کی جھانکی لی— سرخ ساڑھی کی جھلمل کناری، منگ ٹیکے پر چاند۔ برجو کی ماں کے من میں اب اور کوئی لالچ نہیں۔ اسے نیند آرہی ہے۔

ہردیش

ہندی سے ترجمہ: رفیق احمد نقش

توتے

یہ کہنا مشکل تھا کہ پہلے لالہ اشرفی لال جاگتے تھے یا توتا، اور کس کے جاگنے سے اس گھر میں صبح ہوتی تھی، یعنی صبح ہونے کا احساس۔ کبھی اشرفی لال کی نیند توتے کی آواز سے ٹوٹتی تھی اور کبھی توتے کی اپنی، نرم پنکھوں میں چھپی ہوئی، گردن کھاٹ چھوڑ کر برآمدے میں آ گئے اشرفی لال کے قدموں سے اٹھتی تھی۔ توتا پنجرے کے دو تین چکر کاٹ کر آواز کرتا تھا، ''ٹائیں... ٹائیں... ٹوں... پڑھو پٹے سیتا رام... سیتا رام۔'' آواز میں پھر ایک لے گھل جاتی تھی، ''ٹائیں... ٹائیں... ٹوں... پڑھو پٹے سیتا رام... سیتا رام۔'' اور تب اشرفی لال خود اپنا کنٹھ کھولتے تھے، ''پڑھو پٹے سیتا رام... سیتا رام۔'' اور کبھی اشرفی لال کی آنکھ کا کھلنا اور توتے کی آواز کا پھوٹنا ایک ساتھ ہی ہوتا تھا۔ فرق رہتا بھی تھا تو ہلکا سا، اتنا باریک کہ پہچانا نہ جا سکے۔

اور آج بھی اشرفی لال اور توتا ساتھ ساتھ جاگے تھے۔ اشرفی لال کی نیند ہٹی آنکھیں کھلی کھڑکی سے باہر اجالے کے سوتے میں گھلتے اندھیرے کا جائزہ لے رہی تھیں اور توتا آواز کر رہا تھا، ''ٹائیں... ٹائیں... ٹوں... پڑھو پٹے سیتا رام... سیتا رام۔ ٹائیں... ٹائیں... ٹوں... پڑھو پٹے سیتا رام... سیتا رام۔'' اشرفی لال نے برآمدے میں آ کر توتے کو ایک منٹ سنگت دی اور پھر ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے چلے گئے۔ اشنان کرنے سے پہلے انھوں نے پنجرے کی صفائی کر ڈالی اور توتے کو بھی اشنان کرانے کے خیال سے اس کے اوپر لوٹے سے تھوڑا سا پانی ڈال دیا۔

پوجا کرنے کے بعد جب وہ آئے، انھوں نے خربوزے کی پھانک کاٹ کر پنجرے کے اندر ڈال دی، جسے توتا کتر کتر کر کھانے لگا۔ وہ خود دودھ پینے لگے، جو اُن کی بیوہ بہن گرم کر کے لے آئی تھی۔

اس گھر میں وہ اور بیوہ بہن، بس یہ دو ہی جنے تھے۔ اور ان جیسا ہی جو تیسرا جاندار تھا، وہ تھا توتا۔

وہاں دولڑکیاں بھی تھیں، ان کی بیوی بھی۔لڑکیوں کی شادی ہوگئی تھی اور بیوی کی موت۔نہیں... تین سال پہلے وہاں ایک عورت اور آئی تھی۔تب یہ توتا نہیں تھا۔توتا انھوں نے بعد میں پالا تھا۔اس عورت کے آجانے سے گھر کی بھائیں بھائیں بھاگ گئی تھی۔وہ گھر پھر گھر لگنے لگا تھا۔

انھوں نے کہا نہیں تھا۔ویسا کوئی اشارہ بھی نہیں کیا تھا۔بات اٹھائے جانے پر بلکہ گردن ہلا دیتے تھے، ''نہیں، یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔'' لیکن بیوہ بہن سمجھ گئی تھی کہ ان کو ایک دوسری عورت کی ضرورت ہے۔ وہ بنا پانی کے پودے جیسے مرجھائے مرجھائے رہتے ہیں۔روے کی کھیر اور گوند کے لڈو، جو انھیں بہت پسند تھے، اب چاؤ سے کھاتے نہیں ہیں۔ان کے پان سے رنگے سدا بہار ہونٹ سوکھے رہتے ہیں۔کرتا وہ ملاؤلا پہنے ہی دکان چلے جاتے ہیں۔رات میں ان کو پوری نیند نہیں آتی ہے۔آکاش میں تارے بنے ہوتے ہیں اور وہ اٹھ جاتے ہیں۔بہن نے جب ایک لڑکی کو بلا کر ان کے سامنے کھڑا کر دیا تو لڑکی کی صورت میں انھوں نے ایک ایسی مونی کشش پائی کہ وہ دوسری شادی کے لیے انکار نہ کر سکے۔انھوں نے پہلے اسی کے لیے انکار کیا تھا، اس بات کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی بھول گئے کہ ان کی عمر پچاس کے اوپر ہے، ان کے سر اور مونچھ کے آدھے بال سفید ہوگئے ہیں، وہ دو بال بچے دار لڑکیوں کے رشتے سے نانا بن چکے ہیں اور ان کی جگ ہنسائی ہوگی۔

بہن کے ہونٹ پر داہنی طرف ایک مسا تھا، جس میں بڑے بالوں کا ایک گچھا اگا رہتا تھا۔بہن کبھی کبھی بہت سمجھ دار دکھنے لگتی تھی۔وہ چہرے پر ہنسی پھیلاتے ہوے اس سے بولے تھے، ''لگتا ہے تم اس گھر میں بھوجائی بنا رہ نہیں سکتی ہو!''

پنڈت جی نے پترے میں جو ساعت نکالی، اس سے ایک پندرھواڑے کے اندر ہی وہ لڑکی بیوی بن کر اس گھر میں آ گئی۔

اشرفی لال نے اپنا نام صحیح ثابت کرنے کے لیے اسے اشرفیوں کا ہار بھینٹ کیا — سنہرا، جگمگ کرتا ہوا۔

انھوں نے اسے دلکش رنگوں کی بیل بوٹے دار کئی ساڑھیاں دیں۔

وہ دکان سے لوٹتے ہوے روز رات کو اس کے لیے مٹھائی لے آتے۔

وہ اس سے کہتے، ''تم مجھے ایک بیٹا دو۔''

بیوی کھلکھلا کر ہنستی، جھمک جھمک کر چلتی۔اس کے سر سے پلّو بار بار گر جاتا۔وہ کلائی کی چوڑیاں گھما گھما کر کھنکھناتی۔وہ دانتوں کے بیچ ہاتھ کی کوئی انگلی دبا لیتی اور چوسنے لگتی۔وہ پیر کے انگوٹھے سے فرش کھرچتی۔ان کے دکان کو چلنے کے وقت وہ ٹھنکتی ہوئی راستہ روک لیتی، ''ایک روپیہ دیے جاؤ، آج چاٹ کھاؤں گی۔'' یا کہتی، ''میری قسم، املی ملے تو لیے آنا۔کیتھا دکھے تو کیتھا بھی ضرور۔مجھے نمک کے ساتھ یہ

چیزیں بہت اچھی لگتی ہیں۔''

بیوی سے زیادہ وہ ایک لڑکی ہے، انھیں لگتا تھا۔ وہ اس کے الھڑ پن سے کبھی کبھی ڈر بھی جاتے تھ وہ اپنی عمر کم کرنے کی کوشش کرتے۔ بالوں میں انھوں نے خضاب لگانا شروع کر دیا تھا۔ مونچھوں کو وہ تراشنے لگے تھے۔ وہ صبح دودھ کے ساتھ وید جی کے بتائے ہوئے نسخے کا استعمال کرنے لگے تھے۔ لیکن وہ پاتے کہ ان کے اور بیوی کی عمر کے درمیان جو تیس بتیس سال کا ایک لمبا فاصلہ ہے، وہ اسے اکیلے پاٹ نہیں سکتے ہیں۔ وہ اگر اپنی عمر گھٹا رہے ہیں تو بیوی اپنی بڑھائے، تبھی یہ ممکن ہے۔

مگر بیوی نے جیسے عمر کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ ایک الھڑ لڑکی ہی بنی رہنا چاہتی تھی۔ وہ آنکھوں میں موٹا کاجل لگاتی، پیروں کی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر چکنی کرتی اور آنگن میں کھڑی کھڑی چوٹی گوندھتی۔

جب ان کی بیوہ بہن، ان کے دکان سے لوٹنے پر، اپنے بالوں بھرے مسّے والے ہونٹ پر بل لاکر شکایت کرنے لگی کہ سُمن بھابھی کھڑکی دروازے پر دیر تک کھڑی رہتی ہیں، کہ آج سمن بھابھی نے ڈاکیے سے باتیں کیں، کہ آج انھوں نے چاقو قینچی پر دھار رکھنے والے ایک کنجڑ کو پانی پلایا، کہ آج انھوں نے مداری سے ریچھ کا چبوترے پر ناچ کرایا، کہ آج وہ ماسٹر صاحب کی لُگائی کے گھر آدھ گھنٹے کے لیے کہہ کر گئیں لیکن پورے دو گھنٹے بعد لوٹیں، تو ان کا ڈر بڑھنے لگتا۔

انھوں نے بیوی کو جھڑکا کہ اس کا غیروں سے باتیں کرنا ٹھیک نہیں ہے، نہ وہ گھر کے باہر ہی جایا کرے۔

''تو کیا میں گھر کے اندر سڑا کروں؟'' بیوی چہرے پر غصہ لاتے لاتے ہنس پڑی تھی۔

ہولی آگئی تھی۔ بیوی دروازے پر پچھا گن کی رُت جیسی کھڑی تھی۔ گلی کے کالج میں پڑھنے والے شیام اور ترون، دو چلبلے لڑکوں نے اس پر رنگ ڈال دیا۔ وہ پھر آنگن میں گھس کر اس کے چہرے پر بھی رنگ مَل گئے۔

پتا لگنے پر انھوں نے آنکھیں بگاڑی تھیں۔ ''مجھے ایسی ہُڑ دنگ پسند نہیں۔''

پلٹ کر جب بیوی نے کہا تھا، ''تمھارے بڈھے ہوجانے سے کیا میں بھی بڈھی بن جاؤں؟'' ا پہلے تو کچھ پل وہ ہکا بکا رہ گئے تھے، جیسے دماغ کی گھڑی کا چلنا ایک جھٹکے سے رک گیا ہو، یا اندر کی سار عقل ایک دم سُن ہوگئی ہو۔ مگر پھر غصے سے پھنپھناتے ہوئے انھوں نے بیوی کو لات گھونسوں سے دُھنک دیا۔ ''سسری، بے حیا ہورہی ہے! تیرا چھنال پن میں چھانٹ دوں گا۔''

لیکن اسی کے ساتھ وہ بیوی سے اور بھی زیادہ ڈر گئے تھے۔

اگلے دن انھوں نے بیوی کو سونے کے جھومر لاکر دیے۔

اگلے دن انھوں نے اسے چار سو روپے کی زری کی ساڑھی لاکر دی۔

بیوی بنا کسی سے پوچھے ہوئے، پڑوس کی ایک ہم عمر بیاہتا لڑکی کے ساتھ سنیما چلی گئی۔

انھوں نے بیوی کو پھر دُھنک ڈالا، لیکن اگلے ہی دن اسے سونے کی نگ جڑی مُندری گھڑا

کچھ دنوں بعد میلہ تھا۔ پڑوس کی عورتیں اور لڑکیاں دیکھنے جا رہی تھیں۔ بیوہ نند کے منع کرنے پر بھی وہ ان کے ساتھ چلی گئی۔ میلے میں وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک چہکتی ہوئی گھومی۔ اس نے برف چوسی، گول گپے کھائے اور ہنڈولے والے جھولے پر چڑھ کر اونچے چکر لگائے۔ خوشی نے اس میں پنکھ جوڑ دیے تھے۔ خوشی سے وہ چھلک رہی تھی۔

شام کو انھوں نے بیوی کو پھر پیٹا تھا۔ لات، گھونسوں اور جوتوں کی بوچھار کھاتے ہوئے اسے لگ رہا تھا کہ اس کے کچھ معصوم سپنے لہولہان ہو رہے ہیں۔

اگلے دن جب وہ دکان پر تھے، ایک آدمی نے بھاگتے ہوئے خبر دی کہ ان کی بیوی نے خودکشی کر لی ہے۔ گھر پر آکر انھوں نے پایا کہ کمرے کی کڑی سے ساڑھی کے پھندے کے سہارے اس کی لاش جھول رہی ہے۔

بیوی کو جب انھوں نے اچھے سے اچھا کھانے پہننے کو دیا تھا، تو ذرا سی سختی پر اس نے اپنی جان کیوں دے دی، اشرفی لال ٹھیک سے سمجھ نہیں سکے تھے۔

نو بج رہے تھے اور اشرفی لال چابیوں کا گچھا اور روکڑ والا لال جھولا لے کر دکان کے لیے چل پڑے۔ سردیوں کے دن ہوتے تو وہ دس بجے چلتے۔ موسم کے حساب سے بازار کے کھلنے کا یہی وقت بھی تھا۔ وہ ناریل کی رسی، سینک اور روئی کا کام کرتے تھے۔ دالیں اور مونگ پھلی جیسی جنسیں بھی وہ بازار کی نبض دیکھ کر جب تب بھر لیتے اور نکال دیتے تھے۔ ان کا پکا کام تھا۔ آج تک انھیں گھاٹا نہیں ہوا تھا۔

دکان کھولتے کھولتے اخبار والا اخبار ڈال گیا تھا۔ وہ ہندی کا ایک اخبار منگاتے تھے۔ لگائے جانے والے ٹیکسوں، انکم ٹیکس اور دوسرے محکموں کے ڈالے ہوئے چھاپوں، یا کرشموں اور حادثوں سے جڑی خبروں میں ہی ان کی زیادہ دلچسپی رہتی تھی۔ بین الاقوامی سیاست اور زندگی کی دوسری اہم سرگرمیوں کی خبروں کو وہ بنا پڑھے چھوڑ دیتے تھے۔ سب سے پہلے وہ اخبار میں مختلف منڈیوں کے بھاؤ پر نظر دوڑاتے تھے۔ سوموار کو ہفتے بھر کا راشی پھل نکلتا تھا اور اسے بھی وہ بڑے شوق سے دیکھتے تھے۔ برے گرہوں کو شانت کرنے کی موٹی موٹی تدبیریں وہ جانتے تھے۔ دوسرے دن اخبار ردّی ہو کر دکان کے کام میں آ جاتا تھا۔

گاہکوں سے نمٹتے ہوئے دوپہر ہو گئی تھی۔

دکان کا نوکر گھر جا کر ٹفن میں کھانا لگوا لایا اور انھوں نے وقت نکال کر کھا لیا۔ وہ دوپہر کا کھانا دکان

پر ہی کھاتے تھے۔ چوں کہ دکان پر کھاتے تھے، اس لیے وہ پکا ہوتا تھا، رات کو گھر پر کھایا جانے وا
تیسرے پہر گاہکوں کا دباؤ ایک دم کم ہوگیا تھا اور انھیں کس دکان سے کیا پانا ہے اور کس کو اس کا حساب کر ڈالا۔ دوسرے بکری کا بھی۔

سات بجے انھوں نے دکان بڑھادی۔ چلنے سے پہلے دکان کے تالے کھینچ کھینچ کر دیکھے۔ یہ انھو نے عادت بنالی تھی۔ ڈیڑھ سال پہلے وہ دکان کے اندر ایک نوکر لڑکے کو رات میں رکھتے تھے۔ یہ اُس لڑکے کے رہنے کا انتظام بھی تھا اور دکان کی چوکسی بھی۔

وہ تیرہ چودہ سال کا پہاڑی لڑکا تھا، دوسرے پہاڑی لڑکوں جیسا ہی— ناٹا قد، چپٹا چکنا چہرہ اور بھوری چمڑی۔ اسے پنجاب بینک کا چوکیدار لکشمن سنگھ لے کر آیا تھا۔ بولا تھا، ''لالہ شاب، اِش کو آپ کام پر رکھ لیجیے۔ یہ شارا کام آپ کا کرے گا۔ آپ کو ذراشی بھی شکایت نئی ملے گی۔''

ان کو ایک لڑکے کی ضرورت بھی تھی۔ دکان پر جو ایک پرانا نوکر تھا، وہ اکثر بیمار ہوجاتا تھا۔ ویسے بھی کبھی کبھی کام کے زیادہ دباؤ کے اوقات میں، وہاں ایک آدمی اور ہونا چاہیے، ایسا احساس انھیں شدت سے ہوتا تھا۔

انھوں نے حساب لگایا تھا۔ کھانا پینا ملا کر زیادہ سے زیادہ پچھتر روپے پڑتے تھے۔ اچھا نوکر ان دنوں سوا سو ڈیڑھ سو میں بھی ڈھونڈے نہیں ملتا ہے۔ یہ سودا سستا ہی تھا۔

دکان پر بیٹھے ہی بیٹھے وہ یوں ہی گھر بار کے لیے چیزیں بھی خرید لیتے تھے— سوپ، چھلنی، چٹائی۔ تو تا انھوں نے دکان پر ہی خریدا تھا۔ مگر یہ نوکر رکھنے کے بعد کی بات ہے۔

انھوں نے طے کرلیا تھا کہ نوکر کھانا تو گھر پر کھائے گا، لیکن رہے گا دکان پر۔ دکان ان کی کافی بڑی تھی۔ پیچھے کے حصے میں وقت ضرورت استعمال کرنے کے لیے انھوں نے پاخانہ بنوا رکھا تھا۔ ہینڈ پمپ بھی تھا، دوسری سہولتیں بھی۔ اوپر کھلے حصے میں لوہے کا جال پڑا تھا۔

پہلی شام نوکر لڑکے کو دکان میں بند کرتے ہوئے انھوں نے پوچھا تھا، ''ڈر تو نہیں لگے گا؟''

لڑکا اپنے مکئی کے دانے جیسے دانت چمکاتا ہوا بولا تھا، ''لالہ شاب، ہم کو ڈر نہیں لگتا۔ گاؤں میں ہم جنگل کو لکڑی کاٹنے واشطے جاتا تھا۔ وہاں بھالو ہوتا تھا۔''

صبح دکان کا تالا کھول کر انھوں نے لڑکے سے پھر پوچھا تھا، ''ڈر تو نہیں لگا؟''

اس بار لڑکا بنا دانت چمکائے ہوئے بول اٹھا، ''یہاں موش بہت ہیں۔ رات کو اودھم مچاتا رہا، شونے نہیں دیا۔''

اس پر وہ ہنس دیے تھے، ''رات میں تم رہوگے تو سارے موش بھاگ جائیں گے۔ موش سمجھیں گے،

بلاؤ آ گیا ہے۔''

آنکھیں تھوڑی نیلی تھیں اور وہ واقعی بلی کی طرح چمکتی تھیں۔

ہ روز شام کو لڑکے کو دکان پر بند کر دیتے تھے اور صبح نکال دیتے تھے۔ جمعے کو بازار کی چھٹی ہوتی اس دن وہ تالا کھول کر، اسے گھر لے آتے تھے اور اس سے کمروں کی صفائی کرواتے تھے، کھاٹیں واتے تھے، یا کپڑے دھلوانے جیسے کام لیتے تھے۔

لڑکے کا نام تھا جیون سنگھ۔ پہاڑ پر اس کے باپ کی کھیتی تھی۔ اس کی ماں مرگئی تھی اور باپ نے دوسری ی کر لی تھی۔ سوتیلی ماں کا برتاؤ اس کے ساتھ بہت خراب تھا۔ وہ اسے کھانے کو نہیں دیتی تھی اور باپ سے ٹی شکایت کر کے پٹواتی تھی۔ بھائی کی پیدائش کے بعد سے یہ سلوک اور بھی خراب ہو گیا تھا۔ وہ گھر سے پہلی لا تھا۔

اشرفی لال کو یہ لڑکا ذہین اور ایماندار لگا تھا۔ اسے کام کے لیے بار بار بتانا نہیں پڑتا تھا۔ اس کے پیروں میں پھرتی تھی۔ رَیک کے پٹڑوں پر پیر ٹکاتا ہوا وہ بندر کی طرح اوپر چڑھ جاتا تھا۔ پنڈی ے) کو بغیر بگاڑے ہوئے وہ بتائی گئی ناپ کی رسی ایک جھٹکے سے کاٹ دیتا تھا۔ ایک گاہک بنا پیسے دیے ے چلا جا رہا تھا اور اس نے ٹوک دیا تھا۔ بیس روپے کا نوٹ کرتا اتارتے ہوئے ان کی جیب سے گر گیا ر اس نے اٹھا کر ان کی طرف بڑھا دیا تھا، ''لالہ شاب، آپ کا روپیہ گر گیا ہے۔''

پندرہ دن کے بعد ہی وہ اسے چائے کے پیسے اوپر سے دینے لگے تھے۔ انھوں نے اپنی بیوہ بہن ، جسے لڑکا ماں جی کہتا تھا، کہہ دیا تھا کہ وہ اسے کھانے میں کھٹی میٹھی چیزیں بھی دے دیا کرے۔

انھوں نے لڑکے کو لیٹنے کے لیے ایک پرانی دری بھی دی تھی۔ اس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر وہ یوں ت اور ایمانداری سے کام کرتا رہا، تو وہ ہولی، دسہرے جیسے تہواروں پر اس کے نئے کپڑے بھی بنوا دیں

وہ اس بات سے واقف تھے کہ نوکر اکثر کچھ دنوں کے بعد پُھر ہو جاتے ہیں۔ جب اتفاق سے ایسا اچھا نوکر مل گیا تھا تو وہ اسے جانے دینا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اس کے ہونے سے کافی سہولت ں کرنے لگے تھے۔ کچی خصلت والے دوسرے دکاندار کہیں لڑکے کو بہکا نہ دیں، یا کچھ لالچ دے کر توڑ ، اس ڈر سے وہ اسے اِدھر اُدھر بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ ویسے وہ شرمیلے مزاج کا تھا اور خالی ہونے پر کان پر بیٹھا رہ کر بازار کی ہلچل کو تاکا کرتا تھا۔ اس کا شرمیلا پن اس کے چہرے کو اور بھی معصوم بنا دیتا ہاں ہر دم ایک پسیجا پن بھی رہتا تھا، خاص طور سے اس کی تھوڑی چپٹی ناک اور گداز ہونٹوں کے اور یہ بھی بھلا لگتا تھا۔

اس کو غور سے دیکھتے ہوئے وہ محسوس کرتے تھے کہ لڑکے کے روپ رنگ میں ایک
وہ اس سے پوچھتے تھے ''جیون سنگھ، یہاں خوش ہو؟''
''شب ٹھیک ہے،'' لڑکا نظر جھکائے ہوئے کہتا تھا۔
قریب دو مہینے ہو رہے تھے۔ وہ لڑکے سے مطمئن تھے اور لڑکا ان سے۔ اس دن بھی بازار کی چھ
دن تھا۔ وہ صبح سات بجے دکان کا تالا کھول کر لڑکے کو گھر لے آئے تھے۔ لڑکے نے کمروں کے فرش
دھلائی کرنے کے بعد پوچھا، ''لالہ شاب، یہاں کوئی ندی ہوگی؟ میں اپنے کپڑے دھوؤں گا اور نہاؤں گا۔
''کپڑے باہر گلی کے نل پر دھو ڈالو۔ وہیں نہا بھی لو۔''
''نہیں، ندی پر ٹھیک رہے گا۔ میں پہاڑ پر ندی میں نہاتا تھا۔''
ندی پر آ کر لڑکا کھل اٹھا۔ وہ خوشی کے احساس سے ندی کے پانی کو دیکھنے لگا۔ لگا ندی کی آنکھ
ہیں اور وہ اسے دیکھ کر ہنس رہی ہے۔ ندی کے ہاتھ ہیں اور وہ اسے بلا رہی ہے۔ ندی کے پیر ہیں اور وہ
رہی ہے — شاید اُس کے گاؤں کی طرف۔
وہ ندی میں اتر کر تیرنے لگا، کبھی چت، کبھی پٹ اور کبھی اندر ہی اندر۔ وہ ندی کے ہاتھ میں ا
ہاتھ دے دیتا، پیروں میں پیر۔
کنارے پر ایک اونچا ٹیلا تھا اور وہ پانی سے نکل کر ٹیلے پر چڑھ گیا۔ ٹیلے پر دو بکریاں چر رہی تھ
اور اسے دیکھتے ہی قلانچیں بھر کر نیچے اتر گئیں۔ اس کے گاؤں میں بھی بکریاں تھیں اور ایسے ہی قلانچیں
تھیں۔ ٹیلے پر سے اسے اجلا آکاش دور دور تک پھیلا ہوا دکھائی دیا۔
وہ کپڑے سکھا کر دو گھنٹے بعد لوٹا۔
شام کو کھانا کھا کر اشرفی لال نے اسے دکان کے اندر حسب معمول بند کر دیا۔
اگلے ہفتے بازار کی چھٹی والے دن لڑکے نے ندی پر جانے کے لیے پھر زور دیا۔
اس دن بھی ندی اسے ہاتھ ہلا ہلا کر اشارہ کرتی اور آنکھوں سے مسکرا مسکرا کر دوڑتی ہوئی لگی۔
دن بھی وہ ندی میں دیر تک مچھلی جیسا تیرا۔
اس دن بھی وہ اونچے ٹیلے پر چڑھا۔ دور بچھی پٹریوں پر ایک ریل گاڑی جا رہی تھی اور وہ
حیرانی سے دیکھنے لگا۔ اس کے سر پر ایک چڑیا بیٹھ گئی۔ پھر پھر سے اڑ گئی۔ وہ نیلے آکاش میں اڑتی
چڑیا کو حیران آنکھوں سے دیکھنے لگا۔
اس نے لوٹ کر اشرفی لال سے کہا کہ وہ اس کا حساب کر دیں، وہ پہاڑ پر اپنے گاؤں جائے
وہ گاؤں جانے کے لیے اڑ گیا۔

. میں نہیں آیا کہ اچانک ایسا کیا ہوگیا جولڑکا چلا گیا۔ انھوں نے آج ہی ناشتے میں
یے تھے۔

'ٹائیں... ٹائیں.... ٹوں... پڑھو پٹے سیٹا رام... سیٹارام۔ ٹائیں... ٹائیں... ٹوں... پڑھو پٹے سیٹارام... سیٹارام...'' توتا پنجرے میں گھوم گھوم کر الاپ کر رہا تھا۔

اشرفی لال نے پنجرے کے قریب جا کر دُلار کے ساتھ اس کا ساتھ دیا، ''سیتارام... سیتارام...''

''ٹائیں... ٹائیں... ٹوں... پڑھو پٹے سیٹارام... سیٹارام۔''

اشرفی لال کے ''پڑھو پٹے'' کا خطابی لفظ نہ لگانے پر بھی توتا اس کو بولتا تھا ضرور، مختلف ڈھنگ سے۔ اشرفی لال اکثر سوچتے تھے کہ اسے سکھاتے ہوئے انھیں ''پڑھو پٹے'' کا غیر ضروری لفظ نہیں بولنا چاہیے تھا۔ اس کے ویسا کرنے پر کبھی کبھی انھیں یہ بھی لگتا تھا کہ توتے کی طرف سے ''پڑھو پٹے'' کا خطاب ب خودان کے لیے ہے۔

توتے نے پنجرے کی تیلیوں کے پاس آ کر اپنی گردن نکادی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ توتا کہہ رہا ہے، میری گردن سہلاؤ۔ وہ تیلیوں کے پھیلاؤ کے درمیان انگلی ڈال کر ویسا ہی کرنے لگے۔

توتے کے گلے میں کنٹھا پڑ چلا تھا۔ کنٹھے کا گھیرا کہیں گہرا سرخ تھا، کہیں ہلکا پیلا پن لیے ہوے۔ اس کے چاروں طرف ایک کالی مخملی لکیر بھی اُبھر رہی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ توتا اب جوان ہوگیا ہے۔

انھوں نے جب توتا خریدا تھا، ایک دم مرگلا تھا۔ انھیں شک ہوا تھا کہ یہ پڑھ بھی سکے گا۔ مگر بہیلیے نے تسلی دی تھی کہ توتے کے بچے پڑھنا جلدی سیکھتے ہیں، بوڑھے پٹے ہی رام رام نہیں کہتے۔ کچھ دنوں میں یہ بہت خوبصورت دِکھنے لگے گا۔

توتا سچ میں پڑھ بھی گیا تھا اور خوبصورت بھی ہوگیا تھا۔

انھوں نے توتے کو کیلے کا ٹکڑا ڈال دیا۔ توتا کیلا کتر کتر کر کھانے لگا۔

اخبار میں کسی ملک میں ہوے ہنگاموں کے بارے میں چھپا تھا، مگر انھیں اس خبر میں دلچسپی نہیں ہوئی تھی اور پڑھتے ہوے اسے چھوڑ دیا تھا۔

دکان سے لوٹ کر انھوں نے برفی کا ٹکڑا توتے کے پنجرے میں ڈال دیا۔

انھوں نے سونے سے پہلے پنجرہ آنگن سے لا کر برآمدے میں اونچے کڑے سے ٹانگ دیا۔ سردی کے دنوں میں وہ پنجرے پر ایک موٹا کپڑا بھی ڈال دیتے تھے۔

بہیلیے نے توتا لینے کے لیے زور دیتے ہوے کہا تھا، ''لالہ جی، آپ پال لیجیے۔ کچھ دن میں جب یہ

میٹھی میٹھی بولی بولنے لگے گا، آپ اسے کسی اپنے سگے جیسا ہی محسوس کریں گے۔''
دو روپے کا خریدا ہوا تو تا بیچ میں خاندان کا ایک فرد ہی ہو گیا تھا۔

''ٹائیں... ٹائیں... ٹوں... پڑھو پٹے سیٹا رام... سیٹا رام... سیٹا رام...'' صبح ہو گئی تھی۔ اشرفی لال توتے کے پنجرے میں چھلی ہوئی لیچی ڈال دی تھی۔

''ٹائیں... ٹائیں... ٹوں... پڑھو پٹے سیٹا رام... سیٹا رام... سیٹا رام...'' ایک اور صبح ہو گئی تھی۔ اشرفی لال نے پنجرے میں خوبانی ڈال دی تھی۔

''ٹائیں... ٹائیں... ٹوں... پڑھو پٹے سیٹا رام... سیٹا رام... سیٹا رام...'' ایک اور صبح ہو گئی تھی۔ اشرفی لال نے پنجرے میں آلوچہ ڈال دیا تھا۔

تو تا جب آنکھوں کی پتلیوں پر سفید جھلی گرا کر ایک ٹانگ اٹھا لیتا تھا، تو وہ کسی دھیان میں مصروف مُنی جیسا دکھتا تھا۔ توتے کی پونچھ میں ہرے پنکھوں کے ساتھ ساتھ دو ایک پنکھ پیلے تھے اور دو ایک نیلے۔ توتے کی پونچھ لمبی ہو گئی تھی۔ پہلے پنجرہ چھوٹا تھا، لیکن پھر وہ ایک بڑا پنجرہ لے آئے تھے، جس میں جھولے نما بیچ میں ایک بیٹھکی بھی لگی تھی۔

''ٹائیں... ٹائیں... ٹوں... پڑھو پٹے سیٹا رام... سیٹا رام... سیٹا رام...'' ایک اور صبح ہو گئی تھی۔

اخبار میں تیسری دنیا کے کسی غلام ملک کے آزاد ہونے کی خبر تھی۔ اشرفی لال نے اسے ان دیکھا چھوڑ دیا تھا۔

اخبار میں ایک گاؤں میں اچھوتوں کے ٹھاکروں کے بیگار کرنے سے انکار کر دینے اور اچھوتوں کی جھونپڑیاں پھونکے جانے کی بات تھی۔ اشرفی لال کو اس خبر میں بھی خاص دلچسپی نہیں ہوئی تھی۔

''ٹائیں... ٹائیں... ٹوں... پڑھو پٹے سیٹا رام... سیٹا رام... سیٹا رام...'' ایک اور صبح ہو گئی تھی۔

اشرفی لال پنجرے کی صفائی کر رہے تھے۔ کسی کے آواز دینے پر وہ باہر ملنے چلے گئے۔ لوٹ کر آئے تو انھوں نے پایا کہ پنجرے کی کھڑکی کھلی چھوٹ گئی تھی اور توتا باہر پنجرے کے اوپر بیٹھا ایک ٹانگ پر اپنے گیلے پنکھ پھیلائے سکھا رہا ہے۔ انھوں نے سیب کا ٹکڑا پنجرے میں ڈال دیا اور توتا اتر کر اندر چلا گیا۔ پہلے بھی ایک بار ایسا ہوا تھا۔ توتے نے پنجرے کو ہی اب اپنا گھر مان لیا ہے۔ وہ محبت سے مونگے جیسی اس کی چونچ کو دیکھتے رہے۔ پھر انگلی ڈال کر اس کی گلوبند جڑی گردن کو نرم نرم سہلاتے رہے۔

''ٹائیں... ٹائیں... ٹوں... پڑھو پٹے سیٹا رام... سیٹا رام... سیٹا رام...'' ایک اور صبح ہو گئی تھی۔

''ٹائیں... ٹائیں... ٹوں... پڑھو پٹے سیٹا رام... سیٹا رام... سیٹا رام...'' ایک اور صبح ہو گئی تھی۔

ھا۔ دھوپ میں خوب اجلی جھلملا۔
۔ کھیتوں میں سنہرا پن بھر گیا تھا۔ ہوا میں ،
والا ایک توتا اوپر آکاش سے اتر کر پنجرے پر بیٹھ گیا اور تا ۔
اندر تیزی سے دو تین چکر کاٹ کر ٹاٹیں ٹا ٹیں کرنے لگا۔ باہر والا توتا بہ
چکر لگائے اور پنجرے کے اوپر پھر بیٹھ کر آواز کرنے لگا۔ اندر کا توتا اپنے پنکھ پھڑ پھڑاتا،
بدحواسی سے چیخنے لگا۔
باہر والا توتا دوبارہ اڑا اور اڑتا چلا گیا، اپنے پنکھوں سے کھلے آکاش کو ایک دلکش پھیلاؤ دیتا ہوا۔
اشرفی لال نے شام کو دکان سے لوٹنے پر پایا کہ توتا پنجرے کے اندر بے چین ہے۔ وہ اپنی چونچ
سے پنجرے کی تیلیاں جھنجھوڑ رہا ہے۔ وہ اپنے تیوروں سے ایک مختلف توتا بن گیا ہے۔ انھوں نے بالوشاہی
کا ایک ٹکڑا پنجرے کے اندر ڈالا، مگر توتا اس ٹکڑے کو اٹھائے بغیر تیلیوں کو ویسے ہی جھنجھوڑتا رہا۔ انھوں نے
اسے شانت کرنے کے لیے اس کی گردن سہلانی چاہی، مگر توتا ان کی انگلیوں پر جھپٹ پڑا۔
صبح ہو گئی تھی، روز جیسی... نہیں، مختلف۔ توتا بول نہیں رہا تھا۔ اشرفی لال برآمدے میں آ گئے۔
پنجرے کی ایک تیلی مڑی تڑی تھی اور بڑھے ہوئے شگاف میں سے توتے کی گردن باہر نکلی تھی۔ تھوڑے
پھیلے ہوئے پنکھ اور مڑی ہوئی ٹانگوں سے ایسا لگ رہا تھا کہ توتا پنجرے کو لے کر اڑ رہا ہے۔
اشرفی لال آج بھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ توتے نے یوں گردن پھنسا کر اپنی ننھی سی جان کیوں دی۔

ہندی سے ترجمہ:

بھر بھر کرتی ہوئی ایک جیپ دکان کے سامنے رکی۔

''او چائے والے، چار کپ چائے بنانا،'' کہہ کر ایک آدمی تین آدمیوں کے ساتھ دکان کے آگے پڑی کھاٹ پر بیٹھ گیا اور وہ آپس میں اس بنتی ہوئی سڑک کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔ چائے والے نے کوئلے کے چولھے پر کھولتے پانی کو پتیلی میں ڈال کر اندازے سے اس میں چائے، چینی اور دودھ ملا دیا اور کانپتے ہاتھوں سے آنکھیں نیچی کیے چار کپ چائے تپائی پر رکھ آیا۔

''اوہو ہو، کیا واہیات چائے بنائی ہے اس بڈھے نے؟'' یہ کہہ کر اس آدمی نے جھٹکے سے پیالے سمیت چائے نیچے لڑھکا دی۔ باقی تینوں آدمیوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی، لیکن چائے سڑکتے رہے۔ اب جا کر چائے والے نے آنکھ اٹھائی، اور غصے سے بڑبڑاتے اس آدمی نے بھی چائے والے کو دیکھا اور حیرت سے بول اٹھا:

''ارے آپ، ماسٹر صاحب!؟''

اور ماسٹر چندر بھان پانڈے نے دیکھا کہ وہ آدمی اور کوئی نہیں، اس کے علاقے کے ایم ایل اے جنگ بہادر یادو ہیں۔ ان کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں اور جھکی ہوئی آنکھیں تار تار پھٹی ہوئی کھادی کی دھوتی کے بڑے بڑے سوراخوں میں الجھ گئیں۔

یادو جی نے ایک قہقہہ لگایا۔ ''اچھا ماسٹر جی، آپ نے اب یہ دھندا بھی شروع کر دیا؟ ٹھیک ہے، آدمی کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔ پیسہ بڑی چیز ہے۔ میرے لائق کوئی سیوا ہو تو کہیے گا، ماسٹر جی۔'' پھر ایک قہقہہ لگایا اور ساتھ کے لوگوں نے بھی قہقہے کا ساتھ دیا۔ ایک نے خوشامد کے طور پر کہا، ''ارے یادو جی، آپ

کی بدولت جب اس علاقے میں سڑک آ رہی ہے تو نہ جانے کتنے لوگوں کا پیٹ پلے گا۔''

یادو جی نے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا اور ماسٹر صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

''میرے پاس کھلے روپے اور پیسے نہیں ہیں،'' ماسٹر جی نے کہا۔

''ارے تو رکھیے نا، کون آپ سے پیسے واپس مانگ رہا ہے؟''

''نہیں، میں آپ سے ویسے بھی پیسے لینے کا حقدار نہیں ہوں۔ آپ نے تو چائے پی نہیں۔''

''ارے تو چائے کے پیسے کون دے رہا ہے گرو جی! اسے گرو دکشنا سمجھ لیجیے۔ کام آئے گا۔''

پانڈے جی تلملا گئے۔ ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ پکڑے گنگ سے رہ گئے۔ ان کے دل میں غصے کا ایک بگولا سا اٹھا۔ آنکھوں میں حقارت بھرے وہ یادو جی کی طرف بڑھے اور پانچ کا نوٹ ان کی طرف پھینک کر چلائے، ''یادو جی، یہ اپنے روپے لیتے جایئے، میں بھیک نہیں مانگتا۔''

لیکن یادو جی جیپ میں بیٹھ چکے تھے۔ مسکرا کر پانڈے جی اور ان کے پھینکے ہوئے روپے کو دیکھا۔ جیپ بھرر بھرر کر کے اسٹارٹ ہوئی اور اس کی دھول بھری ہوا میں ناچتا ہوا نوٹ تھوڑی دور جا گرا۔

کچھ دیر تک نوٹ دھول بھری ہوا میں چھٹپٹاتا رہا اور پھر شانت ہو گیا۔ پانڈے جی اسے دیکھتے رہے، پھر دھیرے دھیرے آگے بڑھے اور دھول جھاڑ کر نوٹ اٹھا لیا۔ آخر کیا کیا جائے۔

گورے بدن، چوڑے ماتھے، سفید بالوں والے پانڈے جی کھادی کی ایک چھٹی پرانی دھوتی پہنے اور اسی کا آدھا حصہ ننگے جسم پر ڈالے ہوئے اپنی جھونپڑی کے آگے پڑی بنچ پر بیٹھے بیٹھے اداس ہو چلے تھے۔ ان کے چندن لگے ماتھے کی سکڑن بھری لکیروں میں یادو جی کی جیپ سے اڑی ہوئی دھول سما گئی تھی۔ سوچ رہے تھے—

یادو اسے ذلیل کر گیا۔ وہ پہلے ہی کہتا رہا کہ یہ کام اس سے نہیں ہوگا۔ وہ برہمن، پرانا کانگریسی، اسکول کا استاد— کیا بڑھاپے میں چھوٹی ذات کے لوگوں کی طرح چائے پکوڑی اور سُرتی (لیموں ملا تمباکو) بیچنا ہی اس کی تقدیر میں رہ گیا تھا۔ اس نے کتنا منع کیا لیکن اپنی اولاد کے آگے کس کا بس چلتا ہے۔ رمیش ضد کر بیٹھا اور کچھ لوگوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

''پر...'' پانڈے جی اداس ہو گئے۔ ہاتھ لگا کر دیکھا— کھادی کی دھوتی چوتڑ پر پھر پھٹ گئی تھی۔ دھوتی کیا ہے جیسے چیتھڑوں کا جوڑ۔ کھادی اسے بے پردہ کر کے چھوڑے گی۔ اب وہ کیا کرے؟ اسی دھوتی کو وہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر کر کے پہنتا رہتا ہے۔ سبھی جگہ سے تو یہ پھٹ چکی ہے۔ اب اِدھر سے اُدھر کرنے کی بھی تو جگہ نہیں بچی۔ رمیش کہتا ہے، ''چھوڑیے کھادی وادی پتا جی! مِل کی دھوتی مضبوط اور سستی ہوتی ہے۔ وہ اس طرح جگہ بے جگہ دھوکا نہیں دیتی۔''

وہ کب سے سن رہا ہے رمیش کی بات کو اور سوچتا ہے، ٹھیک ہی تو کہتا ہے رمیش۔ لیکن اب کیا بدلنا؟ اب تو زندگی بیت چلی، اس بڑھاپے میں کیا اپنی وضع چھوڑنا؟ لیکن وہ کہاں سے خریدے کھادی کی دھوتی؟ ایک موٹی دھوتی بھی تیرہ چودہ روپے سے کم میں نہیں آتی، پھر اس کے ساتھ کرتا، ٹوپی، چادر، تولیا سبھی تو لگے ہوئے ہیں۔ اتنے میں تو مل کے موٹے کپڑوں کے کئی کئی سیٹ آجائیں گے اور چلیں گے بھی زیادہ... پھر بھی جی نہیں مانتا۔ اب جینا ہی کتنے دن ہے۔ لیکن جی کے ماننے نہ ماننے کا ہی سوال تو نہیں ہے۔ اسے اسکول سے ریٹائر ہوئے پانچ برس ہوگئے۔ کھیت کے نام پر تین بیگھے — وہ بھی باڑھ کے مارے کنارے کے کھیت۔ چھ سات آدمیوں کا گذر بسر کیسے ہوگا؟ مہیش تو پڑھ لکھ کر خاندان سمیت باہر چلا گیا نوکری کرنے۔ اس کا اپنا ہی گذر بسر مشکل سے ہوتا ہے۔ چھوٹا لڑکا رمیش بہت ڈھکیلنے پر بھی آٹھویں پار نہیں کر سکا۔ پھنس گیا کھیتی باڑی میں۔ اس کے تین بچے ہیں۔ دونوں وقت بھر پیٹ کھانا تو ملتا نہیں، یہ کھادی کے کپڑے کہاں سے آئیں؟

دکان کے سامنے کی سڑک سے لوگ آجا رہے تھے۔ پانڈے جی نے جھونپڑی کے پیچھے جا کر دھوتی اِدھر اُدھر کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اب انھیں کوئی گنجائش نہیں دِکھی۔ انھیں غصہ ہو آیا کہ اس سسری دھوتی کو پھاڑ پھوڑ کر پھینک دے اور ننگا ہو جائے۔ ارے، ننگا تو ہو ہی گیا ہے! چائے کی دکان کھول کر کم ننگا ہوا ہے؟ ہر جاننے والا ایک طنز بھری نظر سے اسے دیکھتا ہے اور عجب عجب سوال کرتا ہے۔ اور تس پر یہ یادو کا بچہ اسے اتنا ذلیل کر گیا۔ اسے اتنا غصہ آیا کہ اس یادو کے بچے کو پھر ایک بار بنچ پر کھڑا کر کے اس کے چوتڑ پر بینت لگائے۔ لیکن اب تو وہ ایم ایل اے ہو گیا ہے، شاگرد نہیں رہا۔ وہ اپنا غصہ اپنے اندر ہی دبائے سلگنے لگا۔ لیکن اسے ایک بات سے بڑی راحت ملی کہ اس نے اس ایم ایل اے کے بچے کو اسکول میں بنچ پر کھڑا کر کے بینت سے پیٹا ہے۔ اب بھی اس کے چوتڑ پر بینت کے نشان ہوں گے۔ دھیرے دھیرے اسکول کے دن اس کے سامنے کھسک آئے۔ تب کون جانتا تھا کہ یہ جنگلی آگے چل کر جنگ بہادر یادو ایم ایل اے بن جائے گا۔ کلاس میں سب سے بودا لڑکا یہی تھا۔ اسے ہر روز مار پڑتی تھی۔ کئی بار تو اس نے لڑکوں کے چاقو، دوات، پنسل چرائی تھیں اور اس نے اسے بنچ پر کھڑا کر کے بہت پیٹا تھا۔ ایک بار تو اس نے گاندھی جی کی تصویر دوسرے لڑکے کی کتاب سے پھاڑ لی تھی اور اس پر پیشاب کر دیا تھا۔ پھر تو اس نے اسے اسکول سے ہی نکال دیا تھا۔ بعد میں لوگوں کے کہنے سننے پر واپس لے لیا تھا... اب وہ بڑا نیتا بن گیا ہے۔ پتا نہیں اس ملک میں کیسے اتنے بڑے بڑے کرشمے ہو جاتے ہیں۔ اسے لگتا ہے کہ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں اور وہ کھادی کی پھٹی دھوتی پکڑے ہوئے بیٹھا ہے۔

شام کو رمیش آیا اور دونوں آدمی دکان اٹھا کر گھر لے گئے۔

''مجھ سے یہ نہیں ہوگا، رمیش،'' پانڈے جی تھکے تھکے سے بولے۔

''کیوں پتا جی؟''

''لوگ مجھے بہت چھوٹی نظر سے دیکھ رہے تھے آج۔ میں لوگوں کی نگاہ نہیں جھیل پا رہا تھا۔''

''ہاں پتا جی، بھوک سے بھاری لوگوں کی نگاہیں ہی تو ہوتی ہیں نا۔ تو ٹھیک ہے، ہم لوگوں کی نگاہیں کیوں جھیلیں، بھوک ہی جھیلیں۔''

درمیان میں ایک خاموشی پسر گئی۔

''بیٹھنے کو تو میں بیٹھتا، دیکھتا کون سالا میری بے عزتی کرتا ہے، لیکن پھر کھیتی باڑی چوپٹ ہو جائے گی۔''

پانڈے جی کچھ نہیں بولے۔

''کچھ ملا، بابو جی؟''

''ہاں، دو روپے کمائی کے اور پانچ روپے گرو دکشنا کے۔''

''گرو دکشنا کیسی؟''

پانڈے جی نے یادو کی کہانی سنا دی۔

''ارے تو اس میں اتنا ناراض ہونے کی کون سی بات ہے، بابو جی۔ سو ہم لوگوں سے کھاتا ہے، پانچ دے ہی گیا تو کیا ہو گیا؟''

پانڈے جی نے رمیش کو مار کھائی ہوئی نگاہ سے دیکھا۔ رمیش ہنس رہا تھا۔

رات کو پانڈے جی لیٹے تو کافی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ وہ خود سے ہی پوچھ رہے تھے— کیوں بھائی آدرش وادی کانگریسی، تپے ہوئے استاد، نشہ خوری کے دشمن— تمھارا یہی انجام ہونا تھا؟ جنھیں تم نے زندگی بھر علم پلایا، کیا انھیں اب چائے پکوڑی کھلاؤ پلاؤ گے؟ جن کے سامنے نشے کے خلاف بولتے رہے، انھیں کے لیے سُرتی تو لو گے؟ نہیں، نہیں، یہ نہیں ہوگا۔

وہ کب سے سوچ رہا تھا کہ کاش، اس پچھڑے ہوئے کچھار میں بھی ایک سڑک آتی۔ لیکن ساری کی ساری سرکاریں تو سوئی ہوئی ہیں اس کچھار کی طرف سے آنکھ پھیر کر۔ سڑکیں تو دنیا میں کتنی ہیں لیکن اپنے جوار میں سڑک آنے کا اور اس پر سفر کرنے کا سکھ کچھ اور ہی ہوگا۔ کتنا پیارا تجربہ ہوگا، ندیوں نالوں، خندقوں کھائیوں کے اوپر سے بھاگتی سڑک کا مسافر ہونے کا۔ کتنی سہولتیں بڑھ جائیں گی۔ لیکن تب اس نے کہاں سوچا تھا کہ سڑک کے آنے کا کوئی اور مطلب بھی ہو سکتا ہے۔

اور جب کچی سڑک پکی سڑک بننے لگی تو رمیش نے کہا، ''بابو جی، کچی سڑک پکی سڑک بن رہی ہے

— یہ بہت اچھا ہوا۔ اپنا ایک کھیت سڑک کے کنارے ہی ہے اور اس کے پاس اڈا بھی بننے والا ہے۔ ہم کیوں نہ وہاں کوئی دکان کھول دیں؟ شروع میں چائے کی دکان کھولی جائے اور کچھ سرتی کی گانٹھیں وہاں رکھ دی جائیں۔ راستہ تو چالو ہے ہی، اب سڑک بن رہی ہے، وہ اور چالو ہوجائے گی اور بہت سے مزدور کام پر لگیں گے۔''

''اچھا، دیکھا جائے گا'' ٹالنے کی غرض سے پانڈے جی نے کہا۔

''دیکھا نہیں جائے گا، ابھی شاید کسی کے دماغ میں یہ چیز آئی نہیں ہے، بعد میں تو سبھی ایک ساتھ دکان کھول دیں گے۔ ہمیں سب سے پہلے اپنی دکان جمالینی چاہیے۔''

ایک خاموشی چھائی رہی۔

''اس بڑھاپے میں آپ کو کھیتی باڑی کے کام کرنے پڑتے ہیں، اس سے اچھا ہوگا کہ آپ دکان پر بیٹھیں۔ آرام سے آپ کے دن بھی کٹ جائیں گے اور چار پیسے کی آمدنی بھی ہوجائے گی۔''

''کیا کہتے ہو— اب میں دکانداری کروں گا؟'' وہ طیش میں اٹھا تھا تو اس کی دھوتی پھٹ گئی تھی۔

اور جب روز روز رمیش کے خیال اس کے دماغ سے ٹکرانے لگے تو ایک دن دکھی من سے منظوری دے دی۔ بنتی ہوئی سڑک کے پاس والے کھیت میں ایک جھونپڑی پڑ گئی، کچھ سرتی کے پتے اور چائے کے سامان رکھ دیے گئے۔ وہ آج پہلی بار دکان پر بیٹھا تھا۔

لیکن نہیں، وہ کل دکان پر نہیں جائے گا۔ اس کا رُواں رُواں رنج سے سلگ رہا ہے۔ غریب ہوا تو کیا— اس بڑھاپے میں اپنی آبرو بیچے گا؟ کروٹ لی تو دھوتی پھر پرر سے بول گئی۔ اب ننگا ہوکر گھر تو رہ سکتا ہے لیکن کیا دکان پر بھی جائے گا اسی حالت میں؟

صبح ہوئی تو رمیش دکان کا سامان لیے موجود ہوگیا۔ پانڈے جی ادھ ننگے لیٹے رہے۔

''بابو جی، دکان نہیں جائیں گے؟''

پانڈے جی کے جی میں تو آیا کہہ دیں، ''نہیں جاؤں گا'' لیکن کہہ نہیں سکے۔ درد بھری آواز میں بولے، ''ننگا ہی جاؤں کیا؟''

سامان نیچے رکھتے ہوئے رمیش بھاری من سے بولا، ''اب کیا کہا جائے۔ کچھ روپے اکٹھے ہوجائیں تو آپ کے لیے کھادی کی ایک دھوتی لادوں۔ کھادی بھی کتنی مہنگی ہوگئی ہے۔''

پانڈے جی نے دیکھا کہ رمیش کے بچے پھٹے پرانے نیکر پہنے اس کے سامنے سے اسکول چلے گئے۔ انھیں ایک چوٹ سی لگی— کیا وہ اتنی مہنگی کھادی کی دھوتی پہن کر بچوں کو ننگا رکھے گا؟ آج تک تو اس نے یہی کیا۔ اسے کیوں نہیں معلوم ہوا کہ کھادی کھادی میں فرق ہوتا ہے؟ ایک کھادی اس کی ہے، ایک یادو جی

کی۔ یادو ہی کھادی پہننے کا حق دار ہے کیوں کہ اس کے جسم پر کھادی کھلی ہے۔ اور وہ؟ وہ نہیں، اس کے جسم پر تو کھادی پھٹتی ہی چلی گئی ہے۔

رمیش سامان لیے اندر جا رہا تھا کہ پانڈے جی نے پکارا۔

''رمیش!''

''ہاں، بابو جی!''

''تمھارے پاس اس کے علاوہ کوئی ثابت دھوتی ہے؟''

''ہاں، ہے بابو جی۔''

''لانا تو بیٹے۔''

رمیش نے دکھ، حیرت اور خوشی بھری آنکھوں سے پتا کو دیکھا۔ پتا نے دوسری طرف منھ پھیر لیا تھا۔

اور کچھ دیر بعد پانڈے جی رمیش کی دھوتی پہن کر رمیش کے پیچھے پیچھے دکان کی طرف چلے جا رہے تھے۔

گری راج کشور

ہندی سے ترجمہ: سلام بن رزاق

پانچواں پراٹھا

بٹی بڑی اور بٹو چھوٹا۔ بٹی اسکول جاتے جاتے اب تیسری کلاس میں پہنچی ہے۔ محنتی ہے، سمجھدار ہے، لیکن کبھی کبھی گھپلا ہوجاتا ہے۔ بٹو کے داخلے کی کوشش دو سال سے ہوتی آرہی ہے۔ پچھلے سال بھی داخلہ نہیں ہو پایا۔ باپو کے پاس نہ تو پیسے ہی ہیں اور نہ وہ کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جو بٹو کا داخلہ کرا سکے۔ محلے کے پندرہ بیس مکان داروں نے پانچ پانچ روپے مہینے پر رات کو پہرہ دینے کے لیے رکھا ہے۔ وہ ان ہی سے جا کر کہتے ہیں۔ وعدہ سب کر لیتے ہیں لیکن ہوتا کچھ نہیں۔ باپو کی نوکری پہلے ایک مل میں تھی۔ قریب دو سال سے باہر ہیں۔ شروع میں کچھ دن کی چھٹنی ہوئی تھی۔ سب مزدوروں کو بٹھا دیا گیا تھا۔ بہت سے مزدور تو کام پر لے لیے گئے، باپو ابھی تک باہر ہیں۔ باپو کبھی کبھی بہت دکھی ہوتے ہیں۔ ''ارے! کام کی کمی کے سبب بٹھاتے تو بات تھی۔ لگتا ہے کام کرنا ہی کال ہوگیا۔'' ان جیسے جتنے بھی بیٹھے، آج تک اٹھ ہی نہیں پائے۔

ماں آس پاس کے گھروں میں کام کرنے جاتی ہے۔ کل ملا کر تیس چالیس روپے ماں کو مل جاتے ہیں۔ وہ اپنے کرموں کو روتی رہتی ہے۔ ڈھائی تین گھنٹے صبح کام کرو، اتنا ہی شام کو، تیس روپے ملتے ہیں۔ آدمی کے جسم اور محنت کا تو بیاج تک نہیں ملتا۔ جسم کی قیمت ہی نہیں تو بیاج کیا ملے گا!

بٹیا اسکول جاتی ہے۔ اسے مہینے میں تیس دن خالی پیٹ ہی جانا پڑتا ہے۔ کبھی باپو ڈیوٹی پر سے جلدی آگئے اور چائے بن گئی تو پیٹ میں دو گھونٹ چائے پڑ جاتی ہے، ورنہ وہ بھی نہیں۔ یہی اس کے دکھ کا سب سے بڑا سبب ہے۔ وہ چاہتی ہے دن میں ملے نہ ملے، لیکن اسکول جاتے وقت ضرور پیٹ بھرا رہے۔

اسکول میں سارا دن پیٹ میں کچھ چوں چوں کرتا رہتا ہے۔ دھیان بٹتا ہے۔ ماسٹر جی بولتے رہتے ہیں اور اس کا دھیان پیٹ کی چوں چوں میں لگا رہتا ہے۔ دوسرے بچے ہیں، وہ کھا کر بھی آتے ہیں اور پیسے بھی لاتے ہیں۔ ریسیس میں وہ کھیلتی رہتی ہے اور بچوں کو چاٹ چٹورے کھاتے دیکھتی رہتی ہے۔ پہلے اس کا ایک دوست تھا۔ جو وہ خود کھاتا تھا اسے بھی کھلایا کرتا تھا۔ اس کی اس ادا سے وہ اس کے قریب آ گئی تھی۔ ایک دن وہ پیسے نہیں لایا۔ دوست نے اس سے کہا، آج تو کھلا۔ بٹی کہاں سے کھلاتی؟ نہیں کھلایا۔ دوست نے اسے طعنہ دیا۔ ''تو بھی تو کبھی کھلایا کر۔ یا بس کھانے ہی کھانے کو ہے؟'' اسے بہت رونا آیا۔ بعد میں اس دوست نے بٹی کو بلایا بھی مگر وہ گئی نہیں۔ بیٹھنے بھی دوسری جگہ لگی۔ بولنا چالنا تو بند سا ہو ہی گیا۔ وہ بات اس نے گھر پر آ کر نہیں بتائی، لیکن وہ بات اندر ہی اندر اسے کھاتی رہی۔

اس واقعے کے بعد کچھ دن تک تو بٹی چپ رہی، پھر ایک دن وہ ماں پر برس پڑی۔ ''سب بچے گھر سے کچھ کھا کر آتے ہیں۔ تو ہمیں نہ کھانے کو کچھ دیتی ہے اور نہ لے جانے کو۔ ہم کیا کریں؟ اسکول میں بھوک لگتی ہے۔ بھوکے پیٹ ہم سے نہیں پڑھا جاتا۔'' باپو کے بارے میں وہ کبھی کچھ نہیں کہتی تھی۔ اس دن باپو پر بھی غصہ آ گیا۔ ''باپو مل میں کام کرنے کیوں نہیں جاتے؟ جب مل میں کام پر جاتے تھے تو کھانے کو ملتا تھا۔ اب گھر میں بیٹھے رہتے ہیں۔ کان پور میں اتنی ساری ملیں ہیں۔ سب کام کرنے جاتے ہیں۔'' ماں کو اس کے بڑبولے پن پر غصہ آ گیا۔ اس نے بٹی کی خوب مرمت کی۔ بٹی روتی ہوئی کہتی رہی، ''ماں اب معاف کر دے۔ اب نہیں کہوں گی۔ بھوکی مر جاؤں گی پر کبھی کھانا نہیں مانگوں گی۔ کسی کو کچھ نہیں کہوں گی۔ ماں غلطی ہو گئی!'' مگر ماں نے تب تک نہیں چھوڑا جب تک مارتے مارتے خود تھک نہیں گئی۔

پٹائی کے بعد ماں کا دل بہت تڑپا۔ بچی کا کیا قصور تھا۔ بچہ ہے تو بھوک لگے گی ہی۔ آدمی باہر کی آگ تو برداشت بھی کر لے، اندر کی آنچ نہیں سہی جاتی۔ بٹی کا دل بھی گر گیا۔ ماں نے پیار بھی کیا، وہ نہیں بولی تو نہیں بولی۔ بھائی اس کے چاروں طرف منڈلاتا رہا۔ وہ اسے نظر انداز کرتی رہی۔ گدگدی کر کے بلوانا چاہا پر بٹی نے اسے دھکیل کر ہٹا دیا۔ چپ چاپ اپنے اسکول کا کام کیا اور عین نین ہو گئی۔

چوں کہ بٹی بڑی تھی اور ماں کے ہاتھ سے خوب مار کھا چکی تھی، اس لیے ماں کا دل اسی میں اٹکا تھا۔ ماں کو اس دن ایک گھر سے مہینے کی پگار کے دس روپے ملے تھے۔ روپے ہاتھ میں آتے ہی اسے بٹی کا خیال آیا۔ اسے پراٹھے پسند تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ شش و پنج میں رہی۔ پراٹھے بنائے تو کئی دن کی روٹی یہ پراٹھے نگل جائیں گے۔ لیکن بٹیا کی شکل رہ رہ کر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی تھی۔ اس کا دل تڑپ اٹھتا تھا کہ اسے کسی طرح مسکراتے ہوئے دیکھے۔ بٹی کو جو بات لگ جاتی ہے تو لگ جاتی ہے، مشکل سے ہی نکلتی ہے۔ اس کی نظر میں بٹی کو مسکراتے ہوئے دیکھنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ اس نے چپ چاپ پراٹھے

بنانے کی تیاری کرلی۔ پراٹھے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ واپس لاسکتے تھے۔ تقریباً ایک کٹوری کھلا ڈالڈا خریدا۔ ڈیڑھ روپیہ اس میں چلا گیا۔ اس کا دل قدرے کسمسایا۔ سوکھے آلو اسے زیادہ پسند تھے لیکن اس نے گیلے آلو بنانے کا فیصلہ کیا۔ چار بڑے بڑے آلو خریدے۔ قریب قریب آٹھ آنے اس میں نکل گئے۔ آٹا خریدا۔ دس روپے میں سے صرف دو روپے بچے۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ سارے کا سارا آٹا پراٹھے میں ہی نہیں لگادے، گی تھوڑا بچالے گی۔

اس خریداری کے بعد اسے یہ بات ستانے لگی کہ ذرا سی بات کے لیے لگ بھگ مہینے بھر کی پوری طلب ہی پھونک دی۔ لیکن اپنی اس سوچ کے کواڑ اس نے زبردستی بند کیے اور ان سے پیٹھ اڑا کر کھڑی ہوگئی کہ کہیں پھر نہ کھل جائیں۔ اس کے باوجود اس کے کانوں میں لگاتار کوئی سرگوشی کررہا تھا: ایک وقت کے کھانے میں آٹھ روپے! تیرا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟ اس سرگوشی کی طرف سے بھی اس نے کانوں میں روئی ٹھونس لینے کی ٹھان لی۔ پھر دوسری بات اسے تنگ کرنے لگی۔ بچوں کا لاڈ پیار غریبوں کے لیے منع ہے، پاپ ہے۔ آدمی اپنے حق میں بھی گناہ کرتا ہے اور ان کے حق میں بھی۔ اس بات سے بھی اس نے منھ موڑ لیا اور تیزی سے چلنے لگی۔ چلتے چلتے شوہر کی حالت کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔ کتنا دوڑے، کتنا پیسہ کھلایا۔ ایک ایک چیز تک گروی ہوگئی۔ اس کڑکی میں روٹی کو ہم نہیں کھاتے، روٹی ہمیں کھاتی ہے۔ پراٹھوں کا منھ تو اور بھی بڑا ہوتا ہے۔

ماں نے گھر جاکر چپ چاپ آٹا گوندھا۔ سبزی بنائی۔ نام کے لیے تھوڑا سا گھی ڈالا کہ تھوڑی رونق آجائے۔ پراٹھے سینکتے وقت ذرا سا گھی چھوادیا۔ سب سے پہلے بٹی کو پکارا، پھر بٹو کو آواز لگائی۔ بٹو پہلے آ گیا۔ بٹی تھوڑا نخرے کے ساتھ آئی۔ شاید وہ نہ بھی آئی ہوتی لیکن پراٹھے سینکنے کی خوشبو نے معاً اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ پراٹھے بنتے دیکھ کر اس کی ساری ناراضگی مسکراہٹ میں بدل گئی۔ کنویں میں کانٹا ڈال کر جیسے ڈول نکالا جاتا ہے اسی طرح بٹیا کی ہنسی ماں کی خوشی کو بھی باہر نکال لائی۔ ماں نے پراٹھا سینکنا بند کرکے اسے کھینچ کر گلے سے لگالیا اور بنا کچھ کہے آنچل سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ بٹو ہنسے جارہا تھا، بٹی کو چڑا رہا تھا۔ ''اے بٹی دیدی، روز ماں سے پٹا کر۔ تجھے ماں کے گلے لگنے کو ملے گا اور ہمیں پراٹھے کھانے کو۔'' ماں نے ہنس کر اسے ڈپٹ دیا، ''چپ رے! بہت بولتا ہے۔''

چوں کہ بٹی بڑی بھی تھی اور ماں کے ہاتھ سے پٹی بھی تھی، ماں نے پہلا پراٹھا بٹی کے سامنے ہی پروسا۔ بٹو اس بات سے چڑ گیا اور بیٹھا بیٹھا غصے میں پیر چلانے لگا۔ زور زور سے رونا شروع کردیا۔ ''ہمیں روز مارتی ہے تو کچھ نہیں۔ اور دیدی کو ایک آدھ بار مار دیا تو اس کے لیے پراٹھے بننے شروع ہوگئے۔ دیدی کو ہی سب پوچھتے ہیں، ہمیں کوئی نہیں پوچھتا۔ ہم تو فالتو ہیں۔ جب ہم پہلے آئے تو پراٹھا دیدی کو پہلے

کیوں دیا؟'' ماں اسے سمجھاتی جارہی تھی، ''تو میرا بہت راجا بیٹا ہے۔ دیدی کا کیا؟ دیدی تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ تو تو میرے پاس ہی رہے گا۔ جانے والے کو کھلا پلا کر جلدی سے رخصت کر دینا چاہیے۔ دیدی چلی جائے گی تو دونوں ماں بیٹے روز پراٹھے بنا کر کھایا کریں گے۔'' لیکن بٹو ضد پر اڑا تھا۔ بٹی کا ہاتھ بار بار لقمہ توڑنے کے لیے بڑھتا تھا اور رک جاتا تھا۔ اس کا چہرہ مرجھاتا جارہا تھا اور کھسیاہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ آخر اس نے اپنا پراٹھا اٹھا کر اس کی طشتری میں ڈال دیا اور تیزی سے بولی، ''لے کھا، نگل!''

بٹو نے جھٹ سے رونا بند کیا اور پراٹھا کھانے میں جٹ گیا۔ کھاتے کھاتے وہ بٹی کی طرف دیکھتا جارہا تھا۔ حالاں کہ اس کی آنکھیں گیلی تھیں لیکن وہ ہنس رہا تھا۔ پراٹھا بناتے بناتے ماں اب اسے سمجھانے لگی تھی۔ ''اس کی بات کا برا مت مان۔ یہ تو سرے سے بگڑ گیا ہے۔ دن بھر ڈھور کی طرح گھومتا ہے۔ جس دن یہ اسکول جائے گا گنگا نہاؤں گی۔ اتنا جل ککڑ ہے کہ بہن کے منہ میں پانی کا گھونٹ تک جاتے نہیں دیکھ سکتا۔'' بٹو کھانے میں مگن تھا اور بٹی کو طرح طرح کا منہ بنا کر چڑا رہا تھا۔ ماں کی بات کا اس پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ماں نے اگلا پراٹھا بٹی کو پروس دیا۔ بٹی نے آنکھیں پونچھ کر پراٹھا کھانا شروع کر دیا۔ بٹی نے جیسے ہی کھانا شروع کیا، بٹو فوراً بولا، ''بٹی دیدی کو تم پراٹھے دو یا نہ دو، میں پیٹ بھر کر پراٹھے کھاؤں گا۔''

ماں کا چہرہ تھوڑا اتر گیا۔ آگ جل رہی تھی۔ پراٹھے سینکتے وقت خوب دھواں اٹھ رہا تھا۔ ماں پہلے اسے دیکھتی رہی، پھر بولی، ''زیادہ پراٹھے کھانے سے پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔ ٹٹیاں آنے لگتی ہیں۔ جن کو پراٹھے کھانے کی عادت ہوتی ہے ان کی بات اور ہوتی ہے۔ پراٹھے، وہ بھی گیہوں کے۔ ہضم کرنے کو فولاد کا پیٹ چاہیے۔ بس دو دو ملیں گے۔ باپو بھی تو کھائیں گے نا!'' بٹی نے ماں کی طرف دیکھا۔ گردن نیچی کر کے کھاتی رہی۔ ماں نے بھی بٹی کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

بٹی کا پہلا پراٹھا ختم ہو گیا تھا۔ توے پر پراٹھا سِک کر تیار تھا۔ بٹو کا پراٹھا بھی ختم ہو رہا تھا، ایک دو لقمے باقی تھے۔ ماں نے پراٹھا جلدی سے بٹی کی طشتری میں ڈال دیا۔ بٹی کی باچھیں کھل گئیں۔ بٹی نے گرمی کی پروا کی نہ ٹھنڈے کی، جلدی سے ٹکڑا توڑا، آلو کے پانی میں بھگویا اور کھانا چالو کر دیا۔ بٹو نے شور مچا دیا۔ ''پھر بٹی دیدی کو دے دیا! ہم بھی کھا چکے تھے۔'' ماں نے اسے جھڑکا، ''کچا ہی دے دوں کیا؟ سکتے ہی تو سکے گا۔'' پر وہ بڑبڑ کرتا رہا، ''جب ہمیں کوئی چاہتا ہی نہیں تو ہمیں بھگوان اپنے پاس کیوں نہیں بلا لیتا!'' ماں زور سے چلائی، ''اگر اب پھر ایسی بات کہی تو زبان پر گرم گرم چمٹا رکھ دوں گی۔ بھگوان کو بلانے کے لیے ہی تو ہڈیاں گلا گلا کر پال رہے ہیں تجھے۔'' پراٹھا سک گیا تھا، اسے اس کی رکابی میں رکھ دیا۔ بغیر ماں کی ڈانٹ کا خیال کیے بٹو پراٹھا کھانے میں لگ گیا۔

ماں کی نظر بار بار بٹیا پر جارہی تھی۔ آدھا پراٹھا تو اس نے جلدی جلدی کھایا تھا، اب وہ چھوٹے

چھوٹے ٹکڑے توڑ رہی تھی۔ اس طرح گویا وہ بچے ہوئے پراٹھے کو دیر تک کھانا چاہتی تھی۔ سبزی بھی وہ زیادہ نہیں لگا رہی تھی۔ زیادہ تر شوربے میں ہی ٹکڑا بھگوتی تھی۔ کبھی کبھی آلو کا ٹکڑا توڑ کر پراٹھے کے ٹکڑے کے ساتھ کھا لیتی تھی۔ بٹو جلدی جلدی کھا رہا تھا۔ وہ اگلا پراٹھا اٹھا لینے کے چکر میں تھا۔ اسے اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ ماں اگلا پراٹھا بھی دیدی کی طشتری میں نہ ڈال دے، اور اس کی چھٹی ہو جائے۔ اس بیچ ماں ایک پراٹھا سینک کر روٹی کی ٹوکری میں رکھ چکی تھی، دوسرا توے پر تھا اور تیسرا چکلے پر۔ پراٹھا ختم ہوتے ہی بٹی نے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے آنکھ چرالی۔ بٹو اپنا پراٹھا ختم کر کے تیسرے پراٹھے کے لیے ضد کرنے لگا۔ ماں بڑے تردد میں تھی، پھر بھی اس نے اسے سمجھانا چاہا۔ ''بس اور نہیں۔''

بٹو کیوں کہ چھوٹا اور ناسمجھ تھا، اس لیے ضدی بھی تھا۔ وہ اس پر بضد تھا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ پراٹھا ضرور لے گا۔ ماں کا دھیان بار بار ختم ہوتے آٹے اور گھی پر جا رہا تھا۔ پراٹھے بنانے میں یہی تو مصیبت ہوتی ہے۔ چاہے پیٹ بھر جائے، نیت نہیں بھرتی۔ آج سارا آٹا ختم کر دیا تو کل کا انتظام کہاں سے ہوگا؟ پھر ادھار۔ وہ بولی، ''جیبھ کی کھوائی پیٹ نہیں اَٹنے دیتی۔ اپنے پیٹ کی سمائی دیکھ۔'' ماں کی بات بٹو کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔ آخر ماں نے آٹے کی چھوٹی سی لوئی بنائی اور ایک چھوٹا سا پراٹھا بنا کر اسے دے دیا۔

''میرا چھوٹا سا بیٹا اور اس کا چھوٹا سا پراٹھا۔''

بٹی کھا تو چکی تھی مگر بیٹھی تھی۔ کٹوری میں تھوڑی سی سبزی بھی بچی تھی۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بول رہی تھی۔ ماں بار بار نظر بچا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ چار پراٹھے سک چکے تھے، پانچواں بیل رہی تھی۔ بٹو وہ پراٹھا بھی ہڑپ کر گیا تھا۔ وہ ماں سے ایک پراٹھا اور مانگنے لگا۔ اس بار ماں نے سختی سے ڈانٹ دیا۔ ''جاتا ہے یا بتاؤں؟''

مار نے کو بیلن اٹھایا تو وہ نو دو گیارہ ہو گیا۔ بٹی ہنس دی۔ ماں کو بھی ہنسی آ گئی۔ دھیرے سے بولی، ''بہت شیطان ہو گیا ہے!'' پھر دھیرے دھیرے سست ہوتی گئی اور دکھ بھرے لہجے میں بولی، ''ماں باپ کا نام اوڑھے سے کیا فائدہ جو بچوں کو پیٹ بھر روٹی بھی نہ دے سکے۔ بانجھ ہوتی تو دھیرج رہتا کہ نہیں ہوئے۔ اے بھگوان، بچے دے تو ایسا مت کر کہ بچے پراٹھے جیسی چھوٹی چیز کو ترس جائیں،'' اور آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔

بٹی چپ چاپ بیٹھی ماں کو دیکھ بھی رہی تھی اور بات بھی سن رہی تھی۔ پانچواں پراٹھا سک چکا تھا۔ اسے ماں نے ٹوکری میں رکھ دیا تو بٹی دھیرے سے بولی، ''آٹا تو بچا ہے۔ ایک اور بنا دو۔''

ماں تھوڑی دیر اسی طرح چکلہ بیلن پر ہاتھ رکھے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ توا خالی جلتا رہا۔ گھی لگا

ہونے کے سبب دھواں بھبھک کر اٹھ رہا تھا اور ماں کے منھ پر سے گذر رہا تھا۔ بٹی اپنے آپ ہی بولی، ''اس وقت نہیں کھاؤں گی، سویرے کے لیے رکھ دوں گی۔''

''ہم اتنے بڑے آدمی نہیں کہ بچوں کو ناشتہ کرا کے اسکول بھیجیں۔ دو وقت کی روٹی مل جائے تو بہت ہے۔ بار بار کھانے والے دوسروں کا حصہ بھی کھاتے ہیں۔ اپنے حصے پر ہی صبر کرنا چاہیے۔''

بٹی کا چہرہ اتر گیا۔ آلو کا بچا ہوا جھول پی کر وہ اٹھنے لگی۔ اس کے اٹھنے کے انداز سے لگا کہ اس کے گھٹنے اسے اٹھنے نہیں دے رہے ہیں۔ ماں اسے اٹھتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اٹھ کر چلنے لگی تو ماں نے اسے پکارا۔ ''سن!'' وہ لوٹ آئی۔ ماں نے پانچواں پراٹھا اٹھا کر اسے دے دیا۔ ''لے، بٹو کو مت بتانا۔ سوچا تھا تیرے باپو کو بھر پیٹ کھلا دوں گی۔ ویسے ان کی خوراک ہی اب کہاں رہی۔ پانچ تو بہت ہیں۔ چار ہی کھا لیں تو غنیمت ہے۔''

بٹی دوڑی دوڑی گئی اور کاغذ لا کر اس میں لپیٹ لیا۔ جس کوٹھری میں سب سوتے تھے، دبے پاؤں گئی اور پراٹھے کو چھپانے کی تدبیر کرنے لگی۔ زمین پر بستر بچھے تھے۔ بستر کیا، گدڑی ہی تھی۔ اس نے ہوشیاری سے چاروں طرف دیکھا، بٹو آس پاس کہیں نہیں تھا۔ جس طرف وہ سوتی تھی وہاں اس نے کاغذ میں لپٹا پراٹھا ٹھونس دیا۔ تھوڑی دیر اس پر بیٹھی رہی۔ اسے بیٹھے بیٹھے ہی محسوس ہوا کہ پراٹھا ابھی گرم ہے۔ کل صبح اسکول جاتے ہوئے کھا کر جائے گی۔ اگر گرم نہیں بھی رہا تو ملائم تو رہے گا۔ پراٹھا کھا کر جانے میں کتنا مزہ آئے گا۔ کوئی کہے گا بھی کہ کچھ کھا لو تو کہہ دوں گی کہ گھر سے کھا کر آئی ہوں۔ پھر رک کر بدبدائی، آدھا اس کے لیے لے جاؤں گی۔ طعنہ دیتا تھا، کبھی کھلایا بھی کرو۔ پر آدھے کا کیا لے جانا! تو پھر پورا لے جاؤں گی۔ اس نے دوبارہ گدڑی اٹھا کر دیکھا۔ پراٹھا کاغذ میں لپٹا جوں کا توں رکھا تھا۔ اس کا دل نہیں مانا۔ اس نے اسے نکال لیا۔ کاغذ ہٹا کر دیکھا، چکنا ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیا سوجھا کہ ایک طرف سے توڑ کر چٹ سے کھا گئی۔ روکھا ہی مزہ دیتا ہے، بے کار ہی لوگ پراٹھا سبزی سے کھاتے ہیں۔ باقی اس نے کاغذ میں جلدی سے لپیٹا اور پھر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر وہ بغیر منھ چلائے اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہی، پھر دھیرے دھیرے منھ چلانا شروع کیا۔ کافی دیر تک اسی طرح چلاتی رہی۔

بٹو ماں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اسے پھر بھوک لگی تھی۔ ماں اسے ڈانٹ رہی تھی۔

باپو آنے والے تھے۔ باپو شام کو لیمن جوس وغیرہ کی چھوٹی سی دکان لے کر سڑک کے کنارے بوریے پر بیٹھ جاتے تھے۔ آٹھ دس آنے مل گئے تو مل گئے، نہیں تو ڈبا اور بوریا لے کر آٹھ بجے تک گھر آ جاتے تھے۔ باپو کے آنے کے وقت بٹی باہر نکل کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ جیسے ہی انھیں آتا دیکھتی تھی، ویسے ہی آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے سامان لے لیتی تھی۔ اس دن باپو تھوڑا جلدی آ گئے۔ وہ باہر جا کر سامان نہیں

لے پائی۔ باپو نے آتے ہی پوچھا:

''آج بٹی کہیں گئی ہے کیا؟''

''نہیں تو،'' ماں نے کہا۔

باپو خود ہی بولے،'' لگتا ہے میں ہی آج جلدی آ گیا۔'' ماں نے کہا تو کچھ نہیں لیکن ہنس دی۔

باپو ہاتھ پیر دھونے میں لگ گئے۔ بٹی نے جلدی سے تختہ بچھا کر لوٹا اور تھالی سجا دی۔ دل ہی دل میں سوچتی رہی کہ باپو کو بھی پراٹھے پسند ہیں۔ پراٹھے دیکھ کر باپو بہت خوش ہوں گے۔ مل میں کام کرتے تھے تو تیسرے چوتھے دن پراٹھے بنوایا کرتے تھے۔ اچار کے ساتھ پراٹھا کھانا انھیں بہت اچھا لگتا تھا۔ تب ماں اچار بھی ڈال دیتی تھی۔ اب تو کبھی کبھار کام والے گھروں سے دو چار پھانکیں مانگ لاتی ہے۔

باپو کھانے بیٹھے۔ ماں نے سبزی اور پراٹھے پروسے تو اس کی آنکھوں میں خوشی جھلکی پڑ رہی تھی لیکن باپو کو اپنی طرف بجھی بجھی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پا کر اس کی خوشی دوپہر بعد کی دھوپ کی طرح سمٹتی چلی گئی۔ باپو دھیرے سے بولے،''بٹی کی ماں...'' جملے کو ادھورا چھوڑ کر وہ کھانے میں لگ گئے۔ کھاتے کھاتے بولے،''بہت گھی لگ گیا ہوگا... پراٹھا کم بخت بہت گھی پیتا ہے۔ پانی میں بن سکتا تو سب کے منھ پڑ جاتا۔''

تھوڑی دیر بعد پھر پوچھا،''بچوں نے کھائے یا نہیں؟'' ماں نے گردن ہلا دی۔

جب دو چار لقمے لے لیے تو ماں نے بتانا شروع کیا۔''آج بٹی کو مار دیا۔ اس کی غلطی بھی نہیں تھی۔ بچے کو بھوک لگی ہو اور کھانے کو نہ ملے تو چلائے گا نہیں؟ وہ الٹا سیدھا بول گئی۔ بول کیا گئی، بھوک نے بلوا دیا۔ میں مار بیٹھی۔ بہت روئی بیچاری۔ رمی بابو کی بہو جی نے مہینے کے دس روپے دیے تھے۔ بہت روکا پر دل نہیں مانا۔ سوچا تمھیں بھی اچھے لگتے ہیں۔ بٹی اور بٹو بھی چاؤ سے کھاتے ہیں۔ ہمت کر کے جگاڑ بٹھا ہی دیا۔'' باپو چپ چاپ کھاتے رہے۔ چوتھا پراٹھا بھی انھوں نے لے لیا۔ کھا کر اٹھے تو دھیرے سے بولے، ''دیکھو آج کے یہ پراٹھے کتنے دن تک سہارا دیتے ہیں،'' اور ہلکی سی ہنسی ہنس دیے۔

''تم نے نہیں کھایا؟'' ہاتھ دھو کر باپو نے پوچھا۔

''سویرے سے پیٹ نرم تھا، اس لیے بھات ڈال دیا ہے۔''

باپو نے ماں کی طرف دیکھا اور باہر نکل گئے۔ بٹو سو گیا تھا۔ بٹی غٹر غٹر سب دیکھ رہی تھی۔

اگلے دن صبح باپو چوکیداری سے تھوڑی دیر ہوئے لوٹے تھے۔ اصل چوکیداری کا وقت تو پانچ ساڑھے پانچ بجے کا ہی تھا۔ آج کل پانچ بجے دن نکل آتا تھا۔ جن گھروں کی چوکیداری کرتے تھے، ان میں سے کوئی دودھ لانے کو کہہ دیتا تھا تو کوئی چائے کی پتی منگانے بھیج دیتا تھا۔ اس بہانے باپو کو بھی دو

گھونٹ چائے مل جاتی تھی۔ کبھی کبھی باسی کوسی کھانا بھی دے دیتے تھے۔ کھانا باپو وہاں نہیں کھاتے تھے، گھر لے آتے تھے۔ ماں کو سویرے ہی چھ بجے سے پہلے گھروں کا کام نپٹانے کے لیے نکل جانا ہوتا تھا۔ بٹی اپنے آپ ہی تیار ہو کر جاتی تھی۔ بٹو یا تو سوتا رہتا تھا یا پھر اٹھ کر بہن سے جھگڑا کرتا تھا، ''بھوک لگی ہے۔'' باپو اگر وقت سے آجاتے تو چائے واے مل جاتی تھی، نہیں تو بٹی سات بجے تک بٹو کو گھر چھوڑ کر اسکول چلی جاتی تھی۔ اسکول جانا اسے پسند تھا۔ وہاں اسے کھلا پن لگتا تھا۔

بٹی صبح جلدی اٹھ گئی۔ اٹھتے ہی اس نے سب سے پہلے بستر ہٹا کر پراٹھا دیکھا۔ کاغذ میں لپٹا رکھا تھا۔ اس نے زیادہ ٹوہ نہیں کی، رکھا دیکھ کر مطمئن ہوگئی۔ ٹٹی کے لیے چلی گئی۔ ٹٹی کے لیے اسے تھوڑا دور جانا پڑتا تھا۔ بم پولیس کی ٹٹیوں میں تو سویرے بھیڑ لگی ہوتی تھی، اسی لیے فارغ ہونے گھاٹ پر چلی جاتی۔ بٹو تو وہیں نالی کے کنارے بیٹھ کر پھر لیتا تھا۔ بٹی اب تھوڑی بڑی ہو چلی تھی۔ لوٹ کر وہ جلدی جلدی نہائی۔ کتابیں جمع کیں۔ وہ اپنے اس فیصلے سے خوش تھی کہ چاہے اسے خود آج کھانے کو ملے نہ ملے، وہ دوست کو ضرور پراٹھا کھلا کر چھوڑے گی۔ اس دن اس نے ایسی بات کیوں کہی تھی؟ اس نے بٹو کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے سو رہا تھا۔ بہت سنبھل کر اس نے بستر ہٹایا۔ پراٹھا گم تھا۔ صرف کاغذ پڑا تھا۔ اس نے سوچا، ہوسکتا ہے پراٹھا نیچے کھسک گیا ہو۔ اس نے پورے کا پورا بستر پلٹ دیا۔ پراٹھا واقعی غائب تھا۔ کہاں چلا گیا؟ کون لے گیا؟ اس کی نظر بٹو پر گئی۔ وہ نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی اس نے آنکھیں کس کر بند کرلیں اور جیسے گہری نیند میں سو گیا۔

بٹی کو لگا جیسے اسے کسی نے بجلی کا کرنٹ چھوا دیا ہو۔ اس نے پوچھا، ''میرا پراٹھا تو نے کھایا؟'' وہ سوتا ہوا بنا رہا۔ وہ اس کے پاس گئی اور زور زور سے اسے ہلانے لگی۔ اس نے آنکھیں کھول کر بٹی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے نیند میں ہو، اور آنکھیں بھینچ لیں۔

بٹی بار بار چلا رہی تھی، ''بولتا کیوں نہیں؟... تو نے میرا پراٹھا کھایا؟ بول، بول، بول!'' اس نے اس کے بال پکڑ کر کھینچنے شروع کر دیے۔ بال کھینچے تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ پوری طرح روہانسا ہو گیا تھا۔

''بتا؟ پراٹھا کہاں گیا؟'' وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔ ''بول! بول تو نے میرا پراٹھا کیوں کھایا؟'' وہ دھیرے سے بولا، ''بھوک لگی تھی دیدی۔''

بٹی کو اور زور سے غصہ آ گیا۔ وہ اس کے اوپر چڑھ بیٹھی اور اس کی گردن پکڑ کر مارنے لگی۔ بٹو کو روتے روتے کھانسی آنے لگی، لیکن وہ رکی نہیں۔ باپو آ رہے تھے۔ ان کے ڈنڈے کی آواز دور سے سنائی دینے لگتی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر اٹھ گئی۔ اٹھ کر بٹو کی طرف دیکھا۔ بٹو کی زبان تھوڑی باہر نکل آئی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا اور زبان کو اندر کرنے میں لگ گئی۔

سنجے کھاتی

ہندی سے ترجمہ: اجمل کمال

پنٹی کا صابن

ہمارے گاؤں میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ صابن کا نام ہم نے اور دوسرے لوگوں نے سنا ضرور تھا لیکن دو چار ہی لوگ ایسے ملیں گے جنھوں نے اسے سچ مچ میں دیکھا ہو۔ صابن کا نام بھی لوگوں کو معلوم تھا تو صرف کچھ فوجیوں کی بدولت۔ اور تھوڑا اس لیے بھی کہ جب ایک بار ڈپٹی صاحب کی بیٹی پنٹی گاؤں آئی تھی تو اس کے پاس کچھ عورتوں نے یہ چیز دیکھی تھی۔ کہتے ہیں کہ پنٹی جہاں کھڑی تھی اس سے ایک کوس دور تک پھولوں کی سی خوشبو مہکتی تھی۔ دس پندرہ سال بعد بھی لوگوں کو وہ پنٹی یاد رہی تو اسی وجہ سے۔ لوگ صابن کا ذکر عطر اور چمیلی کے بعد کرتے تھے۔

پنٹی تو خیر کسی دوسری دنیا سے آیا جاندار تھی۔ گاؤں کے کسی آدمی کے پاس کبھی صابن نہیں دیکھا گیا۔ صحیح معنوں میں گاؤں میں پہلا صابن آیا میرے پاس۔ اور وہ بھی اچانک، غیر متوقع طور پر۔

اُس دن پندرہ اگست یا ایسا ہی کوئی خاص دن رہا ہوگا کیوں کہ اسکول بند تھا۔ میں اور کاکا آلو بیچنے کے لیے کئی کوس چل کر قصبے میں آئے تھے۔ کاکا مجھ سے پانچ سات سال ہی بڑا ہوگا۔ ہم دونوں لگ بھگ دوست جیسے ہی تھے۔ حالانکہ کبھی کبھی اسے بڑپّن دکھانے کا جوش چڑھتا تھا، لیکن اس کا کوئی دبدبہ مجھ پر نہیں بن پایا۔

تو قصبے کی رونق سے مسحور ہم لوگ لیمن چوس چاٹتے بھٹک رہے تھے کہ ایک بھیڑ بھرے میدان میں جا پہنچے۔ وہاں بالکل میلہ سا لگا تھا۔ خوب شور ہو رہا تھا۔ سیٹیاں بج رہی تھیں۔ ایک بھونپو سے کسی آدمی کی زوردار آواز آ رہی تھی جیسے ڈانٹ رہا ہو۔

ہم بوکھلائے سے اور بالکل بے دھیانی میں اس بھیڑ سے گھسے جا رہے تھے کہ اچانک میں نے پایا

میں اپنے جیسے لڑکوں کی ایک قطار میں کھڑا ہوں۔ کسی نے بانہہ پکڑ کر جلدی میں مجھے وہاں کھڑا کر دیا تھا۔ ایک آدمی سب کو سفید لائن میں کھڑا کر رہا تھا۔ میرے دونوں طرف لڑکے چلّا رہے تھے، جھپٹنے کے انداز میں بار بار ایک ٹانگ پر جھک رہے تھے۔ لگا جیسے کوئی دوڑ ہونے جا رہی ہو۔

پہلے تو میں گھبرا ہی گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو کاکا کہیں پتا ہی نہیں۔ لاٹھی والوں نے باقی بھیڑ کے ساتھ اُسے بھی دھکیا دیا ہوگا۔ اب بھونپو پر گنتی گنی جا رہی تھی۔ ایک... دو...

اور تین! بھوکے جانوروں کی طرح سب بھاگے۔ ساتھ میں مَیں بھی۔ پہلے تو کچھ سوجھا ہی نہیں، پر جب دیکھا کہ بغل والا چھوکرا اپنی سینکیا ٹانگیں پٹکتا آگے نکلا جا رہا ہے تو میں بھی بھاگ لیا دم توڑ کر۔ ایسا کہ میدان کے دوسرے چھور پر بندھی رسی سے اُلجھ کر گر پڑا۔ گھٹنے میں لگی سو الگ۔ جھاڑ کر کھڑا ہوا تو تالیاں بجنے لگیں۔ کسی نے میرے ہاتھ میں لال چمچماتی ڈبیا تھما دی۔

بھیڑ میں جانے کہاں سے کاکا ہنستا ہوا نمودار ہو گیا۔ اب ہم دونوں ساتھ ساتھ ہنسے جا رہے تھے۔ میرا من ہو رہا تھا کہ ابھی خوب دوڑوں۔ دوڑتا ہی جاؤں۔ آگے آگے قلانچ مارتا میں بھاگا تو کاکا بھی ہانپتا ہوا آیا پیچھے پیچھے۔ قصبہ پیچھے چھوٹ گیا۔ میں گاؤں کی طرف سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔ کاکا آواز دینے لگا۔ آخر میں ندی کے پاس میں رکا تو اس نے مجھے پکڑ لیا۔

کاکا نے کہا، ''کیا ہے رے؟''

تب جا کر مجھے خیال آیا کہ وہ لال چمکدار ڈبیا میرے ہاتھ میں ہے۔ کاکا نے جھٹ اسے چھین لیا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اُسی کو سب سے پہلے سُوجھا کہ یہ تو صابن ہے۔ اس کا چہرہ جوش سے چمکنے لگا تھا۔ وہ بار بار اسے سونگھتا۔ مانگنے پر بھی نہ دیتا۔ چڑ کر بولتا، ''کھا نہیں رہا ہوں۔'' اس کی نیت میں کھوٹ لگتا تھا۔

میں بھڑک گیا۔ آخر وہ میری چیز تھی۔ میں نے کاکا سے اسے چھیننے کی کوشش کی۔ اُسے گرانے کے لیے زور لگایا۔ لیکن اُس لمبے کھڑوس سے جیتنا میرے لیے ناممکن ہی تھا۔ اب تک اُس نے باہر کی چمکیلی پنّی بھی کھول دی تھی اور اندر کی گلابی نازک ٹکیا نکال لی تھی۔

آخری ہتھیار کے طور پر میں دھپ سے ندی کے پتھروں پر گر گیا۔ دہاڑ مار کر سچ مچ رونے لگا۔

''میں ایجا سے کہہ دوں گا، ہاں...''

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی میری چال کامیاب ہوئی۔ کاکا کچھ دیر مجھے لال آنکھوں سے گھورتا رہا، پھر ''جا، مر!'' کہہ کر ٹکیا پھینک دی۔ میں نے اُسے لپک لیا۔ ''پنّی بھی دے!'' کاکا نے پنی بھی پھینک دی۔ میں نے نازک ٹکیا کو پھر پنی میں جتن سے لپیٹا اور اسے سونگھتا، ہنستا ہوا گھر کی طرف چلا۔

کاکا سے گہری دشمنی کی یہ شروعات تھی۔ اُس وقت تو میں صابن کی اس بھینی خوشبو میں اتنا مگن تھا

کہ کاکا کی طرف دھیان دینے کا وقت نہیں تھا میرے پاس، لیکن آگے چل کر ہم دونوں کی دشمنی مستقل بات ہوگئی۔

بہرحال اُس شام کاکا پیچھے پیچھے، پتھروں کو ٹھوکر مارتا ہوا چلا۔ گھر پہنچتے ہی منہ ٹیڑھا کر، اس نے اعلانیہ انداز میں کہا، ''گوپے کو ایک صابن کیا مل گیا، نیچے ہی نہیں دیکھ رہا آج۔''

ایجا گوبر سمیٹ رہی تھی۔ کھڑی ہو کر بولی، ''صابن! کہاں سے لایا رے؟ کیسا ہے؟ دِکھا تو!''

''میرا ہے!'' میں نے تنک کر کہا۔

ایجا ہاتھ خوب صاف سے دھو کر آئی۔ ''دکھا تو۔ میں بھی دیکھوں کیسا صابن ہے۔''

مجھے اب تک کسی پر اعتبار نہیں رہ گیا تھا۔ بہت نخرے کے ساتھ انگلیاں کھولیں۔ ایجا نے بڑے شوق کے ساتھ صابن لیا۔ ڈبری کے پاس لے جا کر غور سے دیکھا۔ دو تین بار سونگھا، بولی، ''میں نہاؤں گی اس سے۔''

میں چیل کی طرح جھپٹا۔ صابن جھپٹ کر اندر کی جیب میں ٹھونسا۔ بھاگ کر کھڑا ہوا بیس قدم دور۔ ایجا دیکھتی رہ گئی۔ ''مرتُو! آگ لگے تیرے صابن کو!'' اس نے چیخا کر کہا اور آنکھیں تریرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

اس طرح ماں میری دوسری دشمن بنی۔ اصل میں صابن کی اس اہمیت کو میں پہلے سمجھ ہی نہیں پایا۔ شاید سمجھنے کی عمر تھی بھی نہیں۔ لیکن جلد ہی مجھے لگنے لگا کہ مانو میں چاروں طرف سے دشمنوں میں گھر گیا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کاکا میری ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ گھر میں جتنے بھی کنستر ڈبے ہیں، سب کو اس نے ٹٹولا ہے۔ یہاں تک کہ گوشالا کی گھاس پوال کو بھی وہ چھان آیا ہے۔ لیکن صابن کہاں ہے، میرے سوا کوئی نہیں جان سکا تھا۔

ہار کر کاکا نے میری چاپلوسی کرنے کی بھی کوشش کی۔ لیکن اب میں اتنا بھولا نہیں رہ گیا تھا۔

باپو کو تو صابن دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوا۔ ایجا اور کاکا نے ہر وقت صابن کا ذکر کر کے ان کو اتنا اُکسا دیا تھا کہ وہ مار پیٹ پر اتر آئے۔ پر اب تک میں نے جان لیا تھا کہ جو بھی صابن دیکھ لے گا اس کی نیت میں کھوٹ آجائے گا، سو میں بھی ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ہار کر باپو نے یہ کہتے ہوئے کہ ''بہت عطر پھلیل کا شوق چڑھا ہے، بھیج دو سالے کو گیا چرانے!'' مجھے کس کر دو لاتیں ماریں۔

میں رویا نہیں اور اس توہین کو پی گیا۔ لیکن اس گھڑی سے مجھے شبہ ہونے لگا کہ میں ان کا اصلی بیٹا ہوں بھی یا نہیں۔

کُنتی کو البتہ ایک دن میری سخت پہرے داری میں صابن کو چھو سونگھ کر دیکھنے کا موقع ملا۔ کنتی تب

سے آنکھیں بڑی بڑی کیے میرے پیچھے پیچھے ڈولتی رہتی ہے۔ اسے بھگانے کے لیے جھانپڑوں کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

اتنے لوگوں کے بیچ صابن کو بار بار دیکھ پانا میرے لیے بھی مشکل ہو رہا تھا۔ میری بے چینی لگاتار بڑھ رہی تھی۔ ہر دن پہاڑ سا لگتا۔ آخر کار اتوار کو جی کڑا کر کے، میں نے صابن نکال ہی لیا اور گرم پانی لے کر نہانے بیٹھا۔

یہ صابن سے میرا پہلا اشنان ہونے جا رہا تھا۔ میں نے بڑے پیار سے پنّی الگ کی۔ احتیاط سے دھوپ میں رکھی۔ صابن کو نرمی سے دائیں ہاتھ میں پکڑا۔ اور بھیگے بالوں کو ہولے ہولے چھوا۔

گلابی ٹکیا پر اُبھرے ہوئے حروف بنے تھے۔ مجھے انگریزی پڑھنی نہیں آتی تھی، لیکن یہ جو کچھ بھی لکھا تھا، اس سے صابن کی خوب صورتی بڑھ رہی تھی۔ وہ مٹیں نہیں، اس کا خیال رکھنا تھا۔

کاکا کہنے کو تو چاکھ میں بیٹھا پڑھائی کر رہا تھا، لیکن بار بار اس کا سر کھڑکی سے دکھائی دے جاتا۔ پھر زور زور سے کتاب پڑھنے کی آواز آتی۔ ایجا گھاس کو جاتی بیچ آنگن میں رک گئی۔ کچھ دیر دیکھتی رہی۔ پھر منھ بچکا کر چلی گئی۔ کنتی دو قدم دور آ کر کھڑی ہو گئی اور میرے بالوں پر پھسلتے صابن کو، اس سے بنتے سفید جھاگ کو اور دھوپ میں چمکتے کئی رنگوں کے بلبلوں کو ایک ٹک دیکھتی رہی۔ ''بھاگ! بھاگ!'' میں چلّایا۔

کنتی منت کرنے لگی۔ ''دادا، مجھے بھی دے دے تھوڑا سا۔''

کنتی کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ بلی کی طرح مکار۔ اُسے بھگانے میں ہی بھلائی تھی۔ پہلے تو میں نے اس پر پانی پھینکا۔ نہیں ہٹی تو بھیگے ہاتھ سے دیا ایک جھانپڑ۔ اِدھر چلّاتی ہوئی کنتی بھاگی، اُدھر سیڑھیوں پر دھڑ دھڑاتا ہوا آیا کاکا۔ ''اس پر ہاتھ چلایا تُو نے؟ آج تو تیری خیر نہیں!'' پر منڈیر سے آگے نہیں بڑھا۔ وہیں رک کر گھورنے لگا۔ میں بہت دور تھا وہاں سے۔ مزے سے ہنستا جھاگ اٹھاتا رہا۔ کاکا گالیاں دیتا رہا لیکن وہاں سے ہٹا بھی نہیں۔

بڑی دیر لگا کر پانی ڈالا بدن پر۔ صابن کو سُکھایا۔ نامعلوم سا گھِسا تھا۔ پنّی میں سنبھال کر رکھا۔ اِتراتا ہوا کاکا کی بغل سے نکلا۔ کاکا نے ہوا کو سونگھا۔

کیسی تو تازگی آ گئی تھی بدن میں۔ کیسی خوشبو! اور بال کیسے نرم! خوشبو کہیں اُڑ نہ جائے، یہ سوچ کر فٹافٹ کپڑے پہنے۔

اپنے آنگن کی منڈیر سے میں چھلانگ لگاتا اور کئی بار ایسا ہوتا کہ میں اُڑنے لگتا۔ اونچے، اور اونچے، پہاڑوں جنگلوں کے اوپر میں کبوتروں کی طرح تیرتا جاتا۔ دور دور تک جانے کتنے دیس، کتنے گاؤں ایک ساتھ میرے نیچے سرکتے جاتے۔ بدن میں سنسنی سی ہونے لگتی۔ نیچے دیکھتا تو اپنا گھر چھوٹا سا دکھائی

دیتا، کھلونے جیسا۔ اور ایجا، باپو، کاکا، کنتی، اور لوگ ایسے دکھائی دیتے جیسے چیونٹی جتنے ہو گئے ہوں۔ میں ساری دنیا کے اوپر تیرتا۔ سب کچھ میرے نیچے۔ کوئی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

یہ سپنوں کی بات تھی، کہتے ہیں کہ بڑھوار کے دنوں میں بچوں کو اُڑنے کے سپنے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن سپنے سچ نہیں ہوتے، یہ کس نے کہا!

صابن سے نہا کر اُس دن مجھے لگا تھا، کسی بھی پل مَیں اڑنے لگوں گا۔

اسکول کا دن تھا۔ صبح صبح خوب جھاگ اٹھا کر خود کو چمکایا۔ مہکتے بدن پر سب سے اچھے کپڑے ڈالے۔ ٹیڑھی کر کے مانگ نکالی اور راستے بھر کہنی اٹھا کر سونگھتا رہا کہ کہیں خوشبو اُڑ تو نہیں گئی۔ نہیں، خوشبو اُڑتی نہیں تھی۔ گھنٹوں آتی رہتی۔ اگر دھوپ نہ ہوتی، پسینہ نہ ہوتا، دُھول نہ اڑتی اور ہوا نہ چلتی تو شاید بدن ہمیشہ مہکتا رہتا۔

کلاس میں تو سنسنی ہی پھیل گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں سب لڑکے ناک اٹھائے، بورائے سے، ہوا کو سونگھ رہے تھے۔ میں کچھ دیر مند مند مسکراتا اس کا آنند لیتا رہا، پھر پاس والے لڑکے کے منھ پر اپنی بانہہ اڑا دی۔

''او بابا، ہوا! کیا لگا کے آیا ہے؟'' لڑکا تو اچھل ہی پڑا۔ کلاس میں ایسی ریل پیل مچی کہ توبہ! لڑکے ایک دوسرے کو دھکیاتے لپکے اور جہاں تہاں ناک گڑا کر لگے سونگھنے۔ جو سونگھ چکے وہ آنکھیں ماتھے پر چڑھا کر کہنے لگے، ''بتا تو! بتا تو!''

اور جب میں نے مزے لے لے کر ساری کہانی سنائی تو کلاس میں شور مچ گیا۔ سچ؟ کیسا ہے؟ ساتھ میں پنّی بھی ہے؟ ایک دن تو ختم ہو جائے گا، پھر؟ پھر کیا؟ اور دوڑے گا تو نیا جیت لائے گا۔ ایک سال تو چلے گا ہی۔ دکھا یار، دکھا نا!

ماس ساب آئے تو ہنگامہ تھما۔ لیکن کسی کا دھیان پڑھائی کی طرف نہیں تھا۔ سب کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں تو آکاش میں خوب اونچا اُڑ رہا تھا۔ اگر اس پل میں کہہ دیتا کہ آج سے مانیٹر مَیں ہوا تو وہ سب کہتے، ہاں ہُوا! انھوں نے اپنے باپ دادا سے اتنا کچھ سنا تھا پنّی کے بارے میں، اس کے صابن کے بارے میں۔ آج وہ سب سپنے جیسی کتھائیں سچ ہوتی دیکھ، وہ لگ بھگ پاگل سے ہوا ٹھے تھے۔

ہاف ٹائم کی گھنٹی بجی۔ ہمیشہ کی طرح بھاگ پڑنے کو لڑکے اٹھے۔ اچانک سب کے سب ٹھٹک گئے۔ میں وہیں بیٹھا جو تھا، اپنی جگہ۔ ''چل رے چل!'' آج سب میرے قریب آنا چاہتے تھے۔ وہ بھی جو میرے دشمن تھے اور میرے دبلے پتلے پن کی وجہ سے مجھے پیٹا کرتے تھے۔

میں اٹھا تو، لیکن ایک انجانی سی جھجک نے مجھے گھیر لیا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پہلے تو سب سے

پہلے بھاگ اٹھنے والوں میں میں اول رہتا تھا۔لیکن پہلے کبھی سارے لڑکوں نے مجھے گھیر کر ایسے ''چل! چل!'' بھی نہیں کہا تھا۔

''تو ہماری طرف ہوا۔'' ''نہیں ہماری طرف ۔'' کبڈی میں میں کس ٹیم کے ساتھ کھیلوں، اس بات پر بھاری جھگڑا چل پڑا تھا۔

میں تو گھبراہٹ سے مرا جا رہا تھا۔کبڈی میں رگیدے جانے کا، مٹی میں لپٹنے کا ڈر مجھ پر حاوی ہو گیا۔''نہیں، میرا من نہیں ہے کھیلنے کا،'' میں نے کہا۔

''کیوں؟ کیوں؟'' ہر طرف سے پکار مچ گئی۔ پھر آپ ہی جیسے سب لڑکے سمجھ گئے۔''اچھا، تو ریفری ہوا۔'' وہ ایک ایک کر کھسکنے لگے، کھسیائے ہوئے۔

ہر کوئی صابن دیکھنے کو بے کل تھا۔سارے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح وہ بات پھیل گئی تھی۔ لوگ مجھے روک لیتے۔کوئی بہانہ کھوج کر گھر چلے آتے۔وہ چاہتے کہ میں ان کو صابن دکھا دوں۔جب میں انکار کر دیتا تو وہ ناراض ہو جاتے۔ڈانٹ ڈپٹ کرتے۔البتہ وہ مجھے سونگھ ضرور لیتے۔صابن نہ دکھانے کی میری اس ضد سے گھر والوں کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ بعد میں مجھے وہ اپنی گالیوں کا نشانہ بناتے۔کاکا جب بھی سامنے آتا دھمکی بھرے اشارے کرتا۔دو ایک بار تو اس نے اکیلے میں میرا گلا بھی دبایا۔کنتی ہمیشہ منھ پھلائے رہتی۔اس سے میری جھڑپ ہو جائے تو باپو مجھے اپنے ڈھائی کلو کے ہاتھ سے جھانپڑ مارنے میں ذرا بھی دیر نہ کرتے۔ایجا مجھ سے ہمیشہ چڑ چڑا کر بات کرتی۔

ساری دنیا گِدھوں کی طرح میرے اس چھوٹے سے سکھ کو نوچنے کے لیے بے تاب تھی۔میں نے دیکھا کہ پہلے تو لوگ میری عزت کرنے لگتے، لیکن جب میں ان کو صابن نہ دکھاتا تو وہ فوراً میرے خلاف صف بندی کر لیتے۔لگ بھگ سبھی میرے دشمن ہو چکے تھے۔

لوگوں نے میرا نام ہی پنٹی رکھ دیا تھا۔ یہ صرف مذاق نہیں تھا۔اس طرح وہ اپنی نفرت جتا رہے ہوتے۔لڑکے مجھے پنٹی پنٹی کہہ کر پکارتے۔اور حیرانی کی بات تو یہ کہ اس بات سے مجھے تکلیف ہونے کے باوجود میں اکثر اس پنٹی کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔میں اکثر سوچتا کہ وہ کیسی اور کہاں ہوگی۔میں نے ذہن میں اس کا ایک خاکہ بھی کھینچ لیا تھا جس پر میں اپنے خالی وقت میں رنگ بھرا کرتا تھا۔میرے خیال سے وہ ہمارے کیلنڈر کی لکشمی جیسی تھی۔وہ اتنی گوری تھی اور اس کے کپڑے اتنے چمکیلے تھے کہ رات میں بھی اس کے آس پاس اجالا رہتا تھا۔اس پر دھول کا ایک ذرہ بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔وہ اتنی ہلکی تھی مانو اسے سفید کورے کاغذ سے بنایا گیا ہو۔

اور کھیلنا تو میں نے چھوڑ ہی دیا تھا۔کچھ لڑکے میرے قریب ہونا چاہتے لیکن جلدی ہی دھما چوکڑی

کی کشش ان کو کھینچ لے جاتی۔ جب لڑکے ہڑدنگ مچا رہے ہوتے تب میں دیوار پر بیٹھا ٹانگیں ہلاتا رہتا۔ وہ کبڈی میں ایک دوسرے کو رگیدتے، گیلے کھیتوں میں گھس کر ککڑیاں کھوجتے، چوری سے نیبو توڑ لاتے، ندی میں ننگے ہو کر نہاتے، کیچڑ میں پھسلتے تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح چیختے چلاتے، گتھم گتھا ہوتے، کپڑے پھاڑ لیتے یا بدن چھلا لیتے۔ میں بیٹھے بیٹھے ان کو دیکھتا اور انگلیاں چٹخاتا۔

سچ کہوں تو کئی بار میری خواہش ہوئی کہ میں ان کے بیچ کود پڑوں۔ لیکن جب بھی میں ایسا کرنے کو ہوا، جانے کس بات نے میرے جسم کو ساکت کر دیا۔ تب میں نے چاہا کہ کوئی لڑکا مجھے جبراً گھسیٹ کر کبڈی کے میدان میں دھکیل دے، لیکن شاید یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تو اب مجھ سے کھیلنے کو کہتے بھی نہیں تھے۔ انھوں نے مان لیا تھا کہ پنٹی کا کام بیٹھ کر دیکھتے رہنا ہے۔ وہ میرے وجود کو ہی بھولنے لگے تھے۔

اب پھر کا کا بازار جا رہا تھا۔ سامان لانے کے لیے تھیلے جھولے سمیٹ رہا تھا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا، کہا، میں بھی چلوں گا۔

کا کا ایک دم بھڑک گیا۔ ''تو نہیں جائے گا میرے ساتھ۔''

''میں جاؤں گا۔''

''بھابی،'' کا کا نے اعلان کیا، ''اسی سے منگا لے اپنا سامان۔ میں نہیں جا رہا۔''

ایجا شیرنی کی طرح جھپٹتی آئی۔ میرا کان پکڑ کر مجھے پٹک دیا زمین پر۔ ''آج کرتی ہوں میں اس کا علاج۔ جوں جوں بڑھ رہا ہے توں توں سڑ رہا ہے۔'' میری پیٹھ پر دو لاتیں ماریں اور گھسیٹتی ہوئی لے چلی باہر۔ پیچھے سے کا کا خوشی میں چلّایا، ''ذرا اچھی طرح کر دو مرمت پنٹی کی۔''

ایجا مجھے مرے چوہے کی طرح گھسیٹتی منڈیر پر لے گئی اور دھکیل دیا بچھو کے جھاڑ پر۔ ''او ایجا! وے...''

موہ کا بس ایک پتلا سا دھاگا بچا تھا۔ ٹوٹ گیا وہ اس لمحے۔ ہاف ٹائم میں دیوار پر بیٹھے میری آنکھیں بار بار بھر آتیں۔ کودتے پھاندتے لڑکے نظر میں کانپنے لگتے۔ بچھو کے کاٹوں سے بدن ابھی بھی چلچلا رہا تھا۔ کہنیاں چھلی ہوئی، بالوں میں دھول۔ نہایا تھا اس صبح بھی۔ لیکن بدن میں کوئی خوشبو باقی نہیں۔

من کھل کر رو پڑنے کو ہو رہا تھا۔ جاؤں، چلا جاؤں یہاں سے۔ ہمیشہ کے لیے، وہاں جہاں پنٹی رہتی ہے۔ وہاں لوگ ایسے نہیں ہیں۔ وہاں نفرت نہیں ہے۔ بنا بات کے ایسا ظلم نہیں ہے۔

اور میں نے فیصلہ کیا کہ ایک دن موقع ملتے ہی بازار بھاگ جاؤں گا۔ کہتے ہیں وہاں سے دور دور کو بس جاتی ہے۔ کسی میں بیٹھ جاؤں گا۔ پھر کبھی نہیں لوٹوں گا یہاں۔ کبھی نہیں۔

اس وقت سے یہ ارادہ میرے من میں ہر پل پکا ہوتا گیا۔ میں نے کپڑے چن لیے جو ساتھ لے

جانے تھے۔ ایک جھولا بھی ان کے لیے چھپا لیا۔ کچھ اخروٹ بھی رکھ لیے اور سوچ لیا کہ روپے کہیں سے نکالے جا سکتے ہیں۔ مجھے بس موقعے کا انتظار تھا۔

اور ایسے میں وہ حادثہ ہو گیا۔ میں نہا رہا تھا۔ کیسی بھی ٹھنڈ ہو میں نہائے بنا نہ رہتا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ کاکا گھات میں ہے۔ میں نے صابن الگ رکھا کہ وہ بلی کی طرح جھپٹا۔ میں سکتے میں۔ کاکا کا ہاتھ صابن پر پڑا۔ اٹھا بھی لیتا کہ صابن پھسل کر دور جا گرا اور تب تک میں نے آنکھ میچ کر پیتل کا بھاری لوٹا کھینچ کر مارا۔

کاکا ''ہائے'' کہتا چکرا کر بیٹھ گیا اور سر پکڑے ویسے ہی رہ گیا۔

تب تک میں نے صابن اٹھا لیا اور لوٹا پکڑ کر پھر سے تیار ہو گیا۔ پر کاکا تو اٹھا ہی نہیں۔ تب میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ کاکا کو ہلا کر پکارا، ''کاکا! کاکا!''

کراہ کر کاکا نے سر اٹھایا تو دیکھا ماتھے سے ایک دم لال لال خون بہہ رہا تھا۔ ''مار دیا سالے!'' کاکا نہ جانے کیا کیا بڑبڑانے لگا۔ پھر ہاتھوں سے ماتھا دبائے، لڑکھڑاتا ہوا باہر کو چلا۔ دہلیز کے پاس رک کر مڑا۔ روہانسا چہرہ۔ گالوں پر خون اور آنسوؤں کی دھاریں۔ سسکتا ہوا بولا، ''سالے، ایک دن تو ختم ہو جائے گا تیرا صابن!''

کاکا چلا گیا۔ میں سُن کھڑا تھا۔ ہتھیلی کھول کر دیکھا۔ گلابی خوبصورت ٹکیا۔ پر اب کتنی پتلی لگ رہی تھی۔ اور خوشبو بھی تو شاید اڑ چلی تھی۔

میرا دل ڈوب گیا۔

رونے کا وقت نہیں تھا۔ فٹافٹ کپڑے پہن، بھاگتا ہوا گیا اوپر۔ جھولا نکالا۔ کچھ کپڑے ٹھونسے۔ اخروٹ رکھنے کا وقت نہیں۔ بستہ؟ نہیں، بستے کا کیا کام! پیسے؟

تبھی سنا باہر کاکا گھبرائی ہوئی ایجا کو بتا رہا تھا کہ کیسے وہ گوبر پر پھسل کر گر پڑا اور کیسے گئوشالے کی دہلیز سے اس کا سر ٹکرایا۔

مجھ سے پھر کھڑا نہیں رہا گیا تھا۔ اوندھے منہ چارپائی پر گر پڑا۔ بڑی دیر بعد اس قابل ہوا کہ جا کر صابن کو اس کی جگہ چھپا آؤں۔ لوٹ کر ایک اندھیرے کونے میں سو رہا۔ شام ہو گئی تو بھی نہیں اٹھا۔ کہہ دیا کہ پیٹ میں درد ہے۔

صبح اٹھا تو دیکھا عجیب سا اجالا سب طرف پھیلا ہے۔ راتوں رات برف گر گئی تھی۔ پتا ہی نہیں چلا۔ اندیشے سے میرا دل بیٹھ گیا۔

تازی برف پر ننگے پاؤں بھاگتا گیا۔ ٹھنڈ کی پروا کسے تھی۔ پوال کے ڈھیر پر چار چار انگل برف جمی

تھی۔ یہیں کہیں تھی وہ سیندھ۔ ہاتھوں سے برف کھودی تو نیچے کیچڑ ہی کیچڑ۔ ہاتھ سن گئے۔ یہاں نہیں؟ یہاں نہیں؟ یہاں بھی نہیں۔

کوئی لسلسی سی چیز انگلیوں میں آئی۔ گلابی کیچڑ کا ایک لوندا۔ خوشبودار۔ اس لوندے کو ہتھیلی میں بھرے، میں وہیں برف پر دھپ سے بیٹھ گیا۔ سردی سے کانپتا ہوا۔

''ہریا!'' یہ ایجا تھی۔ دودھ لگانے آئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اُسی حقارت کے لیے سکڑتے ہوئے اس کے ہونٹ۔ میرے ہاتھ سے لوندا گر گیا۔ ماں کے ہونٹوں سے ایک سسکی سی نکلی۔ ''ہریا..''

پیروں سے سر تک ایک تھرتھراہٹ کے ساتھ میں بکھر گیا۔ پوری جان سے اپنے کو پھوٹ پڑنے کی چھوٹ دیتا ہوا، کیچڑ سنی انگلیوں سے ماں کو جکڑتا ہوا، زور سے رو پڑا۔

ماں بھی وہیں میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ مجھے کولی میں بھر کر۔ اور میں کوکھ کی گرماہٹ میں منہ چھپا کر روتا رہا۔ بہت دنوں بعد۔ پہلے کی طرح۔

اور اچانک مجھے لگا برف کا ایک بڑا سا ڈھیر پگھل رہا ہے۔ میرا دل روئی کی طرح ہلکا ہونے لگا۔ اس لمحے کوئی جھونکا آتا تو میں سچ مچ ہی اڑنے لگا ہوتا۔

موہن راکیش

ہندی سے ترجمہ: اگرسین نارنگ

اُس کی روٹی

بالو کو علم تھا کہ بس کے آنے میں ابھی بہت دیر ہے، پھر بھی پلّو سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس کی آنکھیں بار بار سڑک کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ نکودر روڈ کے اس حصے میں آس پاس کوئی سایہ دار درخت بھی نہیں تھا۔ وہاں کی زمین بھی بنجر اور اوبڑ کھابڑ تھی۔ کھیت وہاں سے تیس چالیس گز کے فاصلے پر تھے اور کھیتوں میں ان دنوں کچھ بھی نہیں تھا۔ فصل کٹنے کے بعد زمین کی صرف گوڑائی ہی کی گئی تھی، اس لیے چاروں طرف بس ایک مٹیالا پن ہی نظر آتا تھا۔ گرمی سے پگھلی ہوئی نکودر روڈ کا ہلکا سرمئی رنگ ہی اُس مٹیالے پن سے قدرے الگ تھا۔ جہاں بالو کھڑی تھی وہاں سے تھوڑے فاصلے پر لکڑی کا ایک کھوکھا تھا۔ اس میں، پانی کے دو بڑے مٹکوں کے پاس، ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اونگھ میں ہی جب وہ آگے کی جانب گرنے کو ہوتا تو اچانک جھٹکا کھا کر سنبھل جاتا۔ پھر وہ گرد و پیش کے ماحول پر ایک اداس سی نظر ڈالتا، انگوچھے سے گلے کا پسینہ پونچھتا اور پھر ویسے ہی اونگھنے لگتا۔ ایک طرف ڈھائی تین فٹ تک کھوکھے کا سایہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک بھکاری جس کی ڈاڑھی بہت بڑھی ہوئی تھی، کھوکھے کے ساتھ ٹیک لگائے، للچائی آنکھوں سے بالو کے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے قریب ہی ایک کتا دبک کر بیٹھا تھا اور اُس کی نظر بھی بالو کے ہاتھوں کی طرف تھی۔

بالو نے روٹی کی پوٹلی کو میلے آنچل میں لپیٹ رکھا تھا، جیسے وہ اُسے نظر بد سے بچائے رکھنا چاہتی تھی۔ یہ روٹی وہ اپنے خاوند سچا سنگھ ڈرائیور کے لیے لائی تھی، لیکن دیر ہو جانے کے باعث سچا سنگھ کی بس نکل گئی تھی اور اب بالو اس انتظار میں کھڑی تھی کہ بس نکودر سے ہو کر لوٹ آئے تو وہ سچا سنگھ کو روٹی دے دے۔ وہ جانتی تھی کہ اِس کے وقت پر نہ پہنچنے سے سچا سنگھ کو بہت غصہ آیا ہوگا۔ سچا سنگھ کی بس جالندھر سے چل کر عموماً دو

بجے وہاں آتی تھی اور سچا سنگھ کو نکودر پہنچ کر روٹی کھانے میں تین ساڑھے تین بج جاتے تھے۔ بالو اس کو دوپہر کی روٹی کے ساتھ ہی رات کے لیے بھی روٹی دے دیتی تھی جسے وہ آخری پھیرے میں نکودر پہنچ کر کھاتا تھا۔ ہفتے میں چھ دن سچا سنگھ ڈیوٹی پر رہتا تھا اور چھ دن اُس کی روٹی کا یہی سلسلہ چلتا تھا۔ بالو ایک سوا ایک بجے روٹی لے کر گاؤں سے چلتی تھی اور دھوپ میں آدھا کوس طے کر کے دو بجے سے پہلے سڑک کے کنارے پہنچ جاتی تھی۔ اگر کبھی اسے دو چار منٹ کی دیر ہو جاتی تھی تو سچا سنگھ کسی نہ کسی بہانے بس وہاں رو کے رکھتا تھا۔ لیکن بالو کے آتے ہی اسے ڈانٹتا کہ وہ سرکاری نوکر ہے، اُس کے باپ کا نوکر نہیں کہ اس کے انتظار میں بس کھڑی رکھا کرے۔ بالو چپ چاپ اس کی ڈانٹ ڈپٹ سن لیتی اور اسے روٹی دے دیتی۔ لیکن آج وہ دو چار منٹ نہیں بلکہ دو ڈھائی گھنٹے کی تاخیر سے آئی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اِس وقت وہاں پہنچنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، وہ اپنی بے چینی میں گھر سے چل دی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ جتنا وقت سڑک کے کنارے انتظار میں گذارے گی، سچا سنگھ کی ناراضگی اتنی ہی کم ہو جائے گی۔ اور یہ تو یقینی امر تھا کہ سچا سنگھ نے دوپہر کی روٹی نکودر کے کسی ڈھابے پر کھالی ہوگی۔ لیکن اسے رات کے لیے روٹی دینا ضروری تھا اور ساتھ ہی وہ ساری بات بتانا بھی ضروری تھا جس کی وجہ سے بالو کو دیر ہوئی تھی۔ وہ اس سارے واقعے کو دل ہی دل میں دوہرا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ سچا سنگھ کا غصہ بہت خراب ہے اور ساتھ ہی یہ بھی جانتی تھی کہ اگر جنگی کے بارے میں الٹا سیدھا کہا جائے تو وہ گنڈاسے کے بغیر بات نہیں کرتا۔

جنگی کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ مثلاً یہ کہ گذشتہ برس وہ نواحی گاؤں سے ایک مہری کو بھگا لے گیا تھا اور نہ جانے اُسے کہاں بیچ آیا تھا۔ پھر نکودر کے پنڈت جیوارام کے ساتھ اس کا جھگڑا ہوا تو اس نے اُسے قتل ہی کروا دیا۔

گاؤں کے لوگ جنگی سے دور دور رہتے تھے لیکن اس سے بگاڑ نہیں رکھتے تھے۔

لیکن جنگی کی لاکھ برائیاں سن کر بھی بالو نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی گری ہوئی حرکت بھی کر سکتا ہے۔ جنگی یوں بھی عمر میں جنداں سے تین گنا بڑا تھا اور ابھی سال بھر پہلے وہ اسے بیٹی بیٹی کہہ کر بلایا کرتا تھا۔ مگر آج اُس کی عقل میں ایسا فتور آ گیا کہ اس نے کھیت میں سے آتی ہوئی جنداں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

بالو نے جنداں کو نتی کے ہاں اُپلے مانگ لانے کے لیے بھیجا تھا۔ بالو کا گھر کھیتوں کے ایک سرے پر تھا اور گاؤں کے باقی گھر دوسرے سرے پر تھے۔

بالو آٹا گوندھ کر انتظار کر رہی تھی کہ جنداں اپلے لے کر آئے تو وہ جھٹ پٹ روٹیاں سینک کر بس کے وقت سے پہلے سڑک پر پہنچ جائے۔ لیکن جنداں آئی تو اس کے ہاتھ خالی تھے اور اس کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔ جب تک جنداں نہیں آئی بالو کو اُس پر غصہ آ رہا تھا۔ مگر اب اسے دیکھتے ہی بالو کا دل

ایک انجانے خوف سے کانپ اٹھا۔

''کیا ہوا جنداں، ایسے کیوں ہو رہی ہو؟'' بالو نے اسے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جنداں چپ چاپ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بانہوں میں سر ڈال کر رونے لگی۔

''خصم کھانی، کچھ بتائے گی بھی، کیا بات ہوئی ہے؟''

جنداں کچھ نہ بولی، البتہ اس کے رونے کی آواز اور تیز ہو گئی۔

''کسی نے کچھ کہا ہے تجھ سے؟'' بالو نے اب اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''تو مجھے اُلپلے وُلپلے لینے مت بھیجا کر!'' جنداں روتے ہوئے اکھڑی اکھڑی سی آواز میں بولی، ''میں آج سے گھر سے باہر نہیں جاؤں گی۔ مُوا جنگی آج مجھ سے کہتا تھا...'' اور گلا رندھ جانے سے وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

''کیا کہتا تھا جنگی تجھ سے؟... بتا... بول...!'' بالو جیسے کسی بوجھ تلے دب کر بولی، ''خصم کھانی، اب بولتی کیوں نہیں؟''

''وہ کہتا تھا...'' جنداں سسکتی رہی۔ ''چل جنداں، اندر چل کر شربت پی لے، آج تو بہت سوہنی لگ رہی ہے...''

''موا کم جات!'' بالو ایک دم اُبل پڑی۔ ''موئے کو اپنی ماں رنڈی سوہنی نہیں لگتی؟ کمینے، تیرے گھر میں لڑکی ہوتی تو اس سے بڑی ہوتی! تیرے دیدے پھوٹیں... ہاں جنداں، پھر تو نے کیا کہا؟''

''میں نے کہا، چاچا مجھے پیاس نہیں ہے۔'' جنداں کچھ کچھ سنبھل چلی تھی۔

''پھر؟''

''کہنے لگا پیاس نہیں ہے تو بھی ایک گھونٹ پی لے۔ چاچا کا شربت پیے گی تو یاد کرے گی... اور میری بانہہ پکڑ کر کھینچنے لگا۔''

''ہائے رے، تجھے موت آئے، تیرا کچھ نہ رہے، تیرے گھر میں آگ لگے!— آنے دے سچا سنگھ کو، میں تیری بوٹی بوٹی نہ نچواؤں تو کہنا! جل مرے، تو سویا کا سویا ہی رہ جائے!... ہاں پھر؟''

''میں بانہہ چھڑانے لگی تو مجھے مٹھائی کا لالچ دینے لگا۔ میرے ہاتھ سے اُلپلے وہیں گر گئے اور میں بانہہ چھڑا کر بھاگ آئی۔''

بالو نے غور سے جنداں کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

بالو نے پھر سوال کیا، ''اور تو کچھ نہیں کہا اس نے؟''

''جب میں تھوڑی دور نکل آئی تو پیچھے سے ہی ہی کر کے بولا، بیٹی تو بُرا تو نہیں مان گئی؟ اپنے اُلپلے تو

اٹھا کر لے جا، میں تو تیرے ساتھ ہنسی کر رہا تھا۔ تو اتنا بھی نہیں سمجھتی! چل اِدھر آ، نہیں آتی تو میں آج تیرے گھر آ کر تیری بہن سے شکایت کروں گا کہ جنداں بہت منھ زور ہوگئی ہے، کہا نہیں مانتی... میں نے اُسے نہ کوئی جواب دیا نہ مڑ کر اس کی طرف دیکھا— سیدھی گھر چلی آئی۔''

''اچھا کیا۔ میں موئے کی ہڈی پسلی ایک کرا کے چھوڑوں گی، تو آنے دے سچا سنگھ کو۔ میں ابھی جا کر اس سے بات کروں گی۔ جنگی کو یہ نہیں پتا کہ جنداں سچا سنگھ ڈرائیور کی سالی ہے، ذرا سوچ کر ہاتھ لگاؤں۔'' پھر کچھ سوچ کر بالو نے پوچھا، ''وہاں تجھے اور کسی نے تو نہیں دیکھا؟''

''نہیں۔ کھیتوں کے اِس طرف آم کے پیڑ کے نیچے رادھو چاچا بیٹھا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھ کر پوچھا کہ بیٹی، اس وقت دھوپ میں کہاں سے آ رہی ہے، تو میں نے کہا کہ بہن کے پیٹ میں درد تھا، حکیم جی سے چورن لینے گئی تھی۔''

''اچھا کیا۔ موا جنگی تو لفنگا ہے۔ اس کے ساتھ اپنا نام جڑ جائے تو اپنی ہی عزت جائے۔ اس جنم جلے کا کیا جانا ہے! اور لوگوں کو تو کرنے کے لیے بات چاہیے۔''

اس کے بعد اُپلے لا کر کھانا بنانے میں بالو کو بہت دیر لگ گئی تھی۔ جس وقت اس نے کٹورے میں آلو کی ترکاری اور آم کا اچار رکھ کر اسے روٹیوں کے ساتھ کھدر کے ٹکڑے میں لپیٹا تو اسے علم تھا کہ دو کب کے بج چکے ہیں اور وہ دوپہر کی روٹی سچا سنگھ کو نہیں پہنچا سکتی۔ اس لیے وہ روٹی کو ایک طرف رکھ کر اِدھر اُدھر کے کام کرنے لگی۔ لیکن جب وہ ہر طرف سے فارغ ہوگئی تو اس سے یہ نہیں ہو سکا کہ وہ بس کے اندازے سے گھر سے نکلے۔ ابھی مشکل سے ساڑھے تین یا چار بجے تھے کہ وہ گھر سے چلنے کے لیے تیار ہوگئی۔

''بہن، تو کب تک آئے گی؟'' جنداں نے پوچھا۔

''دن ڈھلنے سے پہلے ہی آ جاؤں گی۔''

''جلدی آ جانا۔ مجھے اکیلے ڈر لگے گا۔''

''ڈرنے کی کیا بات ہے؟'' وہ بظاہر ہمت سے بولی، ''کس کی ہمت ہے جو تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے؟ سچا سنگھ کو پتا چلے گا تو وہ اُسے کچا ہی نہیں چبا جائے گا؟ ویسے مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ شام سے پہلے ہی گھر پہنچ جاؤں گی۔ تو ایسے کرنا کہ اندر سے سانکل لگا لینا۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹائے تو پہلے نام پوچھ لینا۔'' پھر اس نے ذرا دھیمی آواز میں کہا، ''اور اگر جنگی آ جائے اور میرے بارے میں پوچھے کہ کہاں گئی ہے تو کہنا کہ سچا سنگھ کو بلانے گئی ہے۔ سمجھی؟... مگر نہیں۔ تو اُس سے کچھ نہیں کہنا۔ اندر سے جواب ہی نہ دینا۔ سمجھی؟''

وہ دہلیز کے قریب پہنچی تو جنداں نے پیچھے سے کہا، ''بہن، میرا دل دھڑک رہا ہے۔''

''تو پاگل ہوئی ہے؟'' بالو نے اسے پیار کے ساتھ جھڑک دیا۔ ''ساتھ گاؤں ہے، پھر ڈر کس بات کا ہے؟ اور تو آپ بھی مٹیار ہے، اس طرح گھبراتی کیوں ہے؟''

لیکن جنداں کو دلاسا دے کر بھی اس کی اپنی تسلی نہیں ہوئی۔

سڑک کے کنارے پہنچتے ہی وہ چاہ رہی تھی کہ کسی طرح بس جلدی سے آجائے تو وہ سچا سنگھ کو روٹی دے کر، جھٹ پٹ جنداں کے پاس واپس پہنچ جائے۔

''ویرا، دو بجے والی بس کو گئے کتنی دیر ہوئی ہے؟'' بالو نے بھکاری سے پوچھا جس کی آنکھیں اب بھی اس کے ہاتھ کی روٹی پر لگی تھیں۔ دھوپ کی چبھن ابھی کم نہیں ہوئی تھی، حالانکہ کھوکھے کا سایہ اب پہلے سے کہیں زیادہ لمبا ہوگیا تھا۔ کتا پیاؤ کے تختے کے نیچے پانی کو منھ لگا کر اب ارد گرد چکر کاٹ رہا تھا۔

''پتا نہیں بہناں،'' بھکاری نے کہا، ''کوئی بس آتی ہے کوئی جاتی ہے۔ یہاں کون گھڑی کا حساب ہے!''

بالو چپ ہوگئی۔ ایک بس ابھی کچھ دیر پہلے نکودر کی طرف گئی تھی۔ بالو کو لگ رہا تھا کہ دھول کے پھیلاؤ کے دونوں طرف دو الگ الگ جہان ہیں۔ بسیں ایک جہان سے آتی ہیں اور دوسرے جہان کی طرف جاتی ہیں۔ کیسا ہوگا وہ جہان جہاں بڑے بڑے بازار ہیں، دکانیں ہیں اور جہاں ایک ڈرائیور کی آمدنی کا تین چوتھائی حصہ ہر مہینے خرچ ہوجاتا ہے؟ دیوی اکثر کہا کرتا تھا کہ سچا سنگھ نے نکودر میں ایک رکھیل رکھی ہوئی ہے۔ بالو کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ ایک بار اس عورت کو دیکھے۔ بالو نے ایک بار سچا سنگھ سے کہا بھی تھا کہ وہ اسے نکودر دکھادے، لیکن سچا سنگھ نے اسے ڈانٹ کر جواب دیا تھا، ''کیوں تیرے پر نکل رہے ہیں؟ گھر میں چین نہیں پڑتا؟ سچا سنگھ وہ مرد نہیں ہے کہ عورت کی بانہہ پکڑ کر اسے سڑکوں پر گھماتا پھرے! گھومنے کا ایسا ہی شوق ہے تو دوسرا خصم کرلے۔ میری طرف سے تجھے کھلی چھٹی ہے۔''

اُس دن کے بعد بالو یہ بات کبھی زبان پر نہیں لائی تھی۔ سچا سنگھ کیسا بھی تھا، اُس کے لیے سب کچھ وہی تھا۔ وہ اسے گالیاں بھی دیتا تھا، مارتا پیٹتا بھی تھا، پھر بھی اس سے اتنا پیار تو کرتا تھا کہ ہر مہینے تنخواہ ملنے پر اسے بیس روپے دے جاتا تھا۔ لاکھ بُری کہہ کر بھی وہ اسے اپنی گھر والی تو سمجھتا تھا۔ وہ زبان کا کڑوا بھلے ہی ہو، لیکن دل کا بُرا ہرگز نہیں تھا۔ وہ بالو کے جنداں کو گھر میں رکھ لینے پر اکثر کڑھا کرتا تھا، لیکن گذشتہ ماہ وہ خود جنداں کے لیے کانچ کی چوڑیاں اور اڑھائی گز ململ لاکر دے گیا تھا۔

ایک بس دھول اڑاتی، آسمان کے اُس کنارے سے اس طرف آرہی تھی۔ بالو نے دور سے ہی پہچان لیا کہ وہ سچا سنگھ کی بس نہیں ہے، پھر بھی جب تک بس قریب نہیں آگئی، وہ بے تاب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ بس پیاؤ کے سامنے آکر رُکی۔ ایک شخص پیاز اور شلغم کا گٹھر لیے بس سے اترا۔ پھر کنڈکٹر

نے زور سے دروازہ بند کیا اور بس آگے چل دی۔ جو شخص بس سے اترا تھا، اس نے پیاؤ کے پاس جا کر پیاؤ والے کو جگایا اور دو لوٹے پانی اوک سے پی کر مونچھیں صاف کرتا ہوا اپنے گٹھر کے پاس لوٹ آیا۔

''ویرا، نکودر سے اگلی بس کتنی دیر میں آئے گی؟'' بالو نے دو قدم آگے بڑھ کر اس شخص سے پوچھا۔

''گھنٹے گھنٹے کے بعد بس چلتی ہے مائی!'' وہ بولا۔ ''تجھے کہاں جانا ہے؟''

''جانا نہیں ہے ویرا، بس کا انتظار کرنا ہے۔ سچا سنگھ ڈرائیور میرا گھر والا ہے۔ اُسے روٹی دینی ہے۔''

''او، سچا سیاں!'' اور اس شخص کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تو اسے جانتا ہے؟''

''اسے نکودر میں کون نہیں جانتا؟''

بالو کو اس کے بات کہنے کا ڈھنگ کچھ اچھا نہیں لگا، اس لیے وہ چپ ہو گئی۔ سچا سنگھ کے بارے میں جو باتیں وہ خود جانتی تھی انھیں دوسروں کی زبان سے سننا اسے پسند نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دوسروں کو کیا حق ہے کہ وہ اس کے آدمی کے بارے میں اس طرح باتیں کریں۔

''سچا سنگھ شاید اگلی بس لے کر آئے گا،'' وہ شخص بولا۔ ''ہاں، اس کے بعد اُسی کی بس آئے گی۔ بڑا ظالم ہے جو تجھ سے اس طرح انتظار کراتا ہے۔''

''چل ویرا، اپنی راہ لگ!'' بالو چڑ کر بولی۔ ''وہ کیوں انتظار کرائے گا؟ مجھے ہی روٹی لانے میں دیر ہو گئی اور اس کی بس نکل گئی۔ وہ بیچارہ صبح سے بھوکا بیٹھا ہوگا۔''

''بھوکا؟ کون، سچا سیاں؟'' اور وہ شخص دانت نکال کر ہنس دیا۔ بالو نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ''یا سائیں سچے!'' کہہ کر اس شخص نے اپنا گٹھر سر پر اٹھا لیا اور کھیتوں کی پگڈنڈی پر چل دیا۔ بالو کی دائیں ٹانگ سو گئی تھی۔ اس نے اپنا وزن دوسری ٹانگ پر بدلتے ہوئے ایک لمبی سانس لی اور دور تک پھیلی ویرانی کو دیکھنے لگی۔

نہ جانے کتنی دیر بعد آسمان کے اُس کنارے سے اسے دوسری بس اپنی جانب آتی نظر آئی۔ تب تک کھڑے کھڑے اس کے پیروں کی ہڈیاں دُکھنے لگی تھیں۔ بس کو دیکھ کر وہ پوٹلی کا کپڑا ٹھیک کرنے لگی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ روٹیاں کچھ اور دیر سے بنا کر کیوں نہیں لائی، کہ وہ رات تک کچھ اور تازہ رہتیں— سچا سنگھ کو کڑاہ پرشاد کا اتنا شوق ہے، اسے کیوں یہ خیال نہیں آیا کہ آج تھوڑا کڑاہ پرشاد ہی بنا کر لے جائے۔ خیر کل گورپُرب ہے، کل ضرور کڑاہ پرشاد بنا کر لائے گی۔

بس اپنے پیچھے گرد و غبار کی ایک لمبی لکیر چھوڑتی ہوئی قریب آتی جا رہی تھی۔ بالو نے بیس گز دور سے ہی سچا سنگھ کا چہرہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہ اس سے بہت ناراض ہے۔ اسے دیکھ کر سچا سنگھ کی بھنویں تن گئی تھیں اور

نچلے ہونٹ کا ایک کونا دانتوں سے ذرا پرے چلا گیا تھا۔ بالو نے دھڑکتے دل سے روٹی والا ہاتھ اوپر اٹھا دیا، لیکن بس اس کے قریب نہ رک کر پیاؤ سے ذرا آگے جا کر رک گئی۔

وہاں دو ایک لوگ بس پر سے اترنے والے تھے۔ کنڈکٹر بس کی چھت پر جا کر ایک مسافر کی سائیکل نیچے اتارنے لگا۔ بالو تیزی سے چل کر ڈرائیور کی سیٹ کے برابر پہنچ گئی۔

''سچا سیاں!'' اس نے ہاتھ اونچا اٹھا کر روٹی کھڑکی کی راہ سے اندر پہنچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''روٹی لے لے۔''

''ہٹ جا!'' سچا سنگھ نے اس کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹا دیا۔

''سچا سیاں، ایک منٹ نیچے اتر کر میری بات سن لے۔ آج ایک خاص بات ہوگئی تھی، نہیں تو میں...''

''بک نہیں۔ ہٹ جا یہاں سے!'' یہ کہہ کر سچا سنگھ نے کنڈکٹر سے پوچھا کہ وہاں کا سارا سامان اُتر گیا ہے یا نہیں۔

''بس ایک پیٹی باقی ہے، اتار رہا ہوں،'' کنڈکٹر نے بس کی چھت پر سے آواز دی۔

''سچا سیاں، میں دو گھنٹے سے یہاں کھڑی ہوں!'' بالو نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ ''تو نیچے اتر کر میری بات تو سن لے۔''

''اُتر گئی پیٹی؟'' سچا سنگھ نے پھر کنڈکٹر سے پوچھا۔

''ہاں، چلو!'' پیچھے سے کنڈکٹر کی آواز آئی۔

''سچا سیاں، تو مجھ پر ناراض ہو لے، پر روٹی تو رکھ لے! تو منگل وار کو گھر آئے گا تو میں تجھے ساری بات بتاؤں گی۔'' بالو نے ہاتھ اور اونچا اٹھا دیا۔

''منگل وار کو گھر آئے گا تیرا...'' اور ایک موٹی سی گالی دے کر سچا سنگھ نے بس اسٹارٹ کر دی۔

دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ آسمان کا رنگ بدل چلا تھا۔ بیچ بیچ میں کوئی پرندہ اڑتا ہوا آسمان پار کر جاتا تھا۔ کھیتوں میں کہیں کہیں رنگین پگڑیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ بالو نے پیاؤ پر سے پانی پیا اور آنکھوں پر چھینٹے مار کر آنچل سے اپنا چہرہ پونچھ لیا۔ پھر پیاؤ سے کچھ فاصلے پر جا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ جانتی تھی کہ سچا سنگھ کی بس جالندھر سے آٹھ نو بجے واپس آئے گی۔ کیا تب تک اسے انتظار کرنا چاہیے؟ سچا سنگھ کو اتنا تو کرنا چاہیے تھا کہ بس سے اتر کر اس کی بات سن لیتا۔ اُدھر گھر میں جنداں اکیلی ڈر رہی ہوگی۔ موا جنگی پیچھے گھر پر کسی بہانے سے آ گیا ہو تو؟ سچا سنگھ روٹی لے لیتا تو وہ آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ جاتی۔ اب روٹی تو وہ باہر کہیں نہ کہیں کھا ہی لے گا، لیکن اس کے غصّے کا کیا ہوگا؟ سچا سنگھ کا غصہ بے جا بھی تو نہیں ہے۔ اس کا محنتی جسم ہے اور اسے کس کر بھوک لگتی ہے۔ وہ تھوڑی اور منت سماجت کرتی تو سچا سنگھ ضرور مان جاتا۔ لیکن

اب؟

پیاؤ والا پیاؤ بند کر رہا تھا۔ بھکاری بھی نہ جانے کب اٹھ کر چلا گیا تھا۔ ہاں، کتا اب بھی وہاں اردگرد گھوم رہا تھا۔ دھوپ ڈھل رہی تھی اور آسمان میں اڑتی چڑیوں کے جھنڈ سنہری لگ رہے تھے۔ بالو کو سڑک کے پار تک پھیلا اپنا سایہ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ قریب کے کسی کھیت میں کوئی گبرو جوان کھلے گلے سے ماہیا گا رہا تھا۔

''بولن دی چاہ کوئی ناں
جیہڑا سانوں لاوے دِتا
اُس روگ داناں کوئی ناں''

(کسی سے بات کرنے کی کوئی چاہ نہیں ہے۔ تو نے جو روگ ہمیں لگا دیا ہے، اس روگ کا نام کوئی نہیں ہے۔)

ماہیا کی وہ لَے بالو کی رگ و پے میں بسی ہوئی تھی۔ بچپن میں، گرمیوں کی شام کو جب وہ دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر رہٹ کے پانی کی دھار کے نیچے، ناچ ناچ کر نہایا کرتی تھی، تب بھی ماہیا کی لے اِسی طرح فضا میں رچی بسی رہتی تھی۔ شام کے جھٹپٹے کے ساتھ اس لَے کا ایک خاص تعلق تھا۔ پھر جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی، زندگی کے ساتھ اس لَے کا تعلق مزید گہرا ہوتا چلا گیا۔ ان کے گاؤں میں ایک نوجوان تھا، لالی، جو بڑی لوچ کے ساتھ ماہیا گایا کرتا تھا۔ بالو نے کتنی ہی بار اسے گاؤں کے باہر پیپل کے نیچے کان پر ہاتھ رکھ کر گاتے سنا تھا۔ پشپا اور پارو کے ساتھ وہ دیر دیر تک پیپل کے پاس کھڑی رہتی تھی۔ پھر ایک دن آیا جب اس کی ماں نے اس سے کہا کہ وہ اب بڑی ہوگئی ہے، اسے اس طرح دیر دیر تک پیپل کے پاس کھڑی رہنا نہیں چاہیے۔ اُنھیں دنوں اِس کی سگائی کا بھی چرچا ہونے لگا۔ جس دن سچا سنگھ کے ساتھ اس کی سگائی ہوئی، اُس دن پارو آدھی رات تک ڈھولک پر گیت گاتی رہی تھی۔ گاتے گاتے پارو کا گلا رہ گیا تھا، پھر بھی وہ ڈھولک چھوڑنے کے بعد بالو کو اپنی بانہوں میں لیے گاتی رہی تھی:

''بی بی، چنن دے او ہلے او ہلے کیوں کھڑی،
نی لاڈو کیوں کھڑی؟''
''میں تاں کھڑی ساں بابل جی دے دوار
میں کنیا کنوار،
بابل وَر لوڑیے!''
''نی جائیے، کیہو جیہا ور لوڑیے؟''

''جیوتاریاں وچوں چند،
چنداں وچوں نند،
نداں وچوں کاہن کنہیا ورلوڑیے...''

(''اے اچھی لڑکی تو چندن کی اوٹ میں کیوں کھڑی ہے۔ اے لاڈلی، بول کیوں کھڑی ہے؟''— ''میں تو اپنے بابل کے در میں کھڑی تھی۔ میں کنواری ہوں۔ بابل نے میرے لیے بر ڈھونڈا ہے!''— ''اری، بتا تو کیسا بر ڈھونڈا ہے؟''— ''وہ ایسا ہے، جیسے تاروں کے جھرمٹ میں چاند، جیسے چاند کے جھرمٹ میں نند بابا— اور نند خاندان میں جیسے کرشن کنہیا تھے، ویسا بر ڈھونڈا ہے!'')

بالو نہیں جانتی تھی کہ اس کا بر کون ہے، کیسا ہے، پھر بھی اس کا دل کہتا تھا کہ اس کے خاوند کی شکل و صورت ٹھیک ایسی ہوگی جیسی کہ گیت کی کڑیاں سن کر سامنے آتی ہے۔ سہاگ رات کو جب سچا سنگھ نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی تو نہ جانے کتنی لہریں اس کے سر سے اٹھ کر پیروں کے ناخنوں میں جا سمائیں۔ اسے ایسا لگا کہ زندگی نہ جانے ایسے کتنے ہیجانوں سے بھری ہوگی جنھیں وہ روز روز محسوس کرے گی اور اپنی یادوں کی لڑی میں پروتی چلی جائے گی۔

'تو ہیرے کی کنی ہے، ہیرے کی کنی!'' سچا سنگھ نے اسے اپنی بانہوں میں بھر کر کہا تھا۔

اس کے دل نے چاہا تھا کہ کہے کہ یہ ہیرے کی کنی تیرے پیر کی دھول کے برابر بھی نہیں ہے۔ مگر وہ شرما کر چپ رہ گئی تھی۔

''مائی، اندھیرا ہو رہا ہے، اب گھر جا! یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟'' پیاؤ والے نے وہاں سے جاتے ہوئے اس کے قریب رُک کر کہا۔

''ویرا، یہ بس آٹھ نو بجے تک جالندھر سے لوٹ کر آ جائے گی نا؟'' بالو نے رحم طلب انداز سے اس سے پوچھا۔

''کیا پتا کب تک آئے! تو اتنی دیر یہاں کھڑی رہے گی؟''

''ویرا، اُس کی روٹی جو دینی ہے۔''

''اسے روٹی لینی ہوتی تو لے نہ لیتا؟ اس کا تو دماغ ہی آسمان پر چڑھا رہتا ہے۔''

''ویرا، مرد کبھی ناراض ہو ہی جاتا ہے۔ اس میں ایسی کیا بات ہے۔''

''اچھا کھڑی رہ، تیری مرضی! بس نو بجے سے پہلے کیا آئے گی۔''

''جب بھی آئے۔''

پیاؤ والے سے بات کر کے وہ فیصلہ خود بخود ہو گیا جو وہ اب تک نہیں کر پائی تھی... کہ اسے بس کے

جالندھر سے لوٹنے تک وہاں رکے رہنا ہے۔ جنداں تھوڑا ڈرے ہی گی تو... بس یہی نا؟ لیکن جنگی میں اب دوبارہ اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوسکتی۔ آخر گاؤں کی پنچائت بھی تو کوئی چیز ہے۔ دوسرے کی بہن بیٹی پر بُری نظر رکھنا کوئی معمولی بات ہے کیا؟ سچا سنگھ کو پتا چل جائے تو وہ اسے کیسوں سے پکڑ کر سارے گاؤں میں گھسیٹ نہ دے گا؟ لیکن سچا سنگھ پہلے کو یہ بات نہ بتانا ہی بہتر ہوگا۔ کیا پتا اتنی سی بات سے دونوں میں سر پھٹول ہوجائے! سچا سنگھ پہلے ہی گھر کے جھنجھٹوں سے گھبراتا ہے، اسے مزید جھنجھٹ میں ڈالنا مناسب نہیں۔ اچھا ہوا جو اس وقت سچا سنگھ نے بات نہیں سنی۔ وہ تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ منگل وار کو گھر نہیں آئے گا۔ اگر وہ سچ مچ نہ آیا تو؟ اور اگر اس نے ناراض ہوکر گھر آنا چھوڑ ہی دیا تو؟ نہیں! وہ اسے کبھی کوئی پریشان کرنے والی بات نہیں بتائے گی۔ سچا سنگھ خوش رہے، گھر کی پریشانیاں وہ خود سنبھال سکتی ہے۔

بالو کپکپا سی گئی۔ گاؤں کا لوٹو سنگھ اپنی بیوی کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اس کے پیچھے وہ ایک ایک ٹکڑے کے لیے ترس گئی تھی۔ آخر اس نے کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔ پانی سے پھول کر اُس کی لاش کیسی خوفناک ہوگئی تھی!

بالو کو تکان محسوس ہو رہی تھی، اس لیے وہ پیاؤ کے تخت پر جا کر بیٹھ گئی۔ اندھیرا ہونے کے ساتھ ساتھ کھیتوں کی ہلچل پر ایک سکوت سا طاری ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ماہیے کے گیت کی جگہ اب جھینگروں کے سنگیت نے لے لی تھی۔ ایک بس جالندھر کی جانب سے اور ایک نکودر سے آ کر نکل گئی۔ سچا سنگھ جالندھر سے آخری بس لے کر آتا تھا۔ بالو نے پچھلی بس کے ڈرائیور سے معلوم کر لیا تھا کہ اب جالندھر سے صرف ایک ہی بس آنا باقی ہے۔ اب جس بس کی بتیاں دکھائی دیں گی، وہ سچا سنگھ کی ہی بس ہوگی۔ تھکن کے مارے بالو کی آنکھیں مُندی جا رہی تھیں۔ وہ بار بار کوشش سے آنکھیں کھول کر دور تک کے اندھیرے میں دیکھتی اور نظر ان سایوں پر مرکوز کر دیتی جو دھیرے دھیرے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ذرا سی بھی آہٹ ہوتی تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ بس آ رہی ہے، اور وہ سنبھل کر بیٹھ جاتی۔ لیکن بتیوں کی روشنی دکھائی نہ دینے پر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر پھر نڈھال ہوجاتی۔ دو ایک بار وہ اپنی مندی ہوئی آنکھوں سے بس کی بتیاں اپنی جانب آتی دیکھ کر چونک اٹھی... لیکن وہاں کوئی بس نہیں آ رہی تھی۔ پھر اُسے یوں محسوس ہوا کہ وہ اپنے گھر میں ہے اور کوئی زور زور سے گھر کے کواڑ کھٹکھٹا رہا ہے۔ جنداں اندر سہمی بیٹھی ہے، اس کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا ہو رہا ہے... رہٹ کے بیل لگاتار گھوم رہے ہیں۔ ان کی گھنٹیوں کی تال کے ساتھ، پیپل کے نیچے بیٹھا ایک نوجوان کان پر ہاتھ دھرے ماہیا گا رہا ہے... بلا کی دھول اُڑ رہی ہے جو زمین اور آسمان کی ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیے چلی جا رہی ہے... وہ اپنی روٹی کی پوٹلی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہے، مگر وہ پوٹلی اس کے ہاتھ سے پھسلتی جا رہی ہے... پیاؤ پر خشک مٹکے رکھے ہیں جن میں پانی کی ایک بوند بھی نہیں ہے۔ وہ بار بار لوٹا

مٹکے میں ڈالتی ہے مگر اسے خالی پا کر مایوس ہو جاتی ہے...اس کے پیروں میں چھالے ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ کی انگلی سے ان پر تیل لگا رہی ہے مگر تیل لگاتے لگاتے ختم ہو جاتا ہے...جنداں اپنے کھلے بال گھٹنوں پر ڈالے رو رہی ہے۔ کہہ رہی ہے، ''تو مجھے چھوڑ کر کیوں گئی تھی؟ کیوں گئی تھی مجھے چھوڑ کر؟ ہائے میرا پرانداکہاں گیا؟ میرا پرانداکس نے لے لیا؟'' اور بالو اچانک اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کے لمس سے چونک اٹھی۔

''سچا سیاں!'' بالو نے فوراً اپنی آنکھوں کو ملا۔

''تو اب تک گھر نہیں گئی؟'' سچا سنگھ تخت پر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اس کی بس عین پیاؤ کے سامنے کھڑی تھی جس میں اس وقت ایک بھی سواری نہیں تھی۔ کنڈکٹر پچھلی سیٹ پر اونگھ رہا تھا۔

''میں نے سوچا روٹی دے کر ہی جاؤں گی... بیٹھے بیٹھے جھپکی آ گئی۔ تجھے آئے بہت دیر تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں، میں نے بس ابھی کھڑی کی ہے۔ میں نے تجھے دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ تو ایسی پاگل ہے کہ تب سے اب تک روٹی دینے کے لیے یہیں بیٹھی ہے؟''

''کیا کرتی؟ تو جو کہہ گیا تھا کہ میں گھر نہیں آؤں گا!'' اور اُس نے پلکیں جھپکا کر اپنے امڈتے آنسوؤں کو پی جانے کی کوشش کی۔

''اچھا لا، دے روٹی، اور گھر جا۔ جنداں وہاں اکیلی ڈر رہی ہوگی۔'' سچا سنگھ نے اس کی بانہہ تھپتھپا دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

روٹی والی پوٹلی اس سے لے کر، سچا سنگھ اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھے، اسے بس کے قریب لے آیا۔ پھر وہ اچک کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بس اسٹارٹ کرنے لگا تو بالو جیسے ڈرتے ڈرتے بولی، ''سچا سیاں، تو منگل وار کو گھر آئے گا نا؟''

''ہاں، آؤں گا۔ تجھے شہر سے کچھ منگوانا ہو تو بتا دے۔''

''نہیں، مجھے منگوانا کچھ نہیں ہے۔''

بس گھر گھرانے لگی تو بالو دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ سچا سنگھ نے اپنی ڈاڑھی اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرا، ایک ڈکار لی اور اس کی طرف دیکھ کر بولا، ''تو اُس وقت کیا بات بتانا چاہتی تھی؟''

''نہیں، ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ تو منگل کو گھر آئے گا ہی...''

''اچھا، اب جلدی سے چلی جا، دیر نہ کر۔ ایک میل کا راستہ ہے۔''

''سچا سیاں، کل گورپرب ہے۔ کل میں تیرے لیے کڑاہ پرشاد بنا کر لاؤں گی۔''

''اچھا اچھا...''

بس چل دی۔ بالو پہیوں کی دھول میں گھر گئی— دھول چھٹ جانے پر اس نے پلّو سے آنکھیں پونچھ لیں اور تب تک بس کی پچھلی لال بتی کو دیکھتی رہی جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

موہن راکیش

ہندی سے ترجمہ: بشیر عنوان

ایک اور زندگی

...اور ایک لمحے کے لیے پرکاش کے دل کی دھڑکن جیسے رکی رہی۔ کتنا عجیب تھا وہ لمحہ — آکاش سے ٹوٹ کر گرے ہوئے ستارے جیسا! کہرے کے سینے میں ایک لکیر سی کھینچ کر وہ لمحہ ماضی ہو گیا۔

کہرے میں سے گذر کر جاتی ہوئی شکلوں کو اس نے ایک بار پھر دھیان سے دیکھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ انسان کی آنکھیں اس حد تک اسے دھوکا دیں؟ تو جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، وہ سچ نہیں تھا؟

کچھ ہی لمحے پہلے جب وہ کمرے سے نکل کر بالکنی پر آیا تھا تو کیا اس نے تصور میں یہ سوچا تھا کہ آکاش کے اور چھور تک پھیلے ہوئے کہرے میں، گہرے پانی کی نچلی سطح پر تیرتی ہوئی مچھلیوں جیسی جو شکلیں نظر آ رہی ہیں، ان میں کہیں وہ دو شکلیں بھی ہوں گی؟ مندر والی سڑک سے آتے ہوئے دو کہریلے رنگوں پر جب اس کی نظر پڑی تھی، تب بھی کیا اس کے من میں کہیں ایسا شک جاگا تھا؟ پھر بھی نہ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا جیسے بہت دیر سے، بلکہ کئی دنوں سے، وہ ان کے وہاں سے گذرنے کا منتظر رہا ہو، جیسے کہ انھیں دیکھنے کے لیے ہی وہ کمرے سے نکل کر بالکنی پر آیا ہو اور انھیں کو ڈھونڈتی ہوئی اس کی آنکھیں مندر والی سڑک کی طرف مڑی ہوں۔ یہاں تک کہ اس دھانی آنچل اور نیلی نیکر کے رنگ بھی جیسے اس کے پہچانے ہوئے ہوں اور کہرے کے پھیلاؤ میں وہ ان دو رنگوں کو ہی کھوج رہا ہو۔ ویسے ان شکلوں کے بالکنی کے نیچے پہنچنے تک اس نے انھیں پہچانا نہیں تھا۔ لیکن ایک لمحے میں اچانک وہ شکلیں اس طرح اس کے سامنے واضح ہو اٹھی تھیں جیسے وجدان کے لمحے میں لاشعور کی گہرائی میں ڈوبا ہوا کوئی خیال ایکا ایک شعور کی سطح پر کوند گیا ہو۔

نیلی نیکر والی شکل گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کیا اسے بھی کہرے میں کسی کی کھوج تھی؟ اور

کس کی؟ پرکاش کا من ہوا کہ اسے آواز دے دے مگر اس کے گلے سے لفظ نہیں نکلے۔ کہرے کا سمندر اپنی گمبھیرتا میں خاموش تھا مگر اسے اس کی اپنی خاموشی ایک ایسے طوفان کی طرح لگتی تھی جو ہوا نہ ملنے سے اپنے اندر ہی گھمڑ کر رہ گیا ہو۔ نہیں تو کیا وہ اتنا ہی ناتواں تھا کہ اس کے گلے سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکے؟

وہ بالکنی سے ہٹ کر کمرے میں آ گیا۔ وہاں آتے ہی اپنے الٹ پلٹ سامان پر نظر پڑی تو جسم میں مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کیا یہی وہ زندگی تھی جس کے لیے اس نے...؟ لیکن اسے لگا کہ اس کے پاس کچھ بھی سوچنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اس نے جلدی جلدی کچھ چیزوں کو اٹھایا اور رکھ دیا، جیسے کوئی چیز ڈھونڈ رہا ہو جو اسے مل نہ رہی ہو۔ اچانک کھونٹی پر لٹکتی ہوئی پتلون پر نظر پڑی تو اس نے پاجامہ اتار کر جلدی سے اسے پہن لیا۔ پھر پل بھر کھویا سا کھڑا رہا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ کیا وہ ان دونوں کے پیچھے جانا چاہتا تھا؟ یا بالکنی پر کھڑا ہو کر پہلے کی طرح انھیں دیکھتے رہنا ہی چاہتا تھا؟

اچانک اس کا ہاتھ میز پر رکھے ہوئے ایک تالے پر پڑ گیا تو اس نے اسے اٹھا لیا۔ جلدی سے دروازہ بند کر کے وہ زینے سے اترنے لگا۔ زینے پر آ کر پتا چلا کہ جوتا نہیں پہنا۔ وہ پل بھر کے لیے ٹھٹک کر کھڑا رہا مگر لوٹ کر نہیں گیا۔ نیچے سڑک پر پہنچتے ہی پاؤں کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ دور دیکھا — وہ دونوں شکلیں گھوڑوں کے اڈے کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ وہ جلدی جلدی چلنے لگا۔ پاس سے گذرتے ہوئے ایک گھوڑے والے سے اس نے کہا کہ وہ آگے جا کر نیلی نیکر والے بچے کو روک لے — اس سے کہے کہ کوئی اس سے ملنے کے لیے پیچھے آ رہا ہے۔ گھوڑے والا گھوڑا دوڑتا ہوا گیا مگر ان دونوں کے پاس نہ رک کر ان سے آگے نکل گیا۔ وہاں جا کر اس نے نہ جانے کسے اس کا پیغام دے دیا۔

جلدی جلدی چلتے ہوئے بھی پرکاش کو لگ رہا تھا جیسے وہ بہت آہستہ چل رہا ہو، جیسے اس کے گھٹنے جکڑ گئے ہوں اور راستہ بہت، بہت لمبا ہو گیا ہو۔ اس کا من اس اندیشے سے بے چین تھا کہ اس کے پاس پہنچنے تک وہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر وہاں سے چل نہ دیں، اور جس دوری کو وہ ناپنا چاہتا تھا وہ جوں کی توں نہ بنی رہے۔ مگر جوں جوں فاصلہ کم ہو رہا تھا، اس کا کم ہونا بھی اسے اُکھر رہا تھا۔ کیا وہ جان بوجھ کر اپنے کو ایک ایسی صورت حال کی سمت لے جا رہا تھا جس سے اسے اپنے کو بچانا چاہیے تھا؟

ان لوگوں نے گھوڑے نہیں لیے تھے۔ جب وہ ان سے تین چار گز دور رہ گیا تو اچانک اس کے قدم رک گئے۔ تو کیا سچ مچ اب اسے اس صورت حال کا سامنا کرنا ہی تھا؟

''پاشی!'' اس سے پہلے کہ وہ طے کر پاتا، فوراً اس کے منہ سے نکل گیا۔

بچے کی بڑی بڑی آنکھیں اچانک اس کی طرف گھوم گئیں — ساتھ ہی اس کی ماں کی آنکھیں بھی۔ کہرے میں اچانک کئی کئی بجلیاں کوند گئیں۔ پرکاش دو ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ بچہ متحیر آنکھوں سے اس

کی طرف دیکھتا ہوا اپنی ماں کے ساتھ سٹ گیا۔

''پلاش، ادھر آ میرے پاس!'' پرکاش نے ہاتھ سے چٹکی بجاتے ہوئے کہا، جیسے کہ یہ ہر روز کی ایک معمول کی بات ہو اور بچہ ابھی کچھ منٹ پہلے ہی اس کے پاس سے اپنی ماں کے پاس گیا ہو۔

بچے نے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی آنکھیں ہٹا کر دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ بچہ اور بھی اس کے ساتھ سٹ گیا اور اس کی آنکھیں حیرت کے ساتھ ساتھ ایک شرارت سے چمک اٹھیں۔

پرکاش کو وہاں کھڑے کھڑے الجھن ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ خود چل کر اس دوری کو ناپنے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھر کر بچے کے پاس پہنچا اور اسے بانہوں سے اٹھالیا۔ بچے نے ایک بار کلکار کر اس کے ہاتھوں سے چھوٹنے کی کوشش کی، لیکن دوسرے ہی لمحے اپنی چھوٹی چھوٹی بانہیں اس کے گلے میں ڈال کر وہ اس سے لپٹ گیا۔ پرکاش اسے لیے ہوئے تھوڑا ایک طرف کو ہٹ آیا۔

''تو نے پاپا کو پہچانا نہیں تھا کیا؟''

''پیتانا تھا!'' بچہ بانہیں اس کے گلے میں ڈال کر جھولنے لگا۔

''تو تُو جھٹ سے پاپا کے پاس آیا کیوں نہیں؟''

''نہیں آیا،'' کہہ کر بچے نے اسے چوم لیا۔

''تو آج ہی یہاں آیا ہے؟''

''نہیں، تل آیا تھا۔''

''رہے گا یا آج ہی لوٹ جائے گا؟''

''ابھی تین چال دن لہوں دا۔''

''تو پاپا کے پاس ملنے آئے گا نا؟''

''آؤں دا۔''

پرکاش نے ایک بار اسے اچھی طرح اپنے ساتھ چمٹا کر چوم لیا تو بچہ چلا کر اس کے ماتھے، آنکھوں اور گالوں کو جگہ جگہ چومنے لگا۔

''کیسا بچہ ہے!'' پاس کھڑے ایک کشمیری مزدور نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم تہاں لہتے ہو؟'' بچہ بانہیں اس کی گردن میں ڈالے ہوئے، جیسے اسے اچھی طرح دیکھنے کے لیے تھوڑا پیچھے کو ہٹ گیا۔

''وہاں!'' پرکاش نے دور اپنے کمرے کی بالکنی کی طرف اشارہ کیا۔ ''تو کب تک وہاں آئے گا؟''

''اب اوپل جا کل دود پیوں دا، اچھ کے بعد تمالے پاچھ آؤں دا۔'' بچے نے ایک بار اپنی ماں کی طرف دیکھا اور اس کی بانہوں سے نکلنے کے لیے مچلنے لگا۔

''میں وہاں بالکنی میں کرسی ڈال کر بیٹھا رہوں گا اور تیرا انتظار کروں گا،'' بچہ بانہوں سے اتر کر اپنی ماں کی طرف بھاگ گیا تو پرکاش نے پیچھے سے کہا۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے آنکھیں بچے کی ماں سے مل گئیں، لیکن دوسرے ہی لمحے دونوں دوسری دوسری طرف دیکھنے لگے۔ بچہ جا کر ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گیا، تو وہ کہرے کے پار دیوداروں کی دھندلی ریکھاؤں کو دیکھتی ہوئی اس سے بولی، ''تجھے دودھ پی کر آج کھلن مرگ نہیں چلنا ہے کیا؟''

''نہیں،'' بچے نے اس کی ٹانگوں کے سہارے اچھلتے ہوئے سپاٹ جواب دیا، ''میں دود پی تل پاپا تے پاچھ جاؤں دا۔''

تین دن تین راتوں سے آسمان گھرا ہوا تھا۔ کہرا دھیرے دھیرے اتنا گھنا ہو گیا تھا کہ بالکنی سے آگے کوئی روپ، کوئی رنگ نظر نہیں آتا تھا— آسمان کے شفاف پن پر جیسے گاڑھا سفیدہ پوت دیا گیا تھا۔ جوں جوں وقت بیت رہا تھا، کہرا اور گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے کسی کسی لمحے محسوس ہونے لگتا تھا جیسے وہ بالکنی پہاڑیوں سے گھری ہوئی کھلی وسعت میں نہ ہو کر فضا کے کسی پراسرار پردیس میں بنی ہو— نیچے اور اوپر صرف آکاش ہی آکاش ہو، جس کی تہہ میں بالکنی کی موجودگی ایک اپنے آپ میں مکمل اور خودمختار دنیا کی طرح ہو...

اس کی آنکھیں اس طرح ایک ٹک سامنے کی طرف دیکھ رہی تھیں جیسے آسمان اور کہرے میں اسے کوئی معنی ڈھونڈنا ہو۔ جیسے وہ اپنی بالکنی کے وہاں ہونے کے راز کو جانتا ہو۔

ہوا سے کہرے کے بادل کئی روپ لے کر اِدھر سے اُدھر بھٹک رہے تھے— اپنی گہرائی میں پھیلتے اور سمٹتے ہوئے وہ اپنی تھاہ نہیں پا رہے تھے۔ بیچ میں کہیں کہیں دیوداروں کی پھننگیاں ایک ہری لکیر کی طرح نکلی ہوئی تھیں، کہرے کے آسمان پر لکھی گئی ایک خلط ملط تحریر جیسی۔ دیکھتے دیکھتے وہ لکیر بھی گم ہو جاتی تھی؛ کہرے کا ہاتھ اسے رہنے دینا نہیں چاہتا تھا۔ لکیر کو مٹتے دیکھ کر رگوں میں ایک تناؤ سا آ رہا تھا، جیسے کسی بھی طرح وہ اس لکیر کو مٹنے سے بچا لینا چاہتا ہے۔ لیکن جب ایک بار لکیر مٹ کر باہر نہیں نکلی تو اس نے سر پیچھے کو ڈال لیا اور خود بھی کہرے میں کہرا ہو کر پڑ رہا...

ماضی کے کہرے میں کہیں وہ ایک دن بھی تھا جو چار برس بیت جانے پر بھی آج تک بیت نہیں سکا تھا...

بچے کی پہلی سالگرہ تھی اس دن — وہی ان کے جیون کی سب سے بڑی گرہ بن گئی تھی۔

بیاہ کے کچھ مہینے بعد سے ہی پتی پتنی الگ الگ رہنے لگے تھے۔ بیاہ کے ساتھ جو رشتہ جڑنا چاہیے تھا وہ جڑ نہیں سکا تھا۔ دونوں الگ الگ جگہ کام کرتے تھے اور اپنا اپنا خود مختار تانا بانا بُن کر جی رہے تھے۔ زمانے کے دستور کے ناتے سال چھ مہینے میں کبھی ایک بار مل لیا کرتے تھے۔ وہ زمانے کا دستور ہی اس بچے کو دنیا میں لے آیا تھا...

بینا سمجھتی تھی کہ اس طرح جان بوجھ کر اسے پھنسا دیا گیا ہے۔ پرکاش سوچتا تھا کہ انجانے میں اس سے ایک گناہ ہو گیا ہے۔ لیکن پیدائش کے پانچویں یا چھٹے روز بچے کی حالت اچانک بہت خراب ہو گئی تو وہ اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا، ہوا میں بچے کے چہرے کو دیکھتا ہوا، کہتا رہا تھا، ''دیکھ، تجھے جینا ہے۔ تو اس طرح نہیں جا سکتا۔ سن رہا ہے؟ تجھے جینا ہے، ہر حالت میں جینا ہے۔ میں تجھے جانے نہیں دوں گا۔ سمجھا؟''

سال بھر سے بچہ ماں کے پاس ہی رہ رہا تھا۔ بیچ میں بچے کی دادی چھ سات مہینے اس کے پاس رہ آئی تھی۔

پہلی سالگرہ پر بینا نے لکھا تھا کہ وہ بچے کو لے کر اپنے پتا کے یہاں لکھنؤ جا رہی ہے۔ وہیں پر بچے کے جنم دن کی پارٹی کرے گی۔

پرکاش نے اسے تار دیا تھا کہ وہ بھی اس دن لکھنؤ آئے گا۔ اپنے ایک دوست کے یہاں حضرت گنج میں ٹھہرے گا۔ اچھا ہوگا کہ پارٹی وہیں پر کی جائے۔ لکھنؤ کے کچھ دوستوں کو بھی اس نے مطلع کر دیا تھا کہ اس کے بچے کی سالگرہ کے موقعے پر وہ اس کے ساتھ چائے پینے کے لیے آئیں۔

اس نے سوچا تھا کہ بینا اسے اسٹیشن پر مل جائے گی، لیکن وہ نہیں ملی۔ حضرت گنج پہنچ کر نہا دھو چکنے کے بعد اس نے بینا کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ وہاں پہنچ گیا ہے؛ کچھ لوگ ساڑھے چار پانچ بجے چائے پر آئیں گے، اس لیے وہ اس وقت تک بچے کو لے کر لازماً وہاں پہنچ جائے۔ لیکن پانچ بجے، چھ بجے، سات بج گئے، بینا بچے کو لے کر نہیں آئی۔ دوسری بار پیغام بھیجنے پر پتا چلا کہ وہاں ان لوگوں کی پارٹی چل رہی ہے۔ بینا نے کہلا بھیجا کہ بچہ آٹھ بجے تک فارغ نہیں ہوگا، اس لیے وہ اس وقت اسے لے کر نہیں آ سکتی۔ پرکاش نے اپنے دوستوں کو چائے پلا کر رخصت کر دیا۔ بچے کے لیے خریدے ہوئے تحفے بینا کے پتا کے یہاں بھیج دیے۔ ساتھ میں یہ پیغام بھی بھیجا کہ بچہ جب بھی فارغ ہو، اسے تھوڑی دیر کے لیے اس کے پاس بھیج دیا جائے۔

مگر آٹھ کے بعد نو بجے، دس بجے، بارہ بج گئے، لیکن بینا نہ تو بچے کو لے کر آئی اور نہ ہی اس نے اسے کسی اور کے ساتھ بھیجا۔

پرکاش رات بھر سویا نہیں۔ اس کے دماغ کو جیسے کوئی چھینی سے چھیلتا رہا۔

صبح اس نے پھر بینا کے پاس پیغام بھیجا۔ اس بار بینا بچے کو لے کر آ گئی۔ اس نے بتایا کہ رات کو پارٹی دیر تک چلتی رہی، اس لیے اس کا آنا ممکن نہیں تھا۔ اگر واقعی اسے بچے سے پیار تھا تو اس کا فرض تھا کہ وہ اپنے تحفے لے کر خود ان کے یہاں پارٹی میں آ جاتا...

اُس دن صبح سے شروع ہوئی بات آدھی رات تک چلتی رہی۔ پرکاش بار بار کہتا رہا، ''بینا، میں اس بچے کا پتا ہوں۔ پتا ہونے کے ناتے مجھے یہ حق تو ہے ہی کہ میں بچے کو اپنے پاس بلا سکوں۔''

لیکن بینا کا جواب تھا، ''آپ کے پاس پتا کا دل ہوتا تو کیا آپ پارٹی میں نہ آتے؟ آپ مجھ سے پوچھیں تو میں کہوں گی کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ ہی ہے کہ آپ اس کے پتا ہیں۔''

''بینا!'' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ''تم بتاؤ، تم چاہتی کیا ہو؟''

''کچھ بھی نہیں۔ میں آپ سے کیا چاہوں گی؟''

''تم نے سوچا ہے کہ اس بچے کے مستقبل کا کیا ہوگا؟''

''جب ہم اپنے ہی مستقبل کے بارے میں نہیں سوچ سکتے تو اس کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچیں گے۔''

''کیا تم یہ پسند کرو گی کہ بچے کو مجھے سونپ دو اور خود آزاد ہو جاؤ؟''

''بچے کو آپ کو سونپ دوں؟'' بینا کے لہجے میں تلخی گہری ہو گئی۔ ''اتنی بے وقوف میں نہیں ہوں۔''

''تو کیا تم یہی سوچتی ہو کہ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے عدالت میں جایا جائے؟''

''آپ عدالت میں جانا چاہیں تو مجھے اس پر بھی اعتراض نہیں ہے۔ ضرورت ہونے پر میں سپریم کورٹ تک لڑوں گی۔ آپ کا بچے پر کوئی حق نہیں ہے۔''

''بچے کو پتا سے زیادہ ماں کی ضرورت ہوتی ہے،'' کئی دن... کئی ہفتے وہ اندر ہی اندر جنگ کرتا رہا۔ ''جہاں اسے دونوں نہ مل سکتے ہوں وہاں اسے ماں تو ملنی ہی چاہیے۔ اچھا ہے، تم بچے کی بات بھول جاؤ اور نئے سرے سے اپنی زندگی بنانے کی کوشش کرو۔''

''مگر...''

''فضول کی حجت میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ بچے وچے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تم رشتہ توڑ کر پھر سے بیاہ کر لو تو گھر میں بچے ہی بچے ہو جائیں گے۔ سمجھ لینا کہ اس ایک بچے کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا...''

سوچنے سوچنے میں دن، ہفتے اور مہینے نکلتے گئے۔ کیا سچ مچ انسان پہلے کی زندگی کو مٹا کر نئے سرے سے زندگی شروع کر سکتا ہے؟ کیا سچ مچ زندگی کے کچھ برسوں کو ایک برے خواب کی طرح بھولنے کا حوصلہ

کیا جاسکتا ہے؟ بہت سے انسان ہیں جن کی زندگی کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی دوراہے سے غلط سمت کی جانب بھٹک جاتی ہے۔ کیا یہی مناسب نہیں کہ انسان اس راستے کو بدل کر اپنی غلطی سدھار لے؟ آخر انسان کو جینے کے لیے ایک ہی جیون تو ملتا ہے— وہی تجربے کے لیے اور وہی جینے کے لیے— تو کیوں انسان ایک تجربے کی ناکامی کو جیون کی ناکامی مان لے؟

کورٹ میں کاغذ پر دستخط کرتے سے چھت کے پنکھے سے ٹکرا کر ایک چڑیا کا بچہ نیچے آ گرا۔

''ہائے ہائے، چڑیا مرگئی!'' کسی نے کہا۔

''مری نہیں، ابھی زندہ ہے،'' کوئی اور بولا۔

''چڑیا نہیں ہے، چڑیا کا بچہ ہے،'' کسی تیسرے نے کہا۔

''نہیں، چڑیا ہے۔''

''نہیں، چڑیا کا بچہ ہے۔''

''اسے اٹھا کر باہر ہوا میں چھوڑ دو۔''

''نہیں، یہیں پڑا رہنے دو۔ باہر اسے کوئی بلی کھا جائے گی۔''

''یہ یہاں آیا کس طرح؟''

''جانے کس طرح؟ روشن دان کے راستے آ گیا ہوگا۔''

''بے چارہ کیسے تڑپ رہا ہے!''

''شکر ہے پنکھے نے اسے کاٹ ہی نہیں دیا۔''

''کاٹ دیا ہوتا تو بلکہ اچھا تھا۔ اب اس طرح بے چارہ کیا جیے گا؟''

تب پتی پتنی دونوں نے کاغذ پر دستخط کر دیے تھے۔ بچہ اس سے کورٹ کے احاطے میں کووں کے پیچھے بھاگتا ہوا کلکاریاں مار رہا تھا۔ وہاں دھول اڑ رہی تھی اور چاروں طرف مٹیالی سی دھوپ پھیلی تھی۔

پھر وہی دن، ہفتے اور مہینے...

اڑھائی سال گذر جانے پر بھی پرکاش پھر سے زندگی شروع کرنے کا طے نہیں کر پایا تھا۔ اس عرصے میں بچہ تین بار اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ وہ نوکر کے ساتھ آتا تھا اور دن بھر رہ کر اندھیرا ہونے پر لوٹ جاتا تھا۔ پہلی بار وہ اس سے شرماتا رہا تھا، مگر بعد میں اس سے ہل گیا تھا۔ پرکاش بچے کو لے کر گھومنے جاتا تھا، اسے آئس کریم کھلاتا تھا، کھلونے لے دیتا تھا۔ بچہ جانے کے وقت ہٹ کرتا تھا، ''ابی نہیں

جاؤں دا۔ دود پی تل جاؤں دا۔ تھانا تھا تل جاؤں دا۔''

جب بچہ اس طرح کی بات کہتا تھا تو اس کے اندر اچانک کوئی چیز سلگ اٹھتی تھی۔ اس کا من ہوتا تھا کہ نوکر کو جھڑک کر واپس بھیج دے اور بچے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لے۔ جب نوکر بچے سے کہتا تھا، ''بابا، چلو، اب دیر ہو رہی ہے،'' تو پرکاش کا جسم ایک بے بس غصے سے کانپنے لگتا اور بہت مشکل سے وہ اپنے کو سنبھال پاتا۔ آخری بار بچہ رات کے نو بجے تک رکا رہ گیا تھا تو ایک اجنبی شخص اسے لینے کے لیے چلا آیا تھا۔

بچہ اس وقت اس کی گودی میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔

''دیکھیے، اب بچے کو بھیج دیجیے، اسے بہت دیر ہو گئی ہے،'' اجنبی نے آ کر کہا۔

''آپ دیکھ رہے ہیں بچہ کھانا کھا رہا ہے!'' اس کا من ہوا کہ مکا مار کر اس آدمی کے دانت توڑ دے۔

''ہاں، ہاں، آپ کھانا کھلا دیجیے،'' اجنبی نے شائستگی کے ساتھ کہا۔ ''میں نیچے انتظار کر رہا ہوں۔''

غصے کے مارے پرکاش کے ہاتھ اس طرح کانپنے لگے کہ اس کے لیے بچے کو کھانا کھلانا ناممکن ہو گیا۔

جب نوکر بچے کو لے کر چلا گیا تو اس نے دیکھا کہ بچے کی ٹوپی وہیں پر رہ گئی ہے۔ وہ ٹوپی لیے ہوئے بھاگ کر نیچے پہنچا تو دیکھا کہ نوکر اور اجنبی کے علاوہ بچے کے ساتھ کوئی اور بھی ہے — اس کی ماں۔ وہ لوگ چالیس پچاس گز آگے پہنچ گئے تھے۔ اس نے نوکر کو آواز دی تو چاروں نے مڑ کر ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ نوکر ٹوپی لینے کے لیے لوٹ آیا اور باقی تینوں آگے چلتے رہے۔

اُس رات وہ ایک دوست کی چھاتی پر سر رکھ کر دیر تک روتا رہا۔

نئے سرے سے پھر وہی سوال من میں اٹھنے لگا۔ کیوں وہ اپنے کو اس ماضی سے پوری طرح آزاد نہیں کر لیتا؟ اگر بسا ہوا گھر بار ہو تو اپنے آس پاس بچوں کی چہل پہل میں وہ اس دکھ کو بھول نہیں جائے گا؟ اس نے اپنے کو بچے سے اسی لیے تو الگ کیا تھا کہ اپنے جیون کو ایک نیا موڑ دے سکے — پھر وہ اس طرح اکیلی زندگی کی اذیت کس لیے سہہ رہا تھا؟

لیکن نئے سرے سے جیون شروع کرنے کی خواہش میں سدا ایک اندیشہ ملا رہتا تھا۔ وہ اس اندیشے سے جتنا لڑتا تھا، وہ اتنا ہی اور بے قابو ہو اٹھتا تھا۔ جب ایک تجربہ کامیاب نہیں ہوا تو یہ کیسے کہا جا سکتا تھا کہ دوسرا تجربہ کامیاب ہی ہوگا؟

وہ پہلے کی بھول کو دہرانا نہیں چاہتا تھا، اس لیے اس کے اندیشوں نے اسے بہت محتاط کر دیا تھا۔ وہ جس کسی لڑکی کو اپنی ہونے والی بیوی کے روپ میں دیکھتا، اسی کے چہرے میں اسے اپنی پہلی زندگی کی پرچھائیں نظر آنے لگتی۔ حالانکہ وہ واضح طور پر اس بارے میں کچھ بھی سوچ نہیں پاتا تھا، پھر بھی اسے لگتا تھا کہ وہ ایک ایسی ہی لڑکی کے ساتھ جیون گذار سکتا ہے جو ہر لحاظ سے بینا سے الٹ ہو۔ بینا میں بہت گھمنڈ تھا، وہ اس کے برابر پڑھی لکھی تھی، اس سے زیادہ کماتی تھی۔ اسے اپنی خود مختاری کا بہت مان تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ کسی بھی آزمائش کا وہ اکیلی رہ کر مقابلہ کر سکتی ہے۔ جسمانی لحاظ سے بھی بینا کافی لمبی اونچی تھی اور اس پر بھاری پڑتی تھی۔ بات چیت بھی کھلے مردانہ ڈھنگ سے کرتی تھی۔ وہ اب ایک ایسی لڑکی چاہتا تھا جو ہر طرح سے اس پر انحصار کرے، جس کی کمزوریاں ایک شوہر کے سہارے کی امید رکھتی ہوں۔

اور کچھ ایسی ہی لڑکی تھی نرملا — اس کے ایک گہرے دوست کرشن جونیجا کی بہن۔ اس نے دو ایک بار اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ بہت سیدھی سادی معصوم سی لڑکی تھی۔ بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں نیچے کو جھک جاتی تھیں۔ معمولی پڑھی لکھی تھی اور بہت سادہ انداز سے رہتی تھی۔ اسے دیکھ کر بے اختیار دل میں ہمدردی امنڈ آتی تھی۔ چھبیس ستائیس برس کی ہو کر بھی دیکھنے میں وہ اٹھارہ انیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ وہ جونیجا کے گھر کی مشکلات کو جانتا تھا۔ ان مشکلات کے باعث ہی شاید اتنی عمر تک اس لڑکی کا بیاہ نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے ساتھ نرملا کے بیاہ کی بات چلائی گئی تو اس کے دل کے کسی کونے میں سویا ہوا جوش اچانک جاگ اٹھا۔ اسے سچ مچ لگا جیسے اس کا کھویا ہوا جیون اسے واپس مل رہا ہو، جیسے اندر کی ایک ٹوٹی ہوئی آرزو پھر سے ٹھوس شکل حاصل کر رہی ہو۔ ہوا اور آسمان میں اسے ایک اور ہی لبھاؤ لگنے لگا، راستے میں بکتی ہوئی پھولوں کی مالائیں پہلے سے کہیں مہکیلی محسوس ہونے لگیں۔ نرملا بیاہ کر اس کے گھر میں آئی بھی نہیں تھی کہ وہ شام کو لوٹتے ہوئے اس کے لیے مالائیں خرید کر لانے لگا۔ اُس کے لیے اس نے ایک بڑا گھر لے لیا اور اسے سجانے کے لیے نیا نیا سامان خرید لیا۔ پاس میں زیادہ پیسے نہیں تھے اس لیے قرض لے لے کر بھی اس نے نرملا کے لیے نہ جانے کیا کچھ بنوا ڈالا۔

نرملا ہنستی ہوئی اس کے گھر میں آئی — اور ہنستی ہی رہی۔

پہلے تو کچھ دن وہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ ہنستی کیوں ہے۔ نرملا جب کبھی بغیر بات کے ہنسنا شروع کر دیتی اور دیر تک ہنستی رہتی، وہ خاموش ہو کر اسے دیکھتا رہتا۔ تین تین، چار چار سال کے بچے بھی اس طرح بے اختیار انداز سے نہیں ہنس سکتے تھے جیسے وہ ہنستی تھی۔ کوئی شخص اس کے سامنے گر جاتا یا کوئی چیز کسی کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جاتی تو اس کے لیے اپنی ہنسی روکنا ناممکن ہو جاتا۔ لگاتار دس دس منٹ تک وہ ہنسی سے بے حال رہتی۔ وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتا کہ ایسی باتوں پر نہیں ہنسا جاتا، تو نرملا کو اور بھی ہنسی چھوٹتی۔ وہ

اسے ڈانٹ دیتا تو وہ اسی طرح بے اختیار انداز سے بستر پر لیٹ کر ہاتھ پیر پٹکتی ہوئی رونے لگتی، چلا چلا کر اپنی مری ہوئی ماں کو پکارنے لگتی اور آخر میں بال بکھیر کر اور دیوی کا روپ دھار کے گھر بھر کو بد دعا دینے لگتی۔ کبھی اپنے کپڑے پھاڑ کر اِدھر اُدھر چھپا دیتی اور گہنے جوتوں کے اندر ڈال دیتی۔ کبھی اپنی بانہہ پر پھوڑے کا وہم کر کے دو دو دن اس کے درد سے کراہتی رہتی اور پھر اچانک تندرست ہو کر کپڑے دھونے لگتی اور صبح سے شام تک کپڑے ہی دھوتی رہتی۔

جب من شانت ہوتا، تو منھ گول کیے وہ انگوٹھا چوسنے لگتی۔

اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، پرکاش کے سامنے نرملا کے طرح طرح کے روپ آتے رہتے اور اس کا من ایک اندھے کنویں میں گرنے لگتا۔ راستے پر چلتے ہوئے اس کے چاروں طرف ایک خلا سا گھر آتا اور وہ کئی بار بھونچکا سا سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر سوچنے لگتا کہ وہ گھر سے کیوں آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے؟ اس کا کسی سے بھی ملنے اور کہیں بھی آنے جانے کو دل نہ کرتا۔ اس کا دل جس خلا میں بھٹکتا رہتا، اس میں کئی بار اسے ایک بچے کی کلکاریاں سنائی دینے لگتیں اور وہ بالکل ساکت ہو کر دیر دیر تک ایک ہی جگہ پر کھڑا یا بیٹھا رہتا۔ ایک بار چلتے چلتے کھمبے سے ٹکرا کر وہ نالی میں گر گیا۔ ایک بار بس پر چڑھنے کی کوشش میں نیچے گر جانے سے اس کے کپڑے پیچھے سے پھٹ گئے اور وہ اس سے بے خبر دوسری بس میں چڑھ کر آگے چل دیا۔ اسے پتا تب چلا جب کسی نے راستے میں اس سے کہا، ''جنٹل مین، تمھیں کیا گھر جا کر کپڑے بدل نہیں لینے چاہییں؟''

اسے لگتا تھا جیسے وہ جی نہ رہا ہو، صرف اندر ہی اندر گھٹ رہا ہو۔ کیا یہی وہ زندگی تھی جسے پانے کے لیے اس نے برسوں تک اپنے سے مقابلہ کیا تھا؟

اسے غصہ آتا کہ جونیجا نے اس کے ساتھ اس طرح کا دھوکا کیوں کیا؟ اس لڑکی کو کسی دماغی اسپتال میں بھیجنے کی جگہ اس کا بیاہ کیوں کر دیا؟ اس نے جونیجا کو اس معاملے میں خط لکھے، لیکن اس کی جانب سے اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے جونیجا کو بلا بھیجا تو وہ آیا بھی نہیں۔ وہ خود جونیجا سے ملنے کے لیے گیا تو اسے جواب ملا کہ نرملا اب اس کی بیوی ہے۔ نرملا کے میکے کے لوگوں کا اس معاملے سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔

اور نرملا گھر میں اسی طرح ہنستی اور روتی رہی...

''تم میرے بھائی سے کیا پوچھنے کے لیے گئے تھے؟'' وہ بچکانہ انداز اختیار کیے ہوئے کہتی۔ ''تم بینا کی طرح مجھے بھی طلاق دینا چاہتے ہو؟ کسی تیسری کو گھر میں لانا چاہتے ہو؟ مگر میں بینا نہیں ہوں! وہ ستی ناری نہیں تھی۔ میں ستی ناری ہوں۔ تم مجھے چھوڑنے کی بات بھی من میں لاؤ گے تو میں اس گھر کو جلا کر بھسم

کردوں گی— سارے شہر میں بھونچال لے آؤں گی۔ لاؤں بھونچال؟'' اور بانہیں پھیلا کر وہ کہنے لگتی، ''آ، بھونچال، آ...آ! میں ستی ناری ہوں۔ تو اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجادے۔ آ، آ، آ!''

وہ اسے بہلانے کی کوشش کرتا تو وہ کہتی، ''تم مجھ سے دور رہو۔ میرے جسم کو ہاتھ مت لگاؤ۔ میں ستی ہوں۔ دیوی ہوں۔ سادھوی ہوں۔ تم مجھے ناپاک کرنا چاہتے ہو؟ خراب کرنا چاہتے ہو؟ میرا تم سے بیاہ کب ہوا ہے؟ میں تو اب تک کنواری ہوں۔ چھوٹی سی معصوم بچی ہوں۔ سنسار کا کوئی بھی مرد مجھے نہیں چھو سکتا۔ میں روحانی زندگی جیتی ہوں۔ مجھے کوئی چھو کر دیکھے تو سہی!''

اور بال بکھیرے ہوئے اسی طرح بولتی ہوئی کبھی وہ گھر کی چھت پر پہنچ جاتی اور کبھی باہر نکل کر گھر کے آس پاس چکر کاٹنے لگتی۔ پرکاش نے دو ایک بار ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اس کا منھ بند کر دینا چاہا تو وہ اور بھی زور سے چلا اٹھی، ''تم میرا منھ بند کرنا چاہتے ہو؟ میرا گلا گھونٹنا چاہتے ہو؟ مجھے مارنا چاہتے ہو؟ تمھیں پتا ہے میں خود دیوی ہوں؟ میرے چاروں بھائی میرے چار شیر ہیں! وہ تمھیں نوچ نوچ کر کھا جائیں گے۔ انھیں پتا ہے ان کی بہن دیوی کا اپنا روپ ہے۔ کوئی میرا برا چاہے گا تو وہ اسے اٹھا کر لے جائیں گے اور کال کوٹھڑی میں بند کر دیں گے۔ میرے بڑے بھائی نے ابھی ابھی نئی کار لی ہے۔ میں اسے چٹھی لکھ دوں تو وہ ابھی کار لے کر آجائے گا اور ہاتھ پیر باندھ کر تمھیں کار میں ڈال کر لے جائے گا۔ چھ مہینے بند رکھے گا، پھر چھوڑے گا۔ تمھیں پتا نہیں وہ چاروں کے چاروں شیر کتنے ظالم ہیں۔ وہ راکشس ہیں راکشس۔ آدمی کی بوٹی بوٹی کاٹ دیں اور کسی کو پتا بھی نہ چلے۔ مگر میں انھیں نہیں بلاؤں گی۔ میں ستی ناری ہوں، اس لیے اپنے ستیہ سے ہی اپنی رکشا کروں گی!''

سب تدبیروں سے ہار کر پرکاش تھکا ہوا اپنے پڑھنے کے کمرے میں بند ہو کر پڑ جاتا تو آدھی رات تک وہ ساتھ کے کمرے میں اسی طرح بولتی رہتی۔ پھر بولتے بولتے اچانک چپ ہو جاتی اور تھوڑی دیر کے بعد اس کا دروازہ کھٹکھٹانے لگتی۔

''کیا بات ہے؟'' وہ کہتا۔

''اس کمرے میں میری سانس رک رہی ہے،'' نرملا جواب دیتی، ''دروازہ کھولو، مجھے اسپتال جانا ہے۔''

''اس وقت سو جاؤ،'' وہ کہتا، ''صبح تم جہاں کہو گی وہاں لے چلوں گا۔''

''میں کہتی ہوں دروازہ کھولو، مجھے اسپتال جانا ہے۔'' اور وہ زور زور سے دھکے دے کر دروازہ توڑنے لگتی۔

پرکاش دروازہ کھول دیتا تو وہ ہنستی ہوئی اس کے سامنے آجاتی۔

''تمھیں ہنسی کس بات کی آرہی ہے؟'' پرکاش کہتا۔

''تمھیں لگتا ہے میں ہنس رہی ہوں؟'' وہ اور بھی زور سے ہنسنے لگتی۔ ''یہ ہنسی نہیں، رونا ہے رونا!''

''تم اسپتال چلنا چاہتی ہو؟''

''کیوں؟''

''ابھی تم کہہ رہی تھیں...''

''میں اسپتال چلنے کے لیے کہاں کہہ رہی تھی؟ میں تو کہہ رہی تھی کہ مجھے اس کمرے میں ڈر لگتا ہے، میں یہاں تمھارے پاس سوؤں گی۔''

''دیکھو نرملا، اس وقت میرا من ٹھیک نہیں ہے۔ تم تھوڑی دیر میں چاہے میرے پاس آ جانا، مگر اس سمے تھوڑی دیر کے لیے...''

''میں کہتی ہوں، میں اکیلی اس کمرے میں نہیں سو سکتی۔ میرے جیسی معصوم بچی کیا کبھی اکیلی سو سکتی ہے؟''

''تم معصوم بچی نہیں ہو، نرملا!''

''تو تمھیں میں بڑی نظر آتی ہوں؟ ایک چھوٹی سی بچی کو بڑی کہتے تمھارے دل کو کچھ نہیں ہوتا؟ اس لیے کہ تم مجھے اپنے پاس سلانا نہیں چاہتے؟ مگر میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ تمھیں مجھے اپنے ساتھ سلانا پڑے گا۔ میں وِدھوا ہوں جو اکیلی سوؤں گی؟ میں سہاگن ناری ہوں۔ کوئی سہاگن کیا کبھی اکیلی سوتی ہے؟ میں بھانورے لے کر تمھارے گھر میں آئی ہوں، ایسے ہی اٹھا کر نہیں لائی گئی۔ دیکھتی ہوں تم کیسے مجھے اس کمرے میں بھیجتے ہو!'' اور وہ پرکاش کے پاس لیٹ کر اس سے لپٹ جاتی۔

کچھ دیر میں جب اس کے اعصاب پرسکون ہو جاتے تو لگاتار اسے چومتی ہوئی کہتی، ''میرا سہاگ! میرا چاند! میرا راجا! میں تمھیں کبھی اپنے سے الگ رکھ سکتی ہوں؟ تم میرے ساتھ ایک سو چھتیس برس کی عمر تک جیو گے۔ مجھے یہ اعزاز ملا ہوا ہے کہ میں ایک سو چھتیس برس کی عمر تک سہاگن رہوں گی۔ جس کی بھی مجھ سے شادی ہوتی، وہ ایک سو چھتیس برس کی عمر تک جیتا۔ تم دیکھ لینا میری بات سچی نکلتی ہے یا نہیں۔ میں ستی ناری ہوں اور ستی ناری کے منھ سے نکلی ہوئی بات کبھی جھوٹ نہیں ہو سکتی...''

''تم صبح میرے ساتھ اسپتال چلو گی؟'' پرکاش کہتا۔

''کیوں، مجھے کیا ہوا ہے جو اسپتال جاؤں گی؟ مجھے تو آج تک سر درد بھی نہیں ہوا۔ میں اسپتال کیوں جاؤں؟''

ایک دن پرکاش اس کے لیے کئی کتابیں خرید لایا۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید پڑھنے سے نرملا کو ایک سمت مل جائے اور وہ دھیرے دھیرے اپنے من کے اندھیرے سے باہر نکلنے لگے۔ مگر نرملا نے ان کتابوں

کو دیکھا تو منھ بنا کر ایک طرف ہٹا دیا۔

''یہ کتابیں میں تمھارے پڑھنے کے لیے لایا ہوں،'' پرکاش نے کہا۔

''میرے پڑھنے کے لیے؟'' نرملا حیرت کے ساتھ بولی۔ ''میں ان کتابوں کو پڑھ کر کیا کروں گی؟ میں نے تو مارکسزم، نفسیات اور سبھی کچھ چودہ سال کی عمر میں پڑھ لیا تھا۔ اب اتنی بڑی ہو کر میں یہ کتابیں پڑھنے لگوں گی؟''

اور اس کے پاس سے اٹھ کر انگوٹھا چوستی ہوئی وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

''پاپا!''

کہرے کے بادلوں میں بھٹکا ہوا ذہن اچانک بالکنی پر لوٹ آیا۔ کھلن مرگ کو جانے والی سڑک پر بہت سے لوگ گھوڑے دوڑاتے جا رہے تھے — ایک دھندلے نقش کی بجھی بجھی شبیہوں جیسے۔ ویسی ہی بجھی بجھی شکلیں کلب سے بازار کی طرف آ رہی تھیں۔ بائیں طرف برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی کی ایک چوٹی کہرے سے باہر نکل آئی تھی اور جانے کدھر سے آتی ہوئی سورج کی کرن نے اسے روشن کر دیا تھا۔ کہرے میں بھٹکے ہوئے کچھ پنچھی اڑتے ہوئے اس چوٹی کے سامنے آ گئے تو اچانک ان کے پنکھ سنہرے ہو اٹھے۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ پھر دھندلکے میں کھو گئے۔

پرکاش کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور جھانک کر نیچے سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ کیا وہ آواز پلاش کی نہیں تھی؟ لیکن سڑک پر دور دور تک ایسی کوئی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی جسے اس کی آنکھیں اس بچے کے روپ میں پہچان سکیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹورسٹ ہوٹل کے گیٹ تک جا کر وہ لوٹ آیا اور گلے پر ہاتھ رکھ کر، جیسے مایوسی کی چبھن کو روکے ہوئے، پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ دس کے بعد گیارہ، بارہ اور پھر ایک بھی بج گیا تھا اور بچہ نہیں آیا تھا۔ کیا بچے کے پہلے جنم دن کی واردات آج پھر دہرائی جانی تھی؟ مٹھیاں بند کیے ان پر ماتھا رکھ کر وہ بالکنی پر جھک گیا۔

''پاپا!''

اس نے چونک کر سر اٹھایا، وہی کہرا اور وہی دھندلی سنسان سڑک۔ دور گھوڑوں کی ٹاپوں اور دھیمی چال سے اس طرف کو آتا ہوا ایک کشمیری مزدور۔ کیا وہ آواز اسے اپنے کانوں کے پردوں کے اندر سے ہی سنائی دے رہی تھی؟

تبھی ان پردوں کے اندر دو ننھے پیروں کی آواز بھی گونج گئی اور اس کی بانہوں کے بہت پاس ہی بچے کا لہجہ کلکار اٹھا، ''پاپا!'' ساتھ ہی دو ننھی ننھی بانہیں اس کے گلے سے لپٹ گئیں اور بچے کے گھنے بال

اس کے ہونٹوں سے چھو گئے۔

پرکاش نے ایک بار بچے کے جسم کو سر سے پیر تک چھو کر دیکھ لیا کہ یہ بدن بھی اس کے تصور کا خواب تو نہیں ہے۔ یقین ہو جانے پر کہ بچہ سچ مچ اس کی گودی میں ہے، اس نے اس کے ماتھے اور آنکھوں کو کس کر چوم لیا۔

''تو میں جاؤں، پلاش؟'' ایک بھولی ہوئی مگر مانوس آواز نے پرکاش کو پھر چونکا دیا۔ اس نے گھور کر پیچھے دیکھا۔ کمرے کے دروازے کے باہر بینا دائیں طرف نہ جانے کس چیز پر آنکھیں گڑائے کھڑی تھی۔

''آپ؟...آ...آیئے آپ...!'' کہتا ہوا بچے کو بانہوں میں لیے پرکاش ہکا بکا سا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''نہیں، میں جا رہی ہوں،'' بینا نے پھر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ ''مجھے اتنا بتا دیجیے کہ بچہ کب تک لوٹ کر آئے گا؟''

''آپ... جب کہیں، تبھی بھیج دوں گا۔'' پرکاش بالکنی کی دہلیز لانگھ کر کمرے میں آ گیا۔

''چار بجے اسے دودھ پینا ہوتا ہے۔''

''تو چار بجے تک میں اسے وہاں پہنچا دوں گا۔''

''اس نے ہلکا سا سویٹر ہی پہن رکھا ہے۔ دوسرے پُل اوور کی ضرورت تو نہیں پڑے گی؟''

''آپ دے دیجیے۔ ضرورت پڑے گی تو میں اسے پہنا دوں گا۔''

بینا نے دہلیز کے اس طرف سے ہی پل اوور اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے پل اوور لے کر اسے شال کی طرح بچے کو اُڑھا دیا۔ ''آپ...'' اس نے بینا سے کہنا چاہا کہ وہ اندر آ جائے، مگر اس سے کہا نہیں گیا۔ بینا چپ چاپ زینے کی طرف چل دی۔ پرکاش کمرے سے نکل آیا۔ زینے سے بینا نے پھر کہا، ''دیکھیے، اسے آئس کریم مت کھلایئے گا۔ اس کا گلا بہت جلد خراب ہو جاتا ہے۔''

''اچھا۔''

بینا پل بھر رکی رہی۔ شاید اسے اور بھی کچھ کہنا تھا۔ مگر پھر بغیر کچھ کہے وہ نیچے اتر گئی۔ بچہ پرکاش کی گودی میں اچھلتا ہوا ہاتھ ہلاتا رہا، ''ممی، ٹاٹا! ٹاٹا!'' پرکاش اسے لیے بالکنی پر لوٹ آیا تو وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولا، ''پاپا، میں آئچھ کلیم جلول تھاؤں دا۔''

''ہاں ہاں، بیٹے!'' پرکاش اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ''جو تیرے من میں آئے سو کھانا، ہاں؟''

اور کچھ دیر کے لیے وہ اپنے کو، بالکنی کو اور یہاں تک کہ بچے کو بھی بھولا ہوا، آسمان کو دیکھتا رہا۔

کہرے کا پردہ دھیرے دھیرے اٹھنے لگا تو میلوں میں پھیلے ہوئے ہریالی کے رنگ منچ کی دھندلی لکیریں اچانک نمایاں ہوا ٹھیں۔

وہ دونوں گولف گراؤنڈ پار کر کے، کلب کی طرف جا رہے تھے۔ چلتے ہوئے بچے نے پوچھا، ''پاپا، آدمی کے دو ٹانگیں کیوں ہوتی ہیں؟ چار کیوں نہیں ہوتیں؟''

پرکاش نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا، ''ارے!''

''کیوں پاپا،'' بچہ بولا، ''تم نے ارے کیوں کہا ہے؟''

''تو اتنا صاف بول سکتا ہے تو اب تک تتلا کر کیوں بول رہا تھا؟'' پرکاش نے اسے بانہوں میں اٹھا کر ایک ملزم کی طرح اپنے سامنے کر لیا۔ بچہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پرکاش کو لگا کہ یہ ویسی ہی ہنسی ہے جیسی کبھی وہ خود ہنسا کرتا تھا۔ بچے کے چہرے کے خطوط سے بھی اسے اپنے بچپن کے چہرے کی یاد آنے لگی۔ اسے لگا جیسے ایکا ایک اس کا تیس برس پہلے کا چہرہ سامنے آ گیا ہو اور وہ خود اس چہرے کے سامنے ایک ملزم کی طرح کھڑا ہو۔

''ممی تو اچھے ہی اچھالدتا ہے،'' بچے نے کہا۔

''کیوں؟''

''میلے تو نہیں پتا۔ تم ممی چھے پوچھ لینا۔''

''تیری ممی تجھے زور سے ہنسنے سے بھی منع کرتی ہے؟'' پرکاش کو وہ دن یاد آ رہے تھے جب اس کے کھلکھلا کر ہنسنے پر بینا کانوں پر ہاتھ رکھ لیا کرتی تھی۔

بچے کی بانہیں اس کی گردن کے پاس کس گئیں۔ ''ہاں،'' وہ بولا، ''ممی تہتی ہے اچھے بچے جول چھے نہیں ہنچھتے۔''

پرکاش نے اسے بانہوں سے اتار دیا۔ بچہ اس کی انگلی پکڑے ہوئے گھاس پر چلنے لگا۔ ''تیوں پاپا،'' اس نے پوچھا، ''اچھے بچے جول چھے تیوں نہیں ہنچھتے؟''

''ہنستے ہیں، بیٹے!'' پرکاش نے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے کہا، ''سب اچھے بچے زور سے ہنستے ہیں۔''

''تو ممی میلے تو تیوں لوتی ہے؟''

''نہیں روکتی، بیٹے۔ اب وہ تجھے نہیں روکے گی۔ اور تو تتلا کر نہیں، ٹھیک سے بولا کر۔ تیری ممی تجھے اس کے لیے بھی منع نہیں کرتی۔ میں اس سے کہہ دوں گا۔''

''تو تم نے پہلے ممی جھے تیوں نہیں تہا؟''

''ایسے نہیں، کہہ کہ تم نے پہلے ممی سے کیوں نہیں کہا۔''

بچہ پھر ہنس دیا۔''تو تم نے پہلے ممی سے کیوں نہیں کہا؟''

''پہلے مجھے یاد نہیں رہا۔ اب یاد سے کہہ دوں گا۔''

کچھ دیر دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ پھر بچے نے پوچھا،''پاپا، تم میرے جنم دن کی پارٹی میں کیوں نہیں آئے؟ ممی کہتی تھی تم ولایت گئے ہوئے تھے۔''

''ہاں بیٹے، میں ولایت گیا ہوا تھا۔''

''تو پاپا، اب تم پھر سے ولایت نہیں جانا۔''

''کیوں؟''

''میرے کو اچھا نہیں لگتا۔ ولایت جا کر تمھاری شکل اور ہی طرح کی ہوگئی ہے۔''

پرکاش ایک روکھی سی ہنسی ہنسا اور بولا،''کیسی ہوگئی ہے شکل؟''

''پتا نہیں کیسی ہوگئی ہے۔ پہلے دوسری طرح کی تھی، اب دوسری طرح کی ہے۔''

''دوسری طرح کی کیسے؟''

''پتا نہیں۔ پہلے تمھارے بال کالے کالے تھے، اب سفید سفید ہوگئے ہیں۔''

''تم اتنے دن میرے پاس نہیں آئے، اسی لیے میرے بال سفید ہوگئے ہیں۔''

بچہ اتنے زور سے ہنسا کہ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔''ارے پاپا، تم تو ولایت گئے ہوئے تھے،'' اس نے کہا،''میں تمھارے پاس کیسے آتا؟ میں کیا اکیلا ولایت جا سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں جا سکتا؟ تو اتنا بڑا تو ہے۔''

''میں سچ مچ بڑا ہوں نا پاپا؟'' بچہ تالی بجاتا ہوا بولا،''تم یہ بات بھی ممی سے کہہ دینا۔ وہ کہتی ہیں میں ابھی بہت چھوٹا ہوں۔ میں چھوٹا نہیں ہوں نا پاپا؟''

''نہیں، تو چھوٹا کہاں ہے!'' کہہ کر پرکاش میدان میں دوڑنے لگا۔''تو بھاگ کر مجھے پکڑ۔''

بچہ اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں پٹکتا ہوا دوڑنے لگا، پرکاش کو پھر اپنے بچپن کی ایک بات یاد آئی۔ تب اسے دوڑتے دیکھ کر ایک بار کسی نے کہا تھا،''ارے یہ بچہ کیسے ٹانگیں پٹک پٹک کر دوڑتا ہے۔ اسے ٹھیک سے چلنا نہیں آتا ہے کیا؟''

بچے کی انگلی پکڑے ہوئے پرکاش کلب کے بار روم میں داخل ہوا تو بار مین عبداللہ اسے دیکھتے ہی

دور سے مسکرایا۔ ''صاحب کے لیے دو بوتل بیئر!'' اس نے پاس کھڑے بیرے سے کہا، ''صاحب آج اپنے ایک مہمان کے ساتھ آیا ہے۔''

''بچے کے لیے ایک گلاس پانی دے دو،'' پرکاش نے کاؤنٹر کے پاس پہنچ کر کہا، ''اسے پیاس لگی ہے۔''

''خالی پانی؟'' عبداللہ بچے کے بالوں کو پیار سے سہلانے لگا، ''اور سب دوستوں کو تو صاحب بیئر پلاتا ہے اور اس بے چارے کو خالی پانی؟'' اور ٹھنڈے پانی کی بوتل کھول کر وہ گلاس میں پانی ڈالنے لگا۔ جب وہ گلاس بچے کے منہ کے پاس لے آیا تو بچے نے وہ اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ ''میں اپنے آپ پیوں گا،'' اس نے کہا، ''میں چھوٹا تھوڑے ہی ہوں؟ میں تو بڑا ہوں۔''

''اچھا تو بڑا ہے؟'' عبداللہ ہنسا، ''تب تو تجھے پانی دے کر میں نے غلطی کی۔ بڑے لوگوں کو تو میں بیئر پلاتا ہوں۔''

''بیئر کیا ہوتا ہے؟'' بچے نے منہ سے گلاس ہٹا کر پوچھا۔

''بیئر ہوتا نہیں، ہوتی ہے۔'' عبداللہ نے جھک کر اسے چوم لیا۔ ''تجھے پلاؤں کیا؟''

''نہیں،'' کہہ کر بچے نے اپنی بانہیں پرکاش کی طرف پھیلا دیں۔ پرکاش اسے لے کر ڈیوڑھی کی طرف چلا تو عبداللہ بھی ان دونوں کے ساتھ ہی ساتھ باہر چلا آیا۔ ''کس کا بچہ ہے، صاحب؟'' اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''میرا لڑکا ہے،'' کہہ کر پرکاش بچے کو سیڑھی سے اتارنے لگا۔

عبداللہ ہنس دیا۔ ''صاحب بہت خوش دل آدمی ہے،'' اس نے کہا۔

''کیوں؟''

عبداللہ ہنستا ہوا سر ہلانے لگا۔ ''آپ کا بھی جواب نہیں ہے۔''

پرکاش غصے میں کچھ کہنے کو ہوا مگر اپنے کو روک کر بچے کو لیے ہوئے آگے چل دیا۔ عبداللہ ڈیوڑھی میں رکا ہوا پیچھے سے سر ہلاتا رہا۔ بیرا شیر محمد اندر سے نکل کر آیا، تو وہ پھر کھلکھلا کر ہنس دیا۔

''کیا بات ہے؟ اکیلا کھڑا کھڑا کیسے ہنس رہا ہے؟'' شیر محمد نے پوچھا۔

''صاحب کا بھی جواب نہیں ہے،'' عبداللہ کسی طرح ہنسی پر قابو پا کر بولا۔

''کس صاحب کا جواب نہیں ہے؟''

''اس صاحب کا،'' عبداللہ نے پرکاش کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس دن بولتا تھا کہ اس نے ابھی اسی سال شادی کی ہے اور آج بولتا ہے کہ یہ پانچ سال کا بابا اس کا لڑکا ہے۔ جب آیا تھا تو اکیلا تھا اور آج اس

کے لڑکا بھی ہوگیا!'' پرکاش نے ایک بار گھوم کر تیکھی نظر سے اس کی طرف دیکھ لیا۔ عبداللہ ایک بار پھر کھلکھلا اٹھا۔ ''ایسا خوش دل آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔''

''پاپا، گھاس ہری کیوں ہوتی ہے؟ لال کیوں نہیں ہوتی؟'' کلب سے نکل کر پرکاش نے بچے کو ایک گھوڑا کرائے پر لے دیا تھا۔ لینن مرگ کو جانے والی پگ ڈنڈی پر وہ خود اس کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہا تھا۔ گھاس کے ریشمی پھیلاؤ پر کہرے کا آسمان اس طرح جھکا ہوا تھا جیسے خواہش کا جنون اسے پھر سے گھر آنے کے لیے مجبور کر رہا ہو۔ بچہ پُرشوق آنکھوں سے آس پاس کی پہاڑیوں کو اور بیچ سے بہہ کر جاتی ہوئی پانی کی پتلی دھار کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی کچھ لمحوں کے لیے وہ اپنے کو بھولا رہتا، پھر کسی انجانے جذبے کے اثر سے کاٹھی پر اچھلنے لگتا۔

''ہر چیز کا اپنا رنگ ہوتا ہے،'' پرکاش نے بچے کی ایک جانگھ کو ہاتھ سے دبائے ہوئے کہا اور کچھ دیر کے لیے خود بھی ہریالی کے پھیلاؤ میں کھو یا رہا۔

''ہر چیز کا اپنا رنگ کیوں ہوتا ہے؟''

''یہ قدرت کی بات ہے۔ بیٹے، قدرت نے ہر چیز کا اپنا رنگ بنا دیا ہے۔''

''قدرت کیا ہوتی ہے؟''

پرکاش نے جھک کر اس کی جانگھ کو چوم لیا۔ ''قدرت یہ ہوتی ہے،'' اس نے ہنس کر کہا۔ جانگھ پر گدگدی ہونے سے بچہ بھی ہنسنے لگا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو،'' اس نے کہا۔

''کیوں؟''

''تم کو اس کا پتا ہی نہیں ہے۔''

''اچھا، مجھے پتا نہیں ہے تو تو بتا گھاس کا رنگ ہرا کیوں ہوتا ہے؟''

''گھاس مٹی کے اندر سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے اس کا رنگ ہرا ہوتا ہے۔''

''اچھا؟ تم کو اس کا پتا چل گیا؟''

بچہ اچھلتا ہوا لگام کو جھٹکنے لگا۔ ''میرے کو ممی نے بتایا تھا۔''

پرکاش کے ہونٹوں پر ادھوری سی مسکراہٹ آ گئی، جسے اس نے کسی طرح دبا لیا۔ اسے لگا جیسے آج بھی اس کے اور بینا کے بیچ میں معرکہ چل رہا ہو اور بینا اس معرکے میں اس پر بھاری پڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ''تیری ممی نے تجھے اور کیا کیا بتا رکھا ہے؟'' وہ بچے کو تھپتھپا کر بولا۔ ''یہ بھی بتا رکھا ہے کہ آدمی کے دو

ٹانگیں کیوں ہوتی ہیں اور چار کیوں نہیں؟''

''ہاں، ممی کہتی تھی کہ آدمی کے دو ٹانگیں اس لیے ہوتی ہیں کہ وہ آدھا زمین پر چلتا ہے اور آدھا آسمان میں۔''

''اچھا؟'' پرکاش کے ہونٹوں پر ہنسی اور دل میں اداسی کی لکیر پھیل گئی۔ ''مجھے اس کا پتا نہیں تھا،'' اس نے کہا۔

''تم کو تو کچھ بھی پتا نہیں ہے، پاپا!'' بچہ بولا، ''اتنے بڑے ہو کر بھی پتا نہیں ہے!''

گھاس، برف اور آسمان کے رنگ دن میں کئی کئی بار بدل جاتے تھے۔ بدلتے ہوئے رنگوں کے ساتھ دل بھی اور سے اور ہونے لگتا تھا۔ صبح اٹھتے ہی پرکاش بچے کے آنے کا انتظار کرنے لگتا۔ بار بار وہ بالکنی پر چلا جاتا اور ٹورسٹ ہوٹل کی طرف آنکھیں کیے دیر دیر تک کھڑا رہتا۔ ناشتہ کرنے یا کھانا کھانے کے لیے بھی وہ وہاں سے نہیں ہٹنا چاہتا تھا۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ بچہ اس بیچ آ کر لوٹ نہ جائے۔ تین دن میں اسے ساتھ لیے ہوئے وہ کتنی ہی بار گھومنے کے لیے گیا تھا، اس کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے دوڑا تھا اور اس کے ساتھ گھاس پر لوٹتا رہا تھا۔ کبھی ایک دوست کی طرح وہ اس کے ساتھ کھلکھلا کر ہنستا، کبھی ایک نوکر کی طرح اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا۔ بچہ جان بوجھ کر راستے کے کیچڑ میں اپنے پاؤں لت پت کر لیتا اور پھر ہونٹ بسور کر کہتا، ''پاپا، پاؤں دھوؤ۔'' وہ اسے اٹھائے ہوئے اِدھر اُدھر پانی ڈھونڈتا پھرتا۔ بچے کو وہ جس زاویے سے بھی دیکھتا، اسی زاویے سے اس کی تصویر لے لینا چاہتا۔ جب بچہ تھک جاتا اور لوٹ کر اپنی ممی کے پاس جانے کی ہٹ کرنے لگتا تو وہ اسے طرح طرح کے لالچ دے کر اپنے پاس روک رکھنا چاہتا۔ ایک بار اس نے بچے کو اپنی ماں کے ساتھ دور سے آتے دیکھا تھا اور اسے ساتھ لانے کے لیے اتر کر نیچے چلا گیا تھا۔ جب وہ پاس پہنچا تو بچہ دوڑ کر اس کی طرف آنے کی بجائے ماں کے ساتھ فوٹو گرافر کی دکان کے اندر چلا گیا۔ وہ کچھ دیر سڑک پر رکا رہا؛ پھر یہ سوچ کر اوپر چلا آیا کہ فوٹو گرافر کی دکان سے فارغ ہو کر بچہ اپنے آپ اوپر آ جائے گا۔ مگر بالکنی پر کھڑے کھڑے اس نے دیکھا کہ بچہ دکان سے نکل کر اس طرف آنے کی بجائے ہٹ کے ساتھ اپنی ماں کا ہاتھ کھینچتا ہوا اسے واپس ٹورسٹ ہوٹل کی طرف لے چلا۔ اس کا من ہوا کہ دوڑ کر جائے اور بچے کو اپنے ساتھ لے آئے، مگر کوئی چیز اس کے پیروں کو جکڑے رہی اور وہ چپ چاپ وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ شام تک وہ نہ جانے کتنی بار بالکنی پر آیا اور کتنی کتنی دیر تک کھڑا رہا۔ آخر اس سے نہیں رہا گیا تو اس نے نیچے جا کر کچھ چیری خریدی اور بچے کو دینے کے بہانے ٹورسٹ ہوٹل کی طرف چل دیا۔ ابھی وہ ٹورسٹ ہوٹل سے کچھ ہی دور تھا کہ بچہ اپنی ماں کے ساتھ باہر آتا دکھائی دیا۔ مگر اس پر نظر پڑتے ہی وہ

واپس ہوٹل کی گیلری میں بھاگ گیا۔

پرکاش جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ اس سے پہلی بار اس کی آنکھیں بینا سے ملیں۔ اسے محسوس ہوا کہ بینا کا چہرہ پہلے سے کہیں سانولا ہو گیا ہے اور اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ دائرے سے ابھر آئے ہیں۔ وہ پہلے سے کافی دبلی بھی لگ رہی تھی۔ کچھ لمحے رکے رہنے کے بعد پرکاش آگے چلا گیا اور چیری والا لفافہ بینا کی طرف بڑھا کر اس نے خشک گلے سے کہا، ''یہ میں بچے کے لیے لایا تھا۔''

بینا نے لفافہ لے لیا مگر ساتھ ہی اس کی آنکھیں دوسری طرف ہٹ گئیں۔ ''پلاش!'' اس نے کچھ روکھی آواز میں بچے کو پکار کر کہا، ''یہ لے، تیرے پاپا تیرے لیے چیری لائے ہیں۔''

''میں نہیں لیتا!'' بچے نے گیلری سے کہا اور بھاگ کر اور بھی دور چلا گیا۔

بینا نے ایک بے بس نظر بچے پر ڈالی اور پھر پرکاش کی طرف دیکھ کر بولی، ''کہتا ہے میں پاپا سے نہیں بولوں گا۔ وہ صبح رکے کیوں نہیں، چلے کیوں گئے تھے۔''

پرکاش بینا کو جواب نہ دے کر گیلری میں چلا گیا اور کچھ دور تک بچے کا پیچھا کر کے اسے بانہوں میں اٹھا لایا۔ ''میں تم سے نہیں بولوں گا، کبھی نہیں بولوں گا!'' بچہ چھڑانے کی کوشش کرتا ہوا کہتا رہا۔

''کیوں، ایسی کیا بات ہے؟'' پرکاش اسے پچکارنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''پاپا سے بھی اس طرح ناراض ہوتے ہیں کیا؟''

''تم نے میری تصویریں کیوں نہیں دیکھیں؟''

''کہاں تھیں تیری تصویریں؟ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔''

''پتا کیوں نہیں تھا؟ تم دکان کے باہر سے ہی کیوں چلے گئے تھے؟''

''اچھا لا، پہلے تیری تصویریں دیکھیں، پھر گھومنے چلیں گے۔''

''یہ صبح آپ کو دکھانے کے لیے ہی تصویریں لینے گیا تھا،'' بینا کے ساتھ کھڑی لڑکی نے کہا۔ پرکاش اس بات کو بھول ہی گیا تھا کہ ان دونوں کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔

''تصویریں میرے پاس تھوڑے ہی ہیں۔ اُس کے پاس ہیں۔''

''صبح فوٹوگرافر نے نگیٹو ہی دکھائے تھے، پازیٹو وہ اب اس وقت دے گا،'' اس لڑکی نے پھر کہا۔

''تو چل، پہلے دکان پر چل کر تیری تصویریں لے لیں۔ ہاں، دیکھیں تو سہی کیسی تصویریں ہیں!'' کہہ کر پرکاش فوٹوگرافر کی دکان کی طرف چلنے لگا۔

''میں ممی کو ساتھ لے کر جاؤں گا،'' بچے نے اس کی بانہوں میں مچلتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں، تیری ممی بھی ساتھ آ رہی ہیں،'' پرکاش نے ایک بار بے اختیاری نظر سے پیچھے کی طرف

دیکھ لیا اور جیسے کسی نادیدہ شخص سے کہا، ''دیکھیے، آپ بھی ساتھ آ جایئے، نہیں تو یہ رونے لگا۔''

بینا ہونٹ دانتوں میں دبائے ہوے، کچھ لمحے آنکھیں جھپکتی رہی، پھر چپ چاپ ساتھ چل دی۔

فوٹو گرافر کی دکان میں داخل ہوتے ہی بچہ پرکاش کی بانہوں سے اتر آیا اور حکم کے لہجے میں فوٹو گرافر سے بولا، ''میرے پاپا کو میری تصویریں دکھاؤ۔'' اس کے لہجے سے کچھ ایسا بھی لگتا تھا جیسے وہ اپنے پر لگائے گئے کسی الزام کا جواب دے رہا ہو۔ فوٹو گرافر نے تصویریں نکال کر میز پر پھیلا دیں تو بچہ ان میں سے ایک ایک تصویر چن کر پرکاش کو دکھانے لگا۔ ''دیکھو پاپا، یہ وہیں کی تصویر ہے نا جہاں سے تم نے کہا تھا کہ سارا کشمیر نظر آتا ہے؟... اور یہ تصویر بھی دیکھو پاپا، جو تم نے میرے گھوڑے پر اتاری تھی...''

''دو دن سے بالکل صاف بولنے لگا ہے،'' بینا کی سہیلی نے دھیرے سے کہا، ''کہتا ہے پاپا نے کہا ہے کہ تو بڑا ہو گیا ہے، اس لیے اب تتلا کر نہ بولا کر۔''

پرکاش کچھ نہ کہہ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ پھر جیسے کچھ یاد آنے پر اس نے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر فوٹو گرافر کو دیتے ہوے کہا، ''اس میں سے آپ اپنے پیسے کاٹ لیجیے۔''

فوٹو گرافر پل بھر الجھن میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا، ''دیکھیے، پیسے تو ابھی آپ ہی کے میری طرف نکلتے ہیں۔ میم صاحب نے جو بیس روپے پرسوں دیے تھے، ان میں سے دو ایک روپے ابھی بچتے ہوں گے۔ کہیں تو حساب کر دوں؟''

''نہیں، رہنے دیجیے، حساب پھر ہو جائے گا،'' کہہ کر پرکاش نے نوٹ واپس جیب میں رکھ لیا اور بچے کی انگلی پکڑے ہوے دکان سے باہر نکل آیا۔ کچھ قدم چلنے پر اسے پیچھے سے بینا کا فقرہ سنائی دیا، ''یہ آپ کے ساتھ گھومنے جا رہا ہے کیا؟''

''ہاں!'' پرکاش نے چونک کر پیچھے دیکھ لیا۔ ''میں ابھی تھوڑی دیر میں اسے واپس چھوڑ جاؤں گا۔''

''دیکھیے، آپ سے ایک بات کہنی تھی...''

''کہیے...''

بینا پل بھر سوچتی ہوئی چپ رہی۔ پھر بولی، ''اسے ایسی کوئی بات نہ بتایئے گا جس سے یہ...''

پرکاش کو لگا جیسے کوئی چیز اس کے اعصاب کو چیرتی چلی گئی ہو۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں اور اس نے دھیرے سے کہا، ''نہیں. میں ایسی کوئی بات اس سے نہیں کہوں گا۔'' اسے ملال ہونے لگا کہ ایک دن پہلے جب بچہ ہٹ کر کے کہہ رہا تھا کہ ''پاپا'' اور ''پتاجی'' ایک ہی شخص کو نہیں کہتے — ''پاپا'' پاپا کو کہتے ہیں اور ''پتاجی'' ممی کے پاپا کو کہتے ہیں — تو وہ کیوں اس کی غلط فہمی دور کرنے کا جتن کرتا رہا تھا؟

وہ بچے کے ساتھ اکیلا کلب کی سڑک پر چلنے لگا تو کچھ دور جا کر بچہ اچانک رک گیا۔ ''ہم کہاں جا

رہے ہیں پاپا؟'' اس نے پوچھا۔

''پہلے کلب چل رہے ہیں،'' پرکاش نے کہا،''وہاں سے گھوڑا لے کر آگے گھومنے جائیں گے۔''

''نہیں، میں وہاں اس آدمی کے پاس نہیں جاؤں گا،'' کہہ کر بچہ اچانک پیچھے کی طرف چل دیا۔

''کس آدمی کے پاس؟''

''وہ جو وہاں پر کلب میں تھا۔ میں اس کے ہاتھ سے پانی بھی نہیں پیوں گا۔''

''کیوں؟''

''مجھے وہ آدمی اچھا نہیں لگتا۔''

پرکاش پل بھر بچے کے چہرے کو دیکھتا رہا، پھر وہ بھی واپس چل دیا۔''ہاں، ہم اس آدمی کے پاس نہیں چلیں گے،'' اس نے کہا۔''مجھے بھی وہ آدمی اچھا نہیں لگتا۔''

بہت دنوں کے بعد اُس رات پرکاش کو گہری نیند آئی تھی۔ ایک ایسی غافل نیند جس میں خواب، بدخوابی، کچھ نہ ہو، اس کے لیے لگ بھگ بھولی ہوئی چیز ہو چکی تھی۔ پھر بھی جاگنے پر اسے اپنے اندر تازگی کا احساس نہیں ہوا— احساس ہوا ایک خالی پن کا ہی۔ جیسے کہ کوئی چیز اس کے اندر ابلتی رہی ہو، جو گہری نیند سو لینے سے ختم ہو گئی ہو۔ روز کی طرح اٹھ کر وہ بالکنی پر گیا۔ دیکھا آسمان صاف ہے۔ رات کو سویا تھا تو بارش ہو رہی تھی، لیکن اس دھلے نکھرے ہوئے آسمان کو دیکھ کر شبہ تک نہیں ہوتا تھا کہ کبھی وہاں بادلوں کا وجود بھی تھا۔ سامنے کی پہاڑیاں صبح کی دھوپ میں نہا کر بہت اجلی ہو اٹھی تھیں۔

پرکاش کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ خاموش اور خالی ذہن۔ پھر اچانک دور کے گوشے میں اٹھتے ہوئے بادل کی طرح اسے کوئی چیز اپنے میں امنڈتی ہوئی ظاہر ہوئی اور اس کا من ایک انجانے خدشے سے کانپ گیا۔ تو کیا...؟

وہ بالکنی سے ہٹ آیا۔ پچھلی شام کو بچے نے بتایا تھا کہ اس کی ممی کہہ رہی ہے کہ دن صاف ہوا تو صبح وہ لوگ وہاں سے چلے جائیں گے۔ رات کو جس طرح بارش ہو رہی تھی، اس سے صبح تک آکاش کے صاف ہونے کی کوئی امید نہیں لگتی تھی، اس لیے سونے کے وقت اس کا ذہن اس طرف سے لگ بھگ مطمئن تھا۔ لیکن رات رات میں آسمان کا منظر بالکل بدل گیا تھا۔ تو کیا سچ مچ آج ہی ان لوگوں کو وہاں سے چلے جانا تھا؟

اس نے کمرے کے بکھرے ہوئے سامان کو دیکھا۔ دو چار ا‌ئی گنی چیزیں ہی تھیں۔ چاہا کہ انھیں سنبھال دے، مگر کسی چیز کو رکھنے اٹھانے کو من نہیں ہوا۔ بستر کو دیکھا جس پر روز سے بہت کم سلوٹیں پڑی

تھیں۔ لگا جیسے رات کی گہری نیند کے لیے وہ بستر ہی قصوروار ہو، اور گہری نیند ہی برستے ہوئے آسمان کے صاف ہو جانے کے لیے! اس نے بستر کی چادر کو ہلا دیا کہ اس میں اور سلوٹیں پڑ جائیں مگر اس سے چادر میں جو دو ایک سلوٹیں تھیں، وہ بھی نکل گئیں۔ وہ پھر سے ایک نیند لینے کے ارادے سے بستر پر لیٹ گیا۔

جسم میں تکان بالکل نہیں تھی، اس لیے نیند نہیں آئی۔ کچھ دیر کروٹیں لینے کے بعد وہ نہانے دھونے کے لیے اٹھ گیا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے صبح دوپہر کی طرف بڑھنے لگی تو اس کے من کو کچھ سہارا ملنے لگا۔ وہ چاہنے لگا کہ اسی طرح شام ہو جائے اور پھر رات — اور بچہ اس سے وداع لینے کے لیے نہ آئے۔ لیکن اسی طرح جب دوپہر بھی ڈھلنے کو آ گئی اور بچہ نہیں آیا تو اس کے من میں دھیرے دھیرے ایک اور ہی تشویش سر اٹھانے لگی۔ وہ سوچنے لگا کہ دن صاف ہونے سے اس کی ممی کہیں صبح صبح ہی تو اسے لے کر وہاں سے نہیں چلی گئی؟

وہ بار بار بالکنی پر آتا، ایک دھڑکتی ہوئی امید اور تشویش لیے ہوئے بار بار ٹورسٹ ہوٹل کی طرف جانے والے راستے پر نظر ڈالتا اور ایک غیر یقینی سی کیفیت لیے ہوئے کمرے میں لوٹ آتا۔ اس کی رگوں میں لہو کا ہر قطرہ، دماغ میں خیال کا ہر نقطہ، اضطراب سے بے کل تھا۔ اس نے کچھ کھایا نہیں تھا، اس لیے بھوک بھی اسے پریشان کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد کمرہ بند کر کے وہ کھانا کھانے چلا گیا۔ موٹے موٹے لقمے نگل کر اس نے کسی طرح دو روٹیاں گلے سے اتاریں اور فوراً واپس چل پڑا۔ کچھ لمحوں کے لیے بھی کمرے سے باہر اور بالکنی سے دور رہنا اسے ایک جرم کی طرح لگ رہا تھا۔ لوٹتے ہوئے اس نے سوچا کہ اسے خود ٹورسٹ ہوٹل میں جا کر پتا کر لینا چاہیے کہ وہ لوگ وہیں ہیں یا چلے گئے ہیں۔ مگر سڑک کی چڑھائی چڑھتے ہوئے اس نے دور سے ہی دیکھا — بینا بچے کے ساتھ اس کی بالکنی کے نیچے کھڑی تھی۔ وہ ہانپتا ہوا تیز تیز چلنے لگا۔

وہ پاس جا پہنچا تو بھی بچے نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ اپنی ماں کا ہاتھ کھینچتا ہوا کسی بات کے لیے ہٹ کر رہا تھا۔ پرکاش نے اس کی بانہہ کو ہاتھ میں لے لیا تو وہ اس سے بانہہ چھڑانے کا جتن کرنے لگا۔ ''میں تمھارے گھر نہیں جاؤں گا!'' اس نے لگ بھگ چیخ کر کہا۔ پرکاش ہڑبڑا گیا اور مورکھ سا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''کیوں، تو مجھ سے ناراض ہے کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''ممی میرے ساتھ کیوں نہیں چلتی؟'' بچہ پھر اسی طرح چلایا۔

پرکاش اور بینا کی آنکھیں ایک دوسرے کی طرف اٹھنے کو ہوئیں، مگر پوری طرح نہیں اٹھ پائیں۔

پرکاش نے بچے کی بانہہ پھر تھام لی اور بینا سے کہا، ''آپ بھی ساتھ آ جایئے نا!''

''اسے آج جانے کیا ہوا ہے!'' بینا جھنجھلاہٹ کے ساتھ بولی، ''صبح سے ہی تنگ کر رہا ہے۔''

''اس وقت یہ آپ کے بغیر اوپر نہیں جائے گا،'' پرکاش نے کہا۔ ''آپ ساتھ آ کیوں نہیں جاتیں؟''

''چل، میں تجھے زینے تک پہنچا دیتی ہوں،'' بینا اسے جواب نہ دے کر بچے سے بولی۔ ''اوھر سے جلدی ہی لوٹ آنا۔ گھوڑے والے کتنی دیر سے تیار کھڑے ہیں۔''

پرکاش کو اپنے اندر ایک نشتر سا چبھتا محسوس ہوا، مگر جلد ہی اس نے اپنے کو سنبھال لیا۔ ''آپ لوگ آج ہی جا رہے ہیں کیا؟'' وہ کسی طرح مشکل سے پوچھ سکا۔

''جی ہاں۔'' بینا دوسری طرف دیکھتی رہی۔ ''جانا تو صبح صبح ہی تھا مگر اس کی ضد کی وجہ سے اتنی دیر ہو گئی ہے۔ اب بھی یہ...'' اور وہ بات بیچ میں ہی چھوڑ کر اس نے بچے سے پھر کہا، ''تو چل تجھے زینے تک پہنچا دوں۔''

بچہ پرکاش کے ہاتھ سے بانہہ چھڑا کر کچھ دور بھاگ گیا۔ ''میں نہیں جاؤں گا،'' اس نے کہا۔

''اچھا، آ جا،'' بینا بولی، ''میں تجھے زینے کے اوپر تک چھوڑ آؤں گی۔ اس دن کی طرح۔''

''میں نہیں جاؤں گا!'' اور بچہ کچھ قدم اور بھی دور چلا گیا۔

''آپ ساتھ آ کیوں نہیں جاتیں؟ یہ اس طرح اپنی ضد نہیں چھوڑے گا،'' پرکاش نے کہا۔

بینا نے آدھے پل کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ اس نگاہ میں غصے کے علاوہ نہ جانے کیا کیا تھا۔ لیکن آدھے پل میں ہی وہ انداز ڈھل گیا اور بینا نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس کے چہرے پر ایک طرح کی سختی آ گئی اور اس نے بچے کے پاس جا کر اسے اٹھا لیا۔ ''تو چل، میں تیرے ساتھ چلتی ہوں،'' اس نے کہا۔

بچے کا روہانسا انداز ایک لمحے میں ہی بدل گیا اور اس نے ہنستے ہوئے اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ پرکاش نے دھیرے سے کہا، ''آیئے،'' اور ان دونوں کے آگے آگے چلنے لگا۔

اوپر کمرے میں پہنچ کر بینا نے بچے کو نیچے اتار دیا اور کہا، ''لے، اب میں جا رہی ہوں۔''

''نہیں،'' بچے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، ''تم بھی یہاں بیٹھو۔''

''بیٹھیے۔'' پرکاش نے کرسی پر پڑی ہوئی دو ایک چیزیں جلدی سے اٹھا دیں اور کرسی بینا کی طرف بڑھا دی۔ بینا کرسی پر نہ بیٹھ کر چارپائی کے کونے پر بیٹھ گئی۔ بچے کا دھیان اچانک نہ جانے کس چیز نے کھینچ لیا۔ وہ ان دونوں کو چھوڑ کر بالکنی میں بھاگ گیا اور وہاں سے اچک کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

پرکاش کرسی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھے جیسے کھڑا تھا ویسے ہی کھڑا رہا۔ بینا چارپائی کے کونے پر اور بھی سمٹ کر دیوار کی طرف دیکھنے لگی۔ اچانک بے خبری کے ایک لمحے میں ان کی آنکھیں مل گئیں تو بینا نے جیسے

پوری ہمت جمع کر کے کہا، ''کل اس کی جیب میں کچھ روپے ملے تھا۔ آپ نے رکھے تھے؟''

پرکاش اچانک ایسے ہو گیا جیسے کسی نے اسے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا ہو۔ ''ہاں،'' اس نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کہا، ''سوچا تھا کہ ان سے یہ کوئی چیز... کوئی چیز بنوالے گا۔''

بینا پل بھر چپ رہی۔ پھر بولی، ''کیا چیز بنوانی ہوگی؟''

''کوئی بھی چیز بنوا دیجیے گا۔ کوئی اچھا اوورکوٹ یا...''

کچھ دیر پھر خاموشی رہی۔ پھر بینا بولی، ''کیسا کوٹ بنوانا ہوگا؟''

''کیسا بھی بنوا دیجیے گا۔ جیسا اسے اچھا لگے، یا... یا جیسا آپ ٹھیک سمجھیں۔''

''کوئی خاص کپڑا لینا ہو تو بتا دیجیے۔''

''نہیں، خاص کوئی نہیں۔ کیسا بھی لے لیجیے گا۔''

''کوئی خاص رنگ؟''

''نہیں... ہاں... اگر نیلے رنگ کا ہو تو زیادہ اچھا رہے گا۔''

بچہ اچھلتا ہوا بالکنی سے لوٹ آیا اور بینا کا ہاتھ پکڑ کر بولا، ''اب چلو۔''

''پاپا سے تو نے پیار تو کیا ہی نہیں اور آتے ہی چل بھی دیا؟'' پرکاش نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ بچے نے اس کے ہونٹوں سے ہونٹ ملا کر ایک بار اچھی طرح اسے چوم لیا اور پھر جھٹ سے اس کی بانہوں سے اتر کر ماں سے بولا، ''اب چلو۔''

بینا چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بچہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر کی طرف کھینچنے لگا۔ ''تلو نا ممی، دیل ہولی ہے۔'' وہ پھر تتلانے لگا اور بینا کو ساتھ لیے ہوئے دہلیز پار کر گیا۔

''تو جا کر پاپا کو چٹھی لکھے گا نا؟'' پرکاش نے پیچھے سے پوچھا۔

''لتھوں دا۔'' مگر اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا ایک بار بینا نے، اور جلدی سے آنکھیں ہٹالیں۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں میں اٹکے ہوئے آنسو اس کے گالوں پر بہہ آئے تھے۔ ''تو نے پاپا کو ٹاٹا نہیں کیا،'' اس نے بچے کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے کہا۔ آنکھوں کی طرح اس کا لہجہ بھی بھیگا ہوا تھا۔

''ٹاٹا، پاپا!'' بچے نے بغیر پیچھے کی طرف دیکھے ہاتھ ہلا دیا اور زینے سے اترنے لگا۔ آدھے زینے سے پھر اس کی آواز سنائی دی۔ ''پاپا کا گھل اچھا نہیں ہے ممی، ہمالے والا گھل اچھا ہے۔ پاپا کے گھل میں تو کچھ بھی چھامان ہی نہیں ہے...''

''تو چپ کرے گا کہ نہیں؟'' بینا نے اسے جھڑک دیا۔ ''جو منھ میں آتا ہے بولتا جاتا ہے۔''

''نہیں تپ کلوں گا، نہیں کلوں گا تپ...!'' بچے کا لہجہ پھر روہانسا ہو گیا اور وہ تیز تیز قدموں سے نیچے اترنے لگا۔ ''پاپا کا گھل گندا! پاپا کا گھل تھو...!''

رات ہوتے ہوتے آسمان پھر گھر آیا۔ پرکاش کلب کے بار روم میں بیٹھا ایک کے بعد ایک بیئر کی بوتلیں خالی کرتا رہا۔ بار میں عبداللہ لوگوں کے لیے رم اور وسکی کے پیگ ڈالتا ہوا بار بار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ اتنے دنوں میں پہلی بار وہ پرکاش کو اس طرح پیتے دیکھ رہا تھا۔ ''آج لگتا ہے اس صاحب نے کہیں سے بہت مال مارا ہے،'' اس نے ایک بار دھیمے لہجے میں شیر محمد سے کہا۔ ''آگے کبھی ایک بوتل سے زیادہ نہیں پیتا اور آج چار چار بوتلیں پی کر بھی بس کرنے کا نام نہیں لے رہا۔''

شیر محمد نے صرف منہ بچکا دیا اور اپنے کام میں لگا رہا۔

پرکاش کی آنکھیں عبداللہ سے ملیں تو عبداللہ مسکرا دیا۔ پرکاش کچھ لمحے اس طرح اسے دیکھتا رہا جیسے وہ انسان نہ ہو، ایک دھندلا سا سایہ ہو، اور اپنے سامنے کا گلاس پرے سرکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کاؤنٹر کے پاس جا کر اس نے دس دس کے دو نوٹ نکال کر عبداللہ کے سامنے رکھ دیے۔ عبداللہ باقی پیسے گنتا ہوا خوشامدی لہجے میں بولا، ''آج صاحب بہت خوش نظر آتا ہے۔''

''اچھا؟'' پرکاش اس طرح اسے دیکھتا رہا جیسے اس کے دیکھتے دیکھتے وہ سایہ دھندلا ہو کر بادلوں میں گم ہوتا جا رہا ہو۔ جب وہ چلنے کو ہوا تو عبداللہ نے پہلے سلام کیا اور پھر پوچھ لیا، ''کیوں صاحب، وہ کون تھا اس دن آپ کے ساتھ؟ کس کا لڑکا تھا وہ؟''

پرکاش کو لگا جیسے وہ سایہ اب بالکل گم ہو گیا ہو اور اس کے سامنے صرف بادل ہی بادل گھرا رہ گیا ہو۔ اس نے جیسے دور بادل کے گربھ میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''کون لڑکا؟''

عبداللہ پل بھر کے لیے بھونچکا سا ہو رہا، پھر اچانک کھلکھلا کر ہنس دیا، ''تب تو میں نے شیر محمد سے ٹھیک ہی کہا تھا...'' وہ بولا۔

''کیا کہا تھا؟''

''کہ ہمارا صاحب طبیعت کا بادشاہ ہے۔ جب چاہے جس کے لڑکے کو اپنا لڑکا بنا لے اور جب چاہے... یہاں گلمرگ میں تو یہ سب چلتا ہے! آپ جیسا ہی ہمارا ایک اور صاحب ہے...''

پرکاش کو لگا کہ بادل بیچ سے پھٹ گیا ہے اور چیلوں کی کئی ایک قطاریں درّے میں سے ہو کر دور دور اڑی جا رہی ہیں۔ وہ چاہ رہا ہے کہ درّہ کسی طرح بھر جائے، جس سے وہ قطاریں آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں، مگر درے کا دہانہ اور بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے گلے سے ایک مبہم سی آواز نکل پڑی اور وہ عبداللہ

کی طرف سے آنکھ ہٹا کر چپ چاپ وہاں سے چل دیا۔

''بس ایک بازی اور...!'' اپنی آواز کی گونج پرکاش کو خود بہت بناوٹی لگی۔ اس کے ساتھیوں نے ہلکا سا اختلاف کیا مگر پتے ایک بار پھر بٹنے لگے۔

کارڈ روم تب تک لگ بھگ خالی ہو چکا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک وہاں کافی چہل پہل تھی— نازک ہاتھوں سے پتوں کی نازک چالیں چلی جا رہی تھیں اور شیشے کے نازک گلاس رکھے اور اٹھائے جا رہے تھے۔ مگر اب آس پاس چار چار کرسیوں سے گھری ہوئی چوکور میزیں بہت اکیلی اور اداس لگ رہی تھیں۔ پالش کی چمک کے باوجود ان میں ایک ویرانی آ گئی تھی۔ سامنے کی دیوار میں بخاری کی آگ بھی کب کی ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ جالی کے اس طرف کچھ بجھے ادھ بجھے انگارے ہی رہ گئے تھے— سردی سے ٹھٹھر کر سیاہ پڑتے اور راکھ میں گم ہوتے ہوئے۔

اس نے پتے اٹھا لیے۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی سب بے میل پتے تھے۔ ایسی بازی کہ آدمی پھینک کر الگ ہو جائے۔ مگر اس کے اصرار سے پتے بٹے تھے، اس لیے وہ انھیں پھینک نہیں سکتا تھا۔ اس نے نیچے سے پتا اٹھایا، تو وہ اور بھی بے میل تھا۔ ہاتھ سے کوئی بھی پتا چل کر وہ ان پتوں کا میل بٹھانے کا جتن کرنے لگا۔

باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی— پچھلی رات جیسی ہوئی تھی، اس سے بھی تیز۔ کھڑکی کے شیشوں سے ٹکراتی ہوئی بوندیں بار بار ایک ترنگ لیے ہوئے آتی رہیں۔ لیکن ہر بار اچانک بے بس ہو کر نیچے کو ڈھلک جاتی تھیں۔ ان بہتی ہوئی دھاروں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کئی ایک چہرے کھڑکی کے ساتھ چپک کر اندر جھانک رہے ہوں اور لگاتار رو رہے ہوں۔ کسی لمحے ہوا سے کواڑ کھل جاتے تھے تو وہ چہرے جیسے ہچکیاں لینے لگتے تھے۔ ہچکیاں بند ہونے پر وہ غصے سے گھورنے لگتے۔ ان چہروں کے پیچھے اندھیرا تڑپتا ہوا دم توڑ رہا تھا۔

''ڈکلیئر!'' پرکاش چونک گیا۔ اس کے ہاتھ میں پتے ابھی اسی طرح تھے۔ اس بار بھی اسے فل ہینڈ ہی دینا تھا۔ پتے پھینک کر اس نے پیچھے ٹیک لگا لی اور پھر کھڑکی سے چپکے ہوئے چہروں کو دیکھنے لگا۔

''تم بہت ہی خوش قسمت ہو پرکاش، سچ مچ ہم میں سب سے خوش قسمت آدمی تمھیں ہو...''

پرکاش کی آنکھیں کھڑکی سے ہٹ آئیں۔ پتے اٹھا کر رکھ دیے گئے تھے اور میز پر ہار جیت کا حساب کیا جا رہا تھا۔ حساب کرنے والا شخص ہی اس سے کہہ رہا تھا، ''کہتے ہیں نا کہ جو پتوں میں بدقسمت ہو، وہ زندگی میں خوش قسمت ہوتا ہے! اب دیکھ لو، سب سے زیادہ تمھیں ہارے ہو، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ سب سے

خوش قسمت آدمی تمھیں ہو۔''

پرکاش نے اپنے نام کے آگے لکھے ہوئے جوڑ کو دیکھا۔ پل بھر کے لیے اس کی دھڑکن بڑھ گئی کہ اس کی جیب میں اتنے پیسے ہیں بھی یا نہیں۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے پوری جیب خالی کر لی۔ لگ بھگ ہاری ہوئی رقم کے برابر ہی پیسے جیب میں تھے۔ وہ رقم ادا کر دینے کے بعد دو ایک چھوٹے چھوٹے سکے ہی پاس میں بچ رہے — اور ان کے ساتھ وہ مسلا ہوا اندرون ملک سے آیا خط جو شام کی ڈاک سے آیا تھا اور جسے جیب میں رکھ کر وہ کلب چلا آیا تھا۔ خط نرملا کا تھا جو اس نے اب تک کھول کر پڑھا نہیں تھا۔ جیب میں پڑے پڑے وہ خط کافی مڑ تڑ گیا تھا۔ نرملا کی تحریر پر نظر پڑتے ہی نرملا کے کئی کئی جنونی چہرے اس کے سامنے آنے لگے۔ اس کے ہاتھ کا لکھا ایک ایک لفظ جیسے ایک ایک چہرہ تھا۔ گھر سے چلنے کے دن بھی وہ اس کے کتنے کتنے چہرے دیکھ کر آیا تھا۔ ایک چہرہ تھا جو ہنس رہا تھا، ایک تھا جو رو رہا تھا؛ ایک بال کھولے زور زور سے چلا رہا تھا اور دھمکیاں دے رہا تھا، اور ایک چہرہ بھوکی آنکھوں سے اس کے جسم کو نگلنا چاہ رہا تھا۔ اس نے روز کے استعمال کا کچھ سامان ساتھ لانا چاہا تھا تو ایک چہرہ اس کے ساتھ زور آزمائی کرنے پر تل گیا تھا۔

''نرملا!'' اس نے حیران ہو کر کہا تھا، ''تمھیں اس طرح گتھم گتھا ہوتے شرم نہیں آتی؟''

''کیوں؟'' نرملا ہنس دی تھی۔ ''مرد اور عورت رات دن گتھم گتھا نہیں ہوتے کیا؟''

وہ بغیر ایک قمیص تک ساتھ لیے گھر سے چلا آیا تھا۔ بنیان، تولیا، کنگھا، قمیص سب کچھ اس نے آتے ہوئے راستے میں خریدا تھا — یہ سوچنے کے لیے وہ نہیں رکا تھا کہ اس کے پاس جو چار پانچ سو روپے کی پونجی ہے، وہ اس طرح کتنے دن چلے گی! بچھانے اوڑھنے کا سامان بھی اسے وہاں پہنچ کر ہی کرائے پر لینا پڑا تھا۔

اور وہاں آنے کے چوتھے پانچویں روز سے ہی نرملا کے خط آنے لگے تھے۔ وہ اس کے کسی دوست کے یہاں جا کر اس کا پتا لگا آئی تھی۔ ان خطوں میں بھی نرملا کے وہ سب چہرے جوں کے توں موجود رہتے تھے... وہ سخت بیمار ہے اور اسپتال جا رہی ہے... اس کے بھائی پولیس میں خبر کرنے جا رہے ہیں کہ ان کا بہنوئی لاپتا ہو گیا ہے... وہ رات دن بے چین رہتی ہے اور دیواروں سے پوچھتی ہے کہ اس کا 'چاند' کہاں ہے... وہ جوگن کا بھیس دھار کے جنگلوں میں جا رہی ہے... دو دن کے اندر اندر خط کا جواب نہ آیا تو اس کے بھائی اسے ہوائی جہاز میں بٹھا کر وہاں بھیج دیں گے... اس کے چھوٹے بھائی نے اسے بہت پیٹا ہے کہ وہ اپنے 'خصم' کے پاس کیوں نہیں جاتی...

اندرون ملک سے آیا خط پرکاش کی انگلیوں میں مسل گیا تھا۔ اسے پھر سے جیب میں رکھ کر وہ اٹھ

کھڑا ہوا۔ باہر ڈیوڑھی میں کچھ لوگ جمع تھے کہ بارش رکے تو وہاں سے جائیں۔ ان کے بیچ سے ہو کر وہ باہر نکل آیا۔

''آپ اس بارش میں جا رہے ہیں؟'' کسی نے اس سے پوچھا۔ اس نے چپ چاپ سر ہلا دیا اور کچے راستے پر چلنے لگا۔ سامنے صرف نیڈوز ہوٹل کی بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ باقی سب طرف، دائیں بائیں اور اوپر نیچے، اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کلب کے احاطے سے نکل کر وہ سڑک پر پہنچا تو پانی اور بھی تیز ہو گیا۔

اس کا سر پورا بھیگ گیا تھا اور پانی کی دھاریں گلے سے ہو کر کپڑوں کے اندر جا رہی تھیں۔ ہاتھ پیر سُن ہو رہے تھے، مگر آنکھوں میں سے اسے ایک جلن سی محسوس ہو رہی تھی۔ کیچڑ سے لت پت پیر راستے میں آواز کرتے تو اس کے جسم میں کوئی چیز جھنجھنا اٹھتی تھی۔ اچانک ایک نئی لہر اس کے جسم میں بھر گئی۔ اسے لگا کہ وہ سڑک پر اکیلا نہیں ہے۔ کوئی اور بھی اپنے ننھے ننھے پاؤں پٹکتا ہوا اس کے ساتھ چلا رہا ہے۔ راستے کی نالی پر بنا ہوا لکڑی کا چھوٹا سا پل پار کرتے ہوئے اس نے گھوم کر اس طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ چل رہا تھا ایک بھیگا ہوا کتا— کان جھٹکتا ہوا، خاموش اور گردن ڈالے۔

راجیندر یادو

ہندی سے ترجمہ: بشیر عنوان

ٹوٹنا

تمہید: گوڈسے نے جس دن گاندھی جی کی ہتیا کی، اس کے تیسرے روز کی ایک چھوٹی سی خبر نے دیر تک — یا کہوں آج تک — میرا دھیان باندھے رکھا: ضلع... کے قصبے کے داروغہ عطاء المسیاں خاں نے گولی مار کر خودکشی کر لی۔ اس کا خیال تھا کہ گاندھی جی کو سزا دینے کا یہ حق صرف اسے ہی تھا۔ کہتے ہیں کہ ڈیڑھ برس بعد ہی اُسے ریٹائر ہونا تھا...

'شری این کشور ورما، جنرل منیجر، بجاریا انڈسٹریز گروپ لمیٹڈ، ٹینتھ فلور...'

''چسی چسی''... پتا ایک دم صحیح تھا۔ پلٹ کر دیکھا، لفافہ جہاں چپکا تھا وہاں میلا ہو گیا تھا۔ ہاتھ میں پیپر نائف لیے ہی اوپر روشنی کی طرف اٹھایا۔ کدھر سے پھاڑا جائے کہ خط نہ پھٹے۔ اندر کہیں جگہ خالی نہیں تھی۔ کچھ طے کرے کرے کہ ٹیلی فون بجا اور کوئی چیز کرنٹ کی طرح تڑپ کر خون میں دورہ لگا گئی۔ پتے کے اوپر لال سیاہی سے لکھے ''پرسنل'' پر نگاہیں ٹکائے، ہاتھ کا پیپر نائف اُس پر آڑا رکھ دیا۔ وہ خود بھی جب پان سنی زبان سے لفافے کو گوند گیلا کیا کرتا تھا تو چپکانے پر لال دھاری اُبھر آتی تھی، حالاں کہ لینا کو کبھی بھی اُس کی یہ حرکت... لینا کا باپ کہتا ''گنوار!''

وہی ٹیلی فون ہے کیا؟

آپریٹر نے بتایا کہ دلّی کی ٹرنک لائن مل گئی ہے۔ انجانے ہی ایک دراز ذرا سی کھول کر جوتا ٹکایا اور رِوالونگ چیئر پر پیچھے جھونک لے کر، ''ہیلو، گڈ مارننگ مسٹر برٹن...'' کے ساتھ جب باتیں کیں تو دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ گھبراہٹ کو تو یہ سوچ کر جیت لیا کہ ہونہہ، ایسی آخر کیا بات ہے! بڑے بڑے گورنر وائسرایوں

سے دیکشت جب ایسے رعب سے باتیں کرسکتا تھا تو وہ کیوں نہیں کرسکتا؟ مان لیا، جارج میک فیری برٹن انکارپوریٹڈ، بوسٹن، کا گورننگ ڈائریکٹر چھوٹا موٹا آدمی نہیں ہوتا، لیکن کھا تو نہیں جائے گا! یوں اس وقت اُس کی بات کی دوہری اہمیت ہے۔ بارہ کروڑ روپے کا پلانٹ بیٹھے گا، ساجھے میں۔ پچھلے سال سیٹھ جی امریکا گئے تھے، تبھی اِس ساجھے کی بات کا بیج پڑا تھا۔ لیکن اس بار ہوسکتا ہے اسے برٹن کے ساتھ ہی جانا پڑے— اپنی کمپنی کی طرف سے۔ یا... یا... اُس کے سامنے پھر ایک بہت بڑا چانس آ گیا ہے۔

اُوپر سے وہ کسی طرح، ''یا، یا... رائٹ، رائٹ... بٹ یو سی، مسٹر برٹن...'' کے ساتھ اپنی بات کرتا ہے، لیکن ٹائی کی ناٹ ٹٹولتی اس کی انگلیاں کانپتی رہیں۔ چھ منٹ بعد جب اس نے، ''سو کائنڈ آف یو'' کہہ کر لائن کاٹی تو ماتھے پر بھاپ جم گئی تھی، لیکن چہرے پر اطمینان تھا۔ ''چسی! چسی!'' پیچھے کرسی کی پیٹھ پر لٹکے کوٹ کی جیب سے رومال نکال کر منھ پر پھیرا... ایک گھونٹ پانی پیا۔ دیکشت صاحب اپنے کو لاکھ خدا سمجھتے رہیں، اس آدمی سے باتیں کریں تو نانی یاد آ جائے۔

پچھلے ہفتے برٹن کلکتہ آئے تھے۔ لیگ آف کامرس کی میٹنگیں، دنیا بھر کے کاک ٹیل ڈنرز کا انتظام اس نے ہی تو کیا تھا۔ بیچ بیچ میں کاروباری باتیں بھی ہوتی رہیں۔ اُس خرانٹ، تیز اور تجربہ کار منتظم کے سامنے اُسی دھرم اور ٹھہراؤ سے ٹکے رہنا سچ مچ کم ذہانت اور کانفیڈنس کی بات نہیں تھی؛ ہر لمحے نروس ہو جانے کا خطرہ رہتا۔ صحیح ہے کہ سارے احکام سیٹھوں کے تھے اور وہ ان کا نوکر تھا، لیکن ایک آدھ میٹنگ پارٹی میں موجود ہو جانے کے علاوہ انھوں نے کیا کیا؟ اور موٹے موٹے نفع نقصان، ''لے لو،'' ''بیچ دو'' کے علاوہ انھیں پتا کیا کہ آج کی مینجمنٹ کی دنیا ہے کہاں، کیسی ہے؟ نیم کی موٹی داتن کرتے ہوئے ''وِشومتر'' پڑھ لینا اور بات ہے اور معاملات کی باریکیوں، اُٹھنے بیٹھنے کے طور طریقوں کو سمجھنا دوسری بات... دیسی آدمی شاید آپ کے پیسوں کے رعب میں آ بھی جائے، لیکن ایسا شخص آپ کے پیسوں کو کیا گنے گا جو سات سمندر پار سے آپ کے یہاں آ کر کروڑوں روپے لگا رہا ہے؟ کشور جانتا ہے، اگر یہ ساجھا ہو گیا تو کہیں اس میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہوگا اور ہوسکتا ہے اُس نئی فرم میں اسے ہی سب سے اہم عہدہ سنبھالنا ہو... برٹن کے ساتھ معاملہ نہ بھی پٹے تو بھی سیٹھ جی کو اس سے زیادہ قابل اعتماد آدمی کہاں ملے گا؟ اور مان لو اگر... اگر...

اس کا من ایک نئے سپنے سے تھرتھرا اٹھا۔ جب وہ برٹن کو فیکٹری کی سائٹ دکھانے لے گیا تھا تو بہت سی باتیں کرنے کا موقع ملا تھا— نجی اور کاروباری دونوں۔ ''سم آف اور کولیگز رپیٹڈلی ایڈوائزڈ اَس، ہل ناٹ ٹو ہیو اینی سچ انڈرٹیکنگ... آئی مین اِن کولیبوریشن وِد انڈین بزنس فوک۔ دے آر ناٹ سپوزڈ ٹو بی فیئر مائنڈڈ...'' برٹن نے ہنستے ہوئے کہا تھا، ''اسپیشلی یور ہل آف مارواریز... ہم لوگ مشینیں بھیج سکتے ہیں،

انجینئر اور آرکیٹیکٹ بھیج سکتے ہیں، انھیں بزنس ایتھکس تو نہیں سکھا سکتے؛ سارا ایٹی ٹیوڈ تو نہیں بدل سکتے۔ پیسہ ہم بھی کماتے ہیں، اور ان سے چوگنا کماتے ہیں، بٹ ناٹ دیٹ فِلدی وے۔ پیسہ کمانا بہت بڑا فن ہے، لیکن خرچ کرنا اس سے بڑا فن... وی ہائر اے مین آر فائر اے مین— کریکٹ؟ بٹ وی پے دی پرائس ان ایڈر کیسز۔ خرچ کرنے کے نام پر یہ لوگ صرف گھونس رشوت دینا جانتے ہیں۔ کیوں کہ مینفلی دے آر اِسٹل پیٹی ٹریڈرز اینڈ گراسرز... ڈیوائنڈ آف کلچر آر ایجوکیشن... (اس کا اپنے آپ اس کے من میں ترجمہ ہوا: ڈنڈی مار) انڈسٹری آر انڈسٹریل کلچر کیا ہوتا ہے، اس کی ابھی انھیں اے بی سی ڈی بھی نہیں آتی۔ ہم تو چاہتے ہیں، انھیں کچھ دنوں اپنے یہاں رکھ کر انٹیلی جنٹ قسم کے لوگوں کو موجودہ دور کے مینجمنٹ کے طریقے اور تجارتی اصول سکھائیں۔ آپ لوگوں کی سرکاری پالیسی آڑے آتی ہے، ورنہ ہمیں تو کسی بھی تعاون کی ضرورت نہیں ہے... پھر بھی میں ذاتی طور سے چاہتا ہوں کہ تم ایک بار آ کر ہم لوگوں کے کام کا آئیڈیا تو لو...''

برٹن نے یہ ساری باتیں اُسے بہت اعتماد میں لے کر، مذاق کا انداز ملا کر، دوستی کا واسطہ دیتے ہوئے ٹکڑوں ٹکڑوں میں کہی تھیں، لیکن کشور کو سارا رویہ پسند نہیں آیا تھا، جیسے سالا دان کر رہا ہو۔ اس طرح کے اندرونی اور بیرونی تبصروں کے باوجود وہ ان کے پیچھے چھپے مقصد کو بھی سمجھ رہا تھا۔ پھر جب برٹن نے کہا، ''ہمیں ٹاپ رسپونسبل پوسٹس کے لیے ایسے آدمیوں کی ضرورت پڑے گی جو کام کے ہمارے طور طریقے کو بھی جانتے ہوں... گائیز لائیک یُو...'' تب تو کچھ سمجھنے کو نہیں ہی رہ گیا...

اِس لیے جب اُس نے دتی کے فون کے بعد ہی آپریٹر سے انلس ٹریولز مانگ کر صبح کی فلائٹ سے جیسے بھی ہو دتی کا ٹکٹ مانگا تو کہیں کچھ کسک رہا تھا— کچھ غلط کر رہا ہے... اور اِسی کسک کو دبانے کے لیے اُس نے فون پر سیکرٹری کو حکم دیا، ''رامن، کسی کو فوراً انلس بھیج دو۔ فون پر بات ہو گئی ہے۔ کسی نام میں ہو، صبح کی فلائٹ سے ایک ٹکٹ... اُوپر سے جو لگے، لگا دینا۔''

دیکشت کی ایسی تیسی... اُس نے نہایت اطمینان سے گہری سانس پھینک کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ سامنے کے دانتوں کی درز سے زبان کی نوک اُڑا کر ہوا کھینچی، ''چسی چسی!'' ساتھ ہی خیال آیا، اُس کی اِس حرکت کو کسی نے دیکھ سن تو نہیں لیا؟ چیمبر میں کوئی نہیں تھا، پیچھے سے آتی ایر کنڈیشنر کی بے معلوم سی آواز تھی، ٹیک پلائی منڈھی دیواروں والی چھت کے جالی دار کٹاؤ میں جلتے نیون ٹیوبز تھے اور میز پر رکھے تین ٹیلی فون، ٹیبل لیمپ، کیلنڈر، ٹرے، سبھی بہت صاف تھے... اِس بار اُس نے اور ابھی زور سے ''چسی چسی'' کیا اور بچوں جیسی اپنی شرارت پر مسکرا پڑا۔ اِس مسکراہٹ کے ساتھ ہی اندر کی کسک گھل گئی۔ کچھ نہیں جی،

جارج میک فیری برٹن اِنکارپوریٹڈ کی نوکری اِس سٹوریے کی نوکری سے ہر حالت میں اچھی رہے گی... یہاں کیا ہے؟ جب تک سیٹھ کے ہاتھوں میں ناچو، تب تک ٹھیک ہے۔ جہاں ذرا بھی اپنا کچھ دکھانا چاہو، وہیں... اور دوسری کمپنیوں کے جنرل منیجروں کے مقابلے میں پیسے بہت کم... کسی کو بتاؤ تو شرم آئے... یہ ایرکنڈیشنڈ چیمبر، سیکرٹری، دو بیرے، فرنشڈ فلیٹ، ڈرائیور، گاڑی اور دو سو آدمیوں کا اسٹاف تو جو بھی یہاں ہوتا، اُسے ملتا ہی... مجھے تو وہی ڈھائی ہزار اور سال میں بیس ایک ہزار اوپر سے دیتے ہیں... لیکن برٹن میں اس سے دُگنا ملے گا تبھی جانے کی بات سوچی جائے گی، نہیں تو... اگر اِتنا ہی ملے، تب بھی چلے جانا چاہیے۔ بہت بڑی بات تو یہ کہ برٹن سالا ہمیشہ یہیں ہندوستان میں تھوڑے ہی بیٹھا رہے گا، سیٹھ کی طرح سر پر... پھر امریکن فرم کی بات ہی الگ ہے...

اور اِس طرح کی ضمیر کی کسک اُسے ہر بار نوکری بدلتے ہوئے آئی ہے، لیکن ہر بار کسک پہلے سے کم تیکھی ہوتی گئی ہے... نہیں، وہ کسی کو دھوکا نہیں دے رہا... اُسے تو صرف ایک آدمی کو دِکھا دینا ہے... ایسا موقع بار بار نہیں آتا، اور اب وہ کسی بھی موقعے کو چھوڑنا افورڈ نہیں کر سکتا۔ (اُس کی آنکھوں میں لمبے جہاز کی طرح سرکتی شان دار گاڑی تیرتی چلی گئی... ''لائف'' اور ''ٹائم'' میں اُس نے کئی بار انھیں چھانٹا ہے)... جس لیٹسٹ ماڈل کی امریکن گاڑی میں بیٹھ کر کشور گھوما کرے گا، وہ سیٹھ رامجی داس بجاریا کو دو سال بعد مل پائے گی...

جوش کی جُھرجُھری جب اُس سے نہیں سہی گئی تو وہ کرسی کو اپنے پیچھے گھومتا چھوڑ کر، جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا... ''فار ٹاپ رسپونسبل پوسٹ... گائی لائک یو... گائی لائک یو...'' من ہوا کہ جوتے کی ایڑی پر ایک چک پھیری لگا جائے اور سیٹی بجانے لگے... لیکن تبھی اُسے کسی کا دھیان آ گیا، جو جوش کے ایسے غرور کو کبھی بھی یوں نہیں ظاہر ہونے دے سکتا تھا۔ وہ پیچھے والی وینیشین چق کھینچ کر شیشے کے پار دیکھتا رہا... دس منزل کی اونچائی سے ہر چیز کا کھلونے جیسا لگنا اب اُسے حیران نہیں کرتا... پتلی دراڑ جیسی سڑکوں میں کالی بھوری گاڑیاں کیڑے مکوڑوں کی طرح لگتی ہیں... سڑک پر رائٹرز بلڈنگ چاہے جتنی اونچی ہو؛ لیکن یہاں سے زمین سے ذرا سی ہی اٹھی لگتی ہے، جس کی بجری بچھی ڈھلواں چھت پر ہزاروں گملوں کو درجنوں مزدور اِدھر سے اُدھر رکھ رہے ہیں، پورا باغیچہ لگا رکھا ہے... برٹن والا معاملہ ہو جائے تو چھ سات ہزار آدمی تو اپنی کمپنی میں بھی ہوں گے اس کے نیچے۔ تب وہ اگلے بنگلے میں خوب بڑا باغیچہ لگائے گا اور باقاعدگی سے باغبانی کیا کرے گا... سالا پیٹ نکلنے لگا ہے، اسے کم کرنا ہوگا۔ گائی لائک یُو — اُس جیسے ٹاپ آدمی کی پرسنالٹی اسمارٹ ہونی چاہیے... اور اُس کی انگلی اچانک ناک کے نیچے والے مسّے پر چلی گئی... وہ اسے ٹٹولتا رہا... بہت بار کٹوا دیا ہے، ہر بار بڑھ جاتا ہے۔ ڈاکٹر بینرجی کہتے ہیں، حرج کیا ہے؟ اسے کیا پتا کہ چہرے

پر یہ کیسا لگتا ہے... لاڈ میں آ کر لینا اِسے دو انگلیوں میں دبا کر پوچھتی تھی، ''اِس میں درد نہیں ہوتا؟ تمھاری پرسنالٹی میں بس یہی...''

اچانک اُسے ''پرسنل'' والے لفافے کا خیال آیا۔ مزے سے اسے اٹھا کر وہ پھر وہیں آ کھڑا ہوا۔ نائف وہیں چھوٹ گیا تھا، اس لیے جیب سے گچھا نکال ایک پتلی سی چابی سے ہوشیاری سے کھولا، خط نکالا اور پھٹا لفافہ مسل کر باہر پھینک دیا۔ چار تہہ کیا ہوا موٹا سا کاغذ تھا اور بغیر کسی تخاطب کے انگریزی میں ایک لائن گھسیٹ دی گئی تھی، ''کانٹ وِی فار گیٹ دی پاسٹ؟'' نیچے ''لینا کشور'' اور خط کے ایک دم نیچے، ''ڈپارٹمنٹ آف انگلش، سینٹ میری گرلز کالج،'' اور تب شہر کا نام۔ اُس نے نہایت مطمئن رہ کر سمجھا: ''کیا ہم ماضی کو بھول نہیں سکتے؟'' کاغذ کو الٹا پلٹا، اور کچھ نہیں... وہ یوں ہی چپ چاپ باہر دیکھتا، کھویا کھویا کھڑا رہا... آٹھ سال میں یہ پہلا خط ہے۔

پیچھے کھٹ کھٹ ہوئی۔ میز پر بہت سے ٹائپ کیے ہوئے کاغذ پیپر ویٹ سے دبا کر رامن لوٹ رہا تھا۔ کشور کو گھومتے دیکھ رکا۔ کشور نے میز کے پاس آ کر کھڑے ہو کر تازہ ٹائپ کیے ہوئے الفاظ پر نگاہیں ٹکائے پوچھا، ''یہ کیا ہے؟''

''روجرز نیل والے کاغذ ہیں، لنچ سے پہلے مانگے ہیں،'' رامن نے بتایا، تب تک کشور نے خود بھی پڑھ لیا تھا۔ روجرز اینڈ نیل سولیسیٹرز سے لنچ سے پہلے اپائنٹمنٹ تھا۔ فیرا ایلائی والوں نے ابھی روپیہ نہیں دیا۔ جھنجھٹ تھا، ہزار روپے روز کا اِنٹرسٹ، کون دے؟ بینک بجاریا انڈسٹریز سے مانگتا تھا، لیکن جب ایلائی والوں نے پیمنٹ ہی نہیں کیا تو انٹرسٹ بھی اُنھی کے ذمے جائے گا... ساری چیزیں اس کے دماغ میں جھٹکے سے آ گئیں۔ ''او، ہاں، میرے تو دماغ سے ہی اتر گیا تھا!'' اور وہ کاغذوں کو غور سے دیکھتا رامن کے ہاتھوں گھما کر سیدھی کی گئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ گھڑی دیکھی، ایک گھنٹہ ہے۔ سارے کاغذ اسی بیچ تیار ہو جانے ہیں...

''کیا؟'' جیسے ہی رامن نے نیچے پڑا کاغذ اٹھا کر بہت دھیرے سے میز پر رکھا تو کشور چونک کر پوچھ بیٹھا۔ اصل میں وہ بھول ہی گیا تھا کہ رامن ابھی تک وہیں ہے۔ کاغذ پر نگاہ گئی۔ ارے، لینا والا خط ہے! شاید کھسک کر نیچے گر گیا تھا۔ رامن نے پڑھ تو نہیں لیا؟ فوراً بولا، ''تم چلو... روجرز نیل کے یہاں۔ شپنگ کلیم والے کاغذوں کا بھی خیال رکھنا...'' اور جب رامن نے دروازہ کھولا تو کچھ سوچتے ہوئے دھیرے سے کہا، ''اور، سنو...'' پھر کئی سیکنڈ یاد کرتا رہا کہ اُسے رامن سے کیا بات کہنی تھی، ''ہاں، وہ اٹلس میں بھیج دیا کسی کو؟''

''جی...''

بغیر رامن کا جواب سنے، موٹے فریم کا چشمہ ناک پر چڑھا کر، ہاتھ میں کھلا قلم لیے، وہ ٹائپ کیے ہوئے الفاظ کو غور سے پڑھ پڑھ کر دستخط کرنے لگا تھا... اب جانتی ہے نا کہ مجھے چار ساڑھے چار ہزار مہینہ پڑتا ہے... کانٹ وی فارگیٹ دی پاسٹ!... اب تو بھولنے کی بات آئے گی ہی...

''ٹرن ٹرن...'' ٹیلی فون بجا تو اُس نے بغیر اُدھر دیکھے ہی ہاتھ بڑھا کر ٹٹولتے ہوئے چونگا اٹھایا، ''کشور۔''

''ساڑھے پانچ پر آرہے ہو نا؟'' کراؤن انشورنس کا گرگ تھا۔

''کہاں؟'' کشور سچ مچ بھول گیا تھا۔

''پرنس، اور کہاں!'' گرگ جھنجھلا اٹھا۔ ''عجب آدمی ہو...''

''یار، آج تو بہت ہی پھنسا ہوں۔''

''تیرا ہمیشہ یہی رونا ہوتا ہے،'' گرگ نے کہا، ''اچھا یار، تو جنرل منیجر ہوا!... ہم نے مسز لال چندانی کو بھی بلالیا ہے...''

''آئی ایم اَنڈر اِسٹافڈ۔ جانتا ہے ماروا ڑی کنسرن ہے یہ۔ کیا کروں، اپنی چٹھیاں تک دیکھنے کی فرصت نہیں ملتی۔'' اُسے لینا کے خط کا دھیان آ گیا۔

''اچھا، یُو ڈونٹ مائنڈ، میں ذرا لیٹ ہو جاؤں گا...''

''اوہ یس،'' گرگ خوش ہو گیا، ''تجھ سے، یار، ایک صلاح کرنی تھی۔ مسز لال چندانی کی بہن والا ہی چکر ہے۔ تجھ سے کہا تھا اپنے دفتر میں رکھ لے— آپریٹر کم رسپشنسٹ...''

''مجھے اور پٹوا! سچ مچ کی لڑکی کی بات دور ہے، جانتا ہے یہاں لڑکی کی تصویر تک نہیں لگتی! پھر جیسی بڑی بہن ہے، ویسی ہی چھوٹی بھی ہوگی۔'' اس نے مذاق تو کر دیا، لیکن خیال آیا، مان لو آپریٹر ٹیپ کر رہا ہو؟ جنرل منیجر صاحب... اسے اِس گرگ کا تُو تُو کر کے بات کرنا بھی پسند نہیں ہے۔ لیکن آج کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ پرانا دوست ہے، جب اسے کل چھ سو روپے ملتے تھے تب کا۔ اس لیے وہ خود گرگ سے بہت ہی عزت سے بات کرتا ہے، لیکن کم بخت ہنٹ ہی نہیں لیتا۔ کہیں دیکشت صاحب کے سامنے... اچانک فون پر اُس کی آواز کڑی اور سخت ہو گئی، اور وہ سامنے والے کاغذوں کو پڑھتا ہوا ''ہاں، ہوں'' کے مختصر جواب دیتا رہا۔ گرگ کو مسز لال چندانی کو لے کر کہیں جانا تھا، اس لیے کشور کی گاڑی کی ضرورت تھی، دو گھنٹے کے لیے۔ اسے خیال بھی نہیں کہ کب اس نے کہا، ''یہ سب تو شام کو سنیں گے، لیکن آئی کانٹ بی لیو... مجھے یقین نہیں ہوتا کہ اس جیسی ضدی عورت ایسا لکھے گی...''

''کون؟ کون؟'' گرگ چونک کر بولا، ''کون ایسا لکھے گی؟''

اچانک کشور نے زبان کاٹ لی— فوراً بولا، ''سوری، یہ ایک صاحب یہاں بیٹھے ہیں، ان کی بات کا جواب دے رہا تھا۔ اچھا، تو شام کو مل رہے ہیں...'' اور اس نے جھٹ فون رکھ دیا۔ غضب ہو گیا نا؟ کیا بات منھ سے نکل گئی! ایک دم سامنے بیٹھے صاحب کی بات نہ سوجھتی تو؟ یہی حاضر دماغی اور دہانت تو اُسے یہاں لے آسکی ہے... کوئی دوسرا ہوتا تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے... ''چسی! چسی!'' اس نے دراز کھول کر پائپ نکالا، کاغذوں پر نگاہیں ٹکائے ٹکائے ہی تمباکو بھرا اور دانتوں میں دبا کر جلانے لگا۔ یہ پائپ اُسے برٹن نے دیا تھا۔ تبھی بیرے نے آکر دھیرے سے ایک چٹ سامنے رکھ دی...

''بھیج دو۔'' بیرا چلا گیا تو خیال آیا کہ جنرل منیجر کو ایک دَم کسی کو نہیں بلانا چاہیے۔ لگے گا، اندر خالی بیٹھا تھا۔ چٹ پر نام کے آگے ''جینت'' اور بزنس کے سامنے ''بائی اپائنٹمنٹ'' لکھا تھا۔ اِس کا تو اُسے خیال ہی نہیں کہ آج کا وقت دیا تھا۔ چٹ رکھی تو رامن کا پیپر ویٹ سے دبایا گیا خط سامنے تھا، ''کانٹ وی فارگیٹ دی پاسٹ؟'' جلدی سے موڑ کر پیچھے لٹکے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ ہر بار سامنے پڑ جاتا ہے...

''گڈ مارننگ سر...'' ڈرتے ڈرتے ایک نوجوان اِس طرح داخل ہوا جیسے کھیل شروع ہو جانے کے بعد کسی نے سینما ہال میں قدم رکھا ہو، ٹٹولتے ہوئے۔ پائپ بجھ گیا تھا، اس پر جلی ماچس چھوائے تین چار سانس کھینچتے کھینچتے کشور نے دھیرے سے سر ہلا کر نمسکار کی رسید دی اور ایک ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''جی، وہ فرنیچر والے کوٹیشنز لایا ہوں،'' سر جھکا کر بریف کیس کے کاغذ نکالتے نکالتے جینت بولا۔ وہ آفس کے فرنیچر کے ڈیزائن، نقشے اور دام بتاتا رہا۔ گیہواں، دبلا سا نوجوان، ہینڈ لوم کی ٹائی، ٹیریلین کی آسمانی قمیص، کالی پتلون۔ پائپ کے کش لگاتا ہوا کشور کبھی اُس کے پیلا پن لیے ہوئے سنوارے بالوں کو دیکھتا اور کبھی داہنے ہاتھ میں پڑی لوہے کی انگوٹھی کو، جس میں نگ کی جگہ ابوالہول کا چہرہ بنا ہوا تھا۔ پرسوں کشور کو جینت اپنی پتنی کے ساتھ نیو مارکیٹ میں مل گیا تھا۔ بھرے بدن کی سُندر ہنس مکھ لڑکی تھی۔ جینت کے ہاتھ میں پیکٹ تھے اور مالا کے پاس پرس۔ تعارف ہوا۔ اسے جینت کا صاف ستھرا، خوش خصلت طور طریقہ شروع سے ہی پسند ہے۔ مالا کے تعارف کے بعد ہی لگا جیسے جینت سے اسے انس بھی ہو۔ پتا نہیں کیسے شبہ ہو گیا، مالا کو بیڈمنٹن کھیلنا پسند ہے، اور اسے کریم کھانے کا شوق ہے۔

جینت کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے کاغذ لے کر لاپروائی سے پوچھا، ''ہاؤ از یور مسز؟''

''فائن، تھینک یو!''

جینت نے پن کشن سے پن کھینچ کر دو کاغذ پن کیے اور سامنے سرکا دیے۔ ''ایک اسکول میں پڑھاتی ہیں— میوزک۔''

''کیوں؟ ماڈرن رینو ویٹرز تمھیں ٹھیک پیسے نہیں دیتے کیا؟'' اُسے خود تعجب ہوا کہ وہ یہ سب کیوں

پوچھ رہا ہے۔

''لیکن آفس ٹو آفس چکر لگانے کا کام اسے پسند نہیں ہے۔'' اچانک جینت کی آنکھوں میں ایک چمک آئی، ''آپ کے یہاں کبھی کوئی جگہ ہو تو...''

کشور کو ایک دم کام اور وقت کا ساتھ ہی خیال آیا۔ دستخط کرنے سے پہلے کونے میں کچھ لکھتا ہوا بولا، ''ضرور۔'' پھر سوچنے لگا، برٹن والی کمپنی میں جینت کو لیا جاسکتا ہے۔ اسے جینت پسند بھی ہے۔ ضرورت تو پڑے گی ہی... ''آئی لائیک یو، تمھاری مسز بہت اچھا گاتی ہیں کیا؟'' جانے کیوں، اُس کے من میں آیا کہ کبھی جینت کی بیوی کو ایک بہت خوب صورت راسلک کی ساڑھی کا تحفہ دے گا۔

''جی ہاں...'' جینت نے گدگد ہو کر کہا۔ ''آپ کو ایک بار ہم لوگ بلائیں گے۔ دو ایک بار ریڈیو پر بھی پروگرام آیا ہے...''

''ڈزنٹ شی ہیٹ یو؟'' جب تک وہ ہوشیار ہوا، فقرہ اس کے منھ سے نکل چکا تھا... اس نے جلدی سے بجھے پائپ سے دو ایک کش کھینچ کر کہا، ''آئی مین، یور ورک... تم یہ فرنیچر اور دوسری چیزوں کے اسٹیمیٹ دیتے پھرتے ہو، انھیں برا تو لگتا ہی ہوگا؟''

''جی... جی، میں نے بتایا نا، بہت پسند تو نہیں ہے۔ بات یہ ہے جی، اس کے گھر والے ذرا سے اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں، سو اسے کہیں میرے کام میں حجاب ہوتا ہے۔'' لیکن جینت کا چہرہ دیکھ کر ہی کشور کو لگ گیا کہ بات سنبھلی نہیں ہے۔ اسے تعجب اور افسوس ہوتا رہا کہ کیسے وہ بات اس کے منھ سے نکل گئی! کیا ہو گیا اسے؟ جینت کی باتوں کو جوب میں ''ہاں ہوں'' کر کے اس نے جلدی سے دستخط کیے، پھر جھٹکے سے بیرے کی گھنٹی بجا کر اٹھتے ہوئے بولا، ''معاف کرنا جینت، اِس وقت جلدی میں ہوں۔ مجھے لنچ سے پہلے ہی روجرز نیل کے یہاں جانا ہے۔'' اور بغیر جواب کی راہ دیکھے، دونوں کندھوں پر کوٹ چڑھاتے ہوئے، بیرے کو حکم دیا، ''کھلاون، رامن سے کہہ دو، کاغذات لے کر نیچے گاڑی میں چلے۔ جینت، تم دتا بابو سے مل کر انھیں ہی ساری باتیں سمجھا جانا۔'' پائپ ایش ٹرے میں جھاڑ کر کوٹ کی جیب میں رکھا تو تہہ کیے ہوئے کاغذ سے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا... ''کانٹ وی فارگیٹ دی پاسٹ؟'' ''ڈزنٹ یور وائف ہیٹ یو، آئی مین یور ورک؟'' ''بیوی تم سے، میرا مطلب تمھارے کام سے نفرت نہیں کرتی؟'' ''گائی لائک یو...'' بڑے بابو کے چیمبر تک آتے آتے یہی فقرے اُس کے کانوں میں گونجتے رہے... بڑے بابو، یعنی رامجی داس کے بھائی کنہیا لال بجاریا، مینیجنگ ڈائریکٹر۔

رامن ڈرائیور کے پاس بیٹھا تھا۔ پیچھے وہ اکیلا بیٹھا بیٹھا پائپ پیتا رہا۔ چوراہے کی لال روشنی نے

جب روکا تو اچانک کچھ یاد آ گیا ہو، اس طرح کہا، ''رامن، میک فیری برٹن والی فائل آتے ہی ایک دم تیار کر دینی ہے۔ شام کو لوکل ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہے۔ گھر پر بول دینا، شاید کچھ دیر ہو جائے... اور ہاں، کراؤن والے گرگ صاحب کو منع کر دینا کہ میں شاید آ نہیں پاؤں گا۔'' پھر ڈرائیور کو حکم دیا، ''گاڑی پانچ بجے گرگ صاحب کو چاہیے۔ سات ساڑھے سات تک یہیں آ جانا، ہمیں تھوڑا رکنا ہوگا۔'' وہ جانتا ہے، مسز گرگ، یعنی نرملا بھابی، ایسی خاتون ہیں جنھیں دیکھ کر تشفی ہوتی ہے — مایوسی کے بے شمار لمحوں میں اُنھوں نے ہی کشور کو بکھرنے اور ٹوٹنے سے بچایا ہے — لیکن جانے کیا چیز ہے جو اس کے اندر مطمئن ہوتی ہے اور وہ جو یوں گرگ کو مسز لال چندانی کے ساتھ گھومنے کو گاڑی دے دیتا ہے، اسے اس میں کچھ بھی نامناسب نہیں لگتا۔ لیکن آج گویا خاص تسکین ہوئی۔ اُس نے رامن سے مذاق کرنا چاہا، ''اس الٹے سیدھے ٹائم سے تو تمھاری بیوی خاصی بور ہو جاتی ہوگی۔ ہو سکتا ہے اُس بے چاری نے آج کوئی پروگرام بنا رکھا ہو...'' وہ جیب سے ڈائری نکال کر کچھ دیکھتا رہا۔ ''تمھاری بیوی کو دیر سے جانے پر شک نہیں ہوتا؟'' اسے لگا جیسے اس نے یہ فقرہ مذاق میں رامن سے کہہ دیا ہو — لیکن کہا نہیں تھا، صرف سوچ کر رہ گیا تھا، کیوں کہ انتظار کے بعد بھی رامن کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ایسا مذاق تو وہ کبھی کر ہی نہیں سکتا۔ تمبا کو بھرنے کے لیے پاؤچ کو دونوں جیبوں میں دیکھا تو لگا، صبح سے جس چیز کو وہ ٹالے جا رہا ہے وہ جوتے کی کیل کی طرح اور باہر نکل آئی ہے، زیادہ گہرائی میں چھیدتی ہوئی...

کلب کے پورچ سے جب کشور کی ہینگر ڈگھوم کر باہر نکلی تو وائٹ لیبل کے پانچ چھ پیگ نسوں میں تیر رہے تھے۔ سڑک تنی ہوئی ڈوری کی طرح ہوا سے تھرتھراتی لگتی تھی۔ لیک کے بیچ سے گذرتے ہوئے ایک اندھیری سی جگہ میں اچانک گاڑی ٹھٹک گئی۔ اسٹیئرنگ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے دیر تک وہ یوں ہی خالی سا دیکھتا رہا، پھر جھٹکے سے چابی کھینچی، باہر آیا اور پھاٹک سے دروازہ بند کر کے ایک بنچ پر آ بیٹھا۔ لگاتار کوئی چیز کانوں میں سَن سَن گونج رہی تھی — ٹھیک ویسی ہی آواز جیسی ریل کی سنسان پٹریوں کے کنارے کھڑے ٹیلی گراف کے کھمبوں میں گونجتی ہے۔ وہ محسوس کرتا رہا، صبح سے ہی ایک سوال اُس کے آس پاس منڈلا رہا ہے — لینا نے آٹھ سال بعد اسے کیوں لکھا؟... صبح جب اسے لینا کا خط ملا تھا تو تردد کے ساتھ اس نے کچھ نہیں سوچا تھا — کچھ بھی نہیں۔ ایک تلخ مسکان سے صرف اس سطر کو پڑھ لیا تھا، ''کیا ہم لوگ ماضی کو بھلا نہیں سکتے؟''... ماضی؟ کون سا ماضی؟ ماضی کو اپنے ساتھ رکھنا اب اس کا شغل نہیں رہ گیا ہے، اِس لیے کوئی ردِعمل نہیں ہوا تھا۔ بس من میں ایک بات آئی تھی کہ آج میں اِس لائق ہو گیا ہوں، اسی لیے نا؟ آٹھ سال بعد کس ماضی کو بھولنے کی بات لینا کرتی ہے؟ اِن پچھلے آٹھ برسوں والا ماضی؟ یا وہ جو اِن سے پہلے بیتا تھا؟ اور اِسی طرح کی کوئی چیز لگاتار کہیں گھمڑ رہی ہے، اسے وہ ضرور محسوس کرتا رہا۔ اس وقت لگا،

گھمڑتے ہوئے اُس غیر مجسم وجود نے قریب قریب واضح سوال کا ایک روپ لے لیا ہے۔ آخر اُس نے کیوں لکھا؟ اُس ضدی، مغرور، خود پسند، خود دار عورت نے کتنی مشکل سے اپنے کو یہ خط لکھنے کے لیے تیار کیا ہوگا، یہ صرف کشور ہی محسوس کر سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے ان پچھلے آٹھ برسوں میں رات دن لگاتار وہ اپنے آپ کو اِس بات کے لیے ہی تیار کرتی رہی ہو— اِس ایک سطر کو لکھنے کے لیے۔ اور کیا اس ایک سطر کو کچھ یوں ہی سے ڈھنگ سے لکھ کر وہ کہیں اپنا ہی پلڑا تو بھاری رکھنا نہیں چاہتی؟... لیکن اس کا پہل کر کے، خط لکھنے کے پاتال تک اُتر آنا ہی کیا... اور کیا وہ خود اِسی کی گمان بھری امید نہیں کر رہا تھا؟

ایسا نہیں ہے کہ خود کشور کے من میں ہر دن کم سے کم ایک بار یہ بات نہ آتی ہو کہ بہت ہوا، اب وہ لینا کو لکھ دے۔ لیکن ہر روز کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا— یا کہو، جس نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا، اس کی طاقت کی وہ مزاحمت کرتا رہا۔ ''اولڈ مین اینڈ دی سی'' فلم کا ایک منظر ان آٹھ برسوں میں ہزاروں ہی بار اس کے سامنے آیا— شراب خانے میں ''بوڑھا'' میز پر کہنی ٹکائے کسی سے پنجہ لڑا رہا ہے— پنجہ نہیں، دونوں نے ایک دوسرے کی ہتھیلی کو اپنی پکڑ میں لے رکھا ہے، اور دونوں طاقت آزما رہے ہیں کہ کب، کون، کس کے ہاتھ کو موڑ کر میز پر جھکا دے۔ طاقت سے زیادہ یہ کھیل استقلال کا ہے۔ ایک حد پر آ کر طاقت رک جاتی ہے اور ثابت قدمی سے دوسرے کی ہمت ٹوٹ جانے کی امید چلتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی اسے لگتا ہے، دوسرا ہاتھ لینا کا ہے؛ لیکن اکثر حریف کے روپ میں جس کا ہاتھ وہ محسوس رہا ہے، اُس شخص کا صرف نام سامنے ہے؛ چہرہ آج صحیح یاد نہیں آتا۔ کئی چہروں میں وہ اتنا گھل مل گیا ہے کہ لگتا ہے اس طرح کا کوئی چہرہ کبھی تھا ہی نہیں اور یہ کش مکش متواتر اُس بے شکل چہرے والے شخص سے چل رہی ہے۔ دانت بھینچے، سانس روکے، دونوں انتظار کر رہے ہیں کہ پہلے کس کی نسیں ڈھیلی پڑتی ہیں...

لینا سے وہ آٹھ برسوں سے نہیں ملا، اور اب تو اس صورت حال کو قبول کر چکا ہے کہ آگے ملنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ لیکن طاقت آزماتی، پسینے سے بھیجی ایک سخت ہتھیلی کا لمس ایک پل کو اس کے ذہن سے اوجھل نہیں ہوا۔ صبح شاید اسے خوشی ہی ہوئی تھی، ایک بے رحم خوشی، کہ کھٹ کی آواز کے ساتھ اس نے لینا کے ہاتھ کو میز پر جھکے ہوئے پایا ہے... پھر لگا، وہ ہاتھ لینا کا نہیں، ایک دوسرا سخت ہاتھ ہے۔

صبح کی اس بے رحم، ظالم تسکین کا سکھ شام تک دھیرے دھیرے انجانے ہی ایک عجیب اداسی میں بدلتا چلا گیا تھا اور وہ فراموشی کی ایک کمزور خواہش سے لڑتا رہا کہ صبح دلّی نہ جا کر پلین سے سیدھے لینا کے پاس جائے اور اس ہاری تھکی، کمزور، شکست خوردہ کو بانہوں سے اٹھا لے، ''لینا، میری لینا، مجھے معاف کر دو!'' کیسی ہوگی ہوگی ان آٹھ برسوں میں لینا؟ جب وہ الگ ہوئے تھے تو وہ چھبیس کی تھی، آج چونتیس کی

ہوگی۔ کالے کیسوں میں سفید دھاریاں ابھر آئی ہوں گی، چہرے پر عمر کا پکا پن جھلکنے لگا ہوگا اور جسم پھیل یا سوکھ کر وہ نہیں رہ گیا ہوگا جسے وہ ''انگ انگ سانچے میں ڈھلا'' کہا کرتا تھا۔ نہیں، اب اس ہاری تھکی، ٹوٹی، پختہ عمر عورت کا سامنا کرنے کا حوصلہ بھی تو کشور میں نہیں ہے۔ الزام لگاتی، دوش دیتی نگاہوں سے وہ کیسے دو چار ہو سکے گا؟ سچ مچ بے چاری کہیں بہت مجبور ہی ہوا ٹھی ہوگی، ورنہ کیسے اسے یہ خط لکھ پاتی؟

دیر تک آنسو کشور کے گالوں پر ڈھلکتے رہے۔ لیک کے پار کنارے کنارے ریل گذر رہی تھی اور اس کی روشنیاں پانی کے اندر سنہری کانتر جیسی سرکتی جا رہی تھیں۔ کیا وہ لوگ سچ ہی بدنصیب بن کر ایک دوسرے کی زندگی میں آئے تھے؟

...لیکن خوش نصیبی کسے کہتے ہیں، اسے زندگی میں پہلی بار کشور نے اسی دن جانا تھا جس دن لینا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا، ''لینا، تم ایک بار اپنے منھ سے کہہ دو... کہو لینا! دیکھو، میرے پاس تمھیں دینے کو ایک پیار بھرے دل کے سوا کچھ بھی نہیں ہے...'' منھ سے لینا نے صرف اتنا ہی کہا، ''سب کچھ لفظوں میں کہہ کر ہی بتایا جاتا ہے کشور؟'' کشور کو یقین نہیں ہوا تھا۔ لگا جیسے سنسار کی ہر چیز غیر حقیقی ہو اٹھی ہو۔ یونیورسٹی کے لڑکے سنا سنا کر آپس میں کہتے، ''اسے کہتے ہیں چھپر پھاڑ کر دینا! زندگی سالے کی ٹیوشنیں کرتے، فری شپ اور اسکالرشپ کے لیے اِس ممبر سے اُس ممبر کے یہاں چکر لگاتے بیتی اور آج دیکھ لو، کیا پکڑ کر اسسٹنٹ کمشنر کا داماد ہونے جا رہا ہے!''

''لیکن بیٹے، ہاتھی باندھ تو رہے ہو، اسے کھلاؤ گے کیا؟''

''ہاتھی نہیں، ہتھنی! سفید ہتھنی! جو اتنا بڑا جانور دے گا، وہ دو چار گنے کے کھیت بھی دے گا ہی۔ اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس کہتے کسے ہیں، کچھ پتا ہے؟''

''یعنی کشور صاحب وہاں کھیت پر جا کر ہی کٹیا ڈال دیں گے؟''

''کھیت پر؟ اور وہ جو کمشنر صاحب کے تین تین بل ڈاگ بیٹھے ہیں، سو— مونا لیزا کے بھائی! جمائی جی کی وہ خاطر کریں گے کہ سیدھے گھر آ کر ہی...''

''اور جو ہے سو ہے، مگر یار، پھانسا خوب! نوٹسی تیار کر کے پڑھنے کے، پارٹنر، یہ فائدے ہیں، سمجھے کچھ؟ تم زندگی بھر بیٹھے بیٹھے لال سیاہی سے کتابوں پر نشان لگاتے رہنا، کوئی پوچھنے نہیں آئے گی۔ گھوٹا رام کا سر کڑاہی میں اور پانچوں گھی میں! کالج لائف انجوائے کرنی ہے تو آدمی کو چاہیے ایک خوب صورت سی کاپی میں نوٹس تیار کر کے الگ رکھ لے۔''

''مگر ڈارلنگ، یہ ہوا کیسے؟ باپ سالے کی آنکھیں ہیں یا بٹن؟ اسے پٹتا نہیں ہے کہ جو چغد

سارے دن ٹیوشن کرے، نہ جس کے سر پر چھت ہو اور نہ پیروں تلے فرش، وہ کیا کھلائے گا بٹیا کو؟''

''تریاہٹ می لارڈ، تریاہٹ! لونڈیا بغیر کھائے پیے ستیا گرہ کیے پڑی رہے تو بولو، باپ بے چارہ کیا کرے؟''

''ارے جناب، کرے کیوں نہیں؟ مرد بچہ ہو تو ہنٹروں سے وہ ٹھکائی کرے کہ سارا رومانس فاختہ ہو جائے۔ اور ان مجنوں صاحب کو تو یوں چٹکیوں میں اڑا دے... کٹوا کے بہا دے راتوں رات۔ کیا مجال جو کسی کو سراغ لگ جائے ذرا بھی! ہمت ہونی چاہیے، مسٹر، ہمت!''

''ہمت تو بھائی جان، کشور کی ماننی پڑے گی۔''

''نان سنس! اس کی تو آج بھی ہمت اس باؤنڈری میں گھسنے کی نہیں ہوتی۔ وہ تو ہماری مونا لیزا ہی سب کر رہی ہیں...''

''ہائے مونا، تیری یہ شامت!''

ان فقروں اور قہقہوں کے بیچ کشور بھلے ہی اپنے کو ہیرو کے روپ میں دیکھنے لگا ہو، لیکن یہ سچ ہے کہ لینا کی مضبوطی اور حوصلے کے آگے کہیں یہ اپنے کو بہت چھوٹا اور کمتر محسوس کرتا تھا۔ اور اس میں بھی جھوٹ نہیں کہ شادی ہو چکنے کے بعد والے دن تک اسسٹنٹ کمشنر دیکشت کے بنگلے کے پھاٹک کا ''بی ویئر آف ڈاگ'' کے اوپر والا کنڈا کھولتے ہوئے اس کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا تھا۔ السیشین کتوں کے ڈر سے نہیں، لینا کے بھائیوں کے ڈر سے بھی نہیں، بلکہ دیکشت صاحب کی نظروں کے ڈر سے۔ خون کو جما دینے والی ان ٹھنڈی نگاہوں کے سامنے پڑ کر واپس آسکنے کی سکت بھی اس میں رہ جائے گی یا نہیں؟ آج تو لگتا ہے، جو کچھ اس دنوں ہوا کشور اس سب کا فقط غیر جانبدار تماشائی تھا۔ شادی دیکشت صاحب کے یہاں نہیں، کورٹ میں ہوئی تھی۔ اس کے پہلے اور بعد میں ٹریجڈی اور فارس، دو ناٹک ہوئے تھے: یعنی شادی سے پہلے مار ڈالنے، اس لفنگے کو کہیں کا نہ رکھنے اور پانچ دن بھوکے رہنے، کمرے میں بند کر کے سڑنے دینے کا ناٹک ہوا، جس کے آخری ایکٹ میں ایک دن کشور نے لینا کو صبح سویرے اپنی کوٹھری کے دروازے پر کھڑا پایا— بدحواس، خالی ہاتھ۔ ''اپنے گھر رہنے آئی ہوں۔ کتنی مشکل ہوئی ہے نکلنے میں کہ بس! اب کوئی ہمارا کیا کر سکتا ہے؟ قانوناً ہم لوگ پتی پتنی ہیں۔'' پھر کس طرح ''بھاڑ میں جاؤ'' کے انداز میں سب دکھاوا کرنا پڑا، کس طرح مسوری کے ایک ہوٹل میں ڈبل بیڈ روم کا انتظام کر کے انھوں نے دو ٹرین ٹکٹ کشور کو دیے اور اسٹیشن پر جب اپنی بیٹی کو وداع کیا تو سختی کے مکھوٹے کا موم پگھل آیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں نمی تیر آئی، لیکن ایک تناؤ بنا رہا اور لاتعلقی کا ناٹک کرتا کشور گردن اکڑائے اپنے اور دوسروں کو یقین دلاتا رہا— طبقے کی دیواریں آخر لوگوں کے جذبوں کو کتنے دن اور کچلیں گی؟ آدمی ہی تو ہے جو تاریخ کو بناتا اور بدلتا

ہے۔عزت، دھن کی، ذات پات کی، پوزیشن کی عزت کا فیصلہ ہم لوگوں کے نصیب کا فیصلہ کیوں کرے؟ لیکن یہ سارے گھسے پٹے جملے ماحول میں موجود ذلت کے ڈنک سے اسے اچھوتا نہیں رکھ پاتے تھے۔

پاپا نے کچھ نہیں دیا— دینے کی بات بھی نہیں تھی اور کشور اس کی امید بھی نہیں کر رہا تھا، لیکن اسٹیشن پر یہ خاموش آسرا بھی ٹوٹ گیا۔ پلیٹ فارم کی گھڑی کے پاس جب ہری جھنڈی ہلی تو انھوں نے لینا کے ہاتھ میں ایک بند لفافہ رکھ دیا۔ ''اسے بعد میں دیکھنا۔'' گاڑی چلی تو کشور کو لگا کہ دیکشت صاحب نہ تو اس سے ہاتھ ملانا چاہتے ہیں نہ آنکھیں۔ وہ یوں ہی کھوئے کھوئے سے، سخت چہرہ کیے، ایک طرف کھڑے رہے اور اس سے نہیں، لینا سے اکھڑے اکھڑے بولتے رہے۔ اسٹیٹ ایکسپریس کا ڈبا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی تبدیلی میں دلی اضطراب کو نمایاں کرتا رہا۔ گاڑی چلی، لفافہ کھلا— لینا کے نام پانچ ہزار کا اکاؤنٹ پے ای چیک تھا۔ پہلی چیز کشور کے دماغ میں ٹکرائی، ''صرف پانچ ہزار!'' پھر لگا، یہ پانچ ہزار روپوں کا نہیں، پانچ ہزار بے یقینیوں کا چیک ہے: جس آدمی کے ساتھ تم جا رہی ہو، اس کے ساتھ کبھی مرنے لگو تو ان روپوں سے کام چلا لینا۔ کشور کا چہرہ پڑھ کر لینا سمجھاتی رہی، ''پاپا بے حد کٹر اصولی آدمی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جھوٹے دکھاوے اور روپے کی بربادی سے کیا فائدہ؟ جو روپیہ دینا ہے وہ سیدھے ہی کیوں نہ دے دیا جائے؟ بجائے اس کے کہ وہ ہمیں کوئی الٹی سیدھی چیز دے دیتے اور ہمیں پسند نہ آتی، کیا یہ زیادہ اچھا نہیں ہے کہ ہم خود اپنی ضرورت کی چیز خرید لیں؟'' وہ کچھ نہیں بولا۔ اپنے زکام کو بار بار رومال میں صاف کر کر کے رکھتے اور اسٹیٹ ایکسپریس کا ٹن ہاتھ میں لے کر باتیں کرتے دیکشت صاحب کی شکل اس کے سامنے گھومتی رہی۔ گیارہ بارہ سال ہو گئے، اس شکل کی ریکھائیں اب الگ الگ لوگوں کے چہروں میں سما گئی ہیں اور اسے جوں کا توں یاد کر لینا بھی اس کے لیے ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن اس دن والا اثر آج بھی دماغ سے نہیں جاتا۔ منہ کی طرف بڑھتا سگریٹ والا ہاتھ، اور سانولے ہونٹوں کا اسے پکڑنے کے لیے اونچا ہو آنا، بائی فوکل چشمے سے باز جیسی تیز آنکھوں کا جھانکنا— سپریم کانفیڈنس اور ہر چیز کو آر پار چھید کر اس کو جانے بیٹھے ہونے کا تاثر— سب ملا کر ایک اونچائی پر کھڑے، حقارت سے نیچے دیکھتے شخص کا للکارتا انداز۔ من ہی من دانت بھینچ کر کشور نے سوچا، ''سالا شکل سے ہی ٹوڈی بچہ لگتا ہے۔ ہماری سرکار نے ان لوگوں کو ریٹائر کیوں نہیں کیا؟'' پھر ایک دوسرا لفظ دماغ میں آیا، ''بیوروکریٹس!''

ہوا ٹھنڈی تھی۔ کھانا کھا کر دونوں باہر نکلے تھے اور کلڑی مال پار کر کے رکشا اسٹینڈ کے سامنے ہی دیوار پر، ذرا ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ اندھیرے میں جگمگاتی بتیوں کی آڑی ترچھی مالائیں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے اوبڑ کھابڑ اندھیرے میں چلی گئی تھیں... کہ چٹان کے گچھے کے بعد بس کہیں کہیں بتیاں سڑک کا تاثر دیتی تھیں۔ نیچے، بہت دور، ہلکے اجالے کو دیکھ کر لگتا تھا وہاں دہرہ دون ہے۔

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں لینا،'' تین دنوں سے گھمڑتی بات کو کشور الفاظ دینے کی کوشش کر رہا تھا، ''کہیں ہم لوگوں سے کچھ غلط تو نہیں ہو گیا...'' وہ لائبریری چوک والے منڈپ کو دیکھتا رہا۔ لینا کی اس ساری سختی نے اسے ڈرا دیا تھا۔ جو لڑکی اپنے دبنگ باپ کی فکر نہ کرے، وہ سچ مچ ڈرنے لائق ہی ہے۔

کالے شال کو ایک بار کھول کر سارے کندھے ڈھکتے ہوئے لینا سامنے دیکھتی بولی، ''دیکھو کشور، میں بچی نہیں ہوں۔ میں جلدی فیصلے نہیں لیتی اور جب ایک بار فیصلہ لے لیتی ہوں تو اس پر ٹکنے کی کوشش کرتی ہوں۔ پاپا کو بھی جانتی ہوں اور تمھیں بھی سمجھتی ہوں۔ سب جانتے بوجھتے ہوئے پورے ہوش حواس میں تمھارے ساتھ کورٹ گئی تھی۔ اور سچ کہوں، میں اسے بھی پاپا کی مہربانی ہی سمجھتی ہوں کہ انھوں نے اتنا کیا۔ میں تو تمھارے یہاں جب پہنچی تھی تو اس سب کا موہ چھوڑ کر پہنچی تھی۔ جانتی تھی، یہ سب نہیں ہوگا...''

''نہیں ہوتا تو زیادہ اچھا تھا،'' گہری سانس لے کر اس نے دھیرے سے کہا۔ لینا کے لہجے کی یہ ٹھوس ثابت قدمی اسے اپنے آپ کی حریف لگتی ہے۔ اور اچانک اسے دیکشت صاحب کی وہ بے نیازی یاد آ گئی جو اسے محسوس کراتی تھی جیسے وہ زمین پر رینگنے والا کیڑا ہو۔

''خیر، جو ہوا سو ہوا، پاپا کو معاف کر دو۔ دیکھو، ان کا سوچنے کا، دنیا کو دیکھنے سننے کا، چلنے چلانے کا، اپنا ایک طریقہ ہے۔ شاید اسے اب وہ بدل بھی نہیں سکتے۔ کم سے کم تم ان کا اسی بات کا لحاظ کر لو کہ میں ان کی اکلوتی لڑکی ہوں، سب بھائیوں سے بڑی۔ میری شادی وہ سچ مچ شوق سے ہی کرنا چاہتے تھے...'' لینا کا گلا بھرّا آیا، ''یہاں ذرا سی اٹک اس سے آ گئی ہے، ورنہ ہم جانتے ہیں پاپا کے من میں تمھارے لیے کتنی عزت ہے۔ بہت بار انھوں نے کہا ہے— کشور ایمان دار اور محنتی لڑکا ہے۔ اسے دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے دن یاد آ جاتے ہیں۔'' اور وہ تفصیل سے بتاتی رہی، ''پاپا خود سیلف میڈ آدمی ہیں۔ چاچا تایوں نے تو ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔ خود پڑھے، چھوٹے بھائی بہنوں کو پڑھایا، بھائیوں کو نوکری دلائی، بہنوں کی شادی کی۔ آج جو کچھ ہیں صرف اپنے بوتے پر ہیں۔ آپ کے سنگھرش کو وہ نہیں سمجھیں گے تو کون سمجھے گا؟ خود انھوں نے کیا کم تکلیفیں دیکھی ہیں؟ اس لیے جانتے ہیں افلاس کیا ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم لوگوں کی کبھی کسی خواہش کو ادھورا نہیں رکھا، آدھی رات کو اٹھ کر ہم لوگوں نے کہا— پاپا، ٹرائی سکل لیں گے، تو یہ آدمی دکان کھلوا کر ٹرائی سکل لایا ہے۔ کہتے تھے— میری خواہشیں اگر ادھوری رہ گئیں تو میں اپنے بچوں کا من کیوں ماروں؟''

لینا کا یہ بہاؤ کشور کو کنارے پر بغیر بھیگا کھڑے چھوڑ جاتا ہے: ''اور تم آئی بھی تو ہو ایک ایسے آدمی کے ساتھ جس نے خود کبھی زندگی میں نہیں جانا کہ خواہشیں پوری ہونا کسے کہتے ہیں۔ بھیا کو اسّی، سو روپے بھجواتے ہیں۔ ان پڑھ بھابی ہیں جنھوں نے مجھے ماں کی طرح پالا ہے۔ ماں باپ کا پیار میں نے تو صرف بھیا

میں ہی پایا ہے۔ اس لیے کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ دوستی تک تو ہم لوگوں کے تعلقات ٹھیک تھے، لیکن آگے...''

''پھر وہی بات! دیکھو، کوئی بھی لڑکی جب ایسے فیصلے لے لیتی ہے کشور، تو خوب آگا پیچھا سوچ لیتی ہے۔ مجھے سبھی طرح کی زندگی جینے کی عادت ہے۔'' اس نے کشور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''آج تو تمھاری لیکچرر شپ پکی ہے نا، اس لیے ایک سہارا ہے۔ یہ نہ بھی ہوتی تب بھی میں نے تو آنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ اب ہم دونوں کے سکھ دکھ الگ کہاں رہ گئے ہیں؟ ارے میں تو کہتی ہوں، اس سال میں فائنل کیے لیتی ہوں؛ پھر بے فکر ہو کر پی ایچ ڈی کر ڈالو۔ یہ ٹیوشنیں اور نوٹس تو تم بند ہی کر دو۔ میں بھی کوئی چھوٹی موٹی نوکری لے لوں گی۔'' پھر بہت ہی لاڈ اور ڈھارس سے اس کے کندھے پر بانہہ رکھ کر بولی، ''چھوٹی سی زندگی ہے، یوں ہی بیت جائے گی...''

آج بھی یاد ہے، کشور کو لگا تھا کہ لینا کے منہ سے اپنی بات نہیں، فلمی اور رومانی کتابیں بول رہی تھیں۔ گھڑی دیکھ کر جب وہ لوگ اٹھے تو لینا نے اسے اس طرح دلاسا دیا جیسے بچے کو سمجھا رہی ہو، ''دیکھو، ہم لوگ ٹرین میں سفر کرتے ہیں۔ بہت تکلیفیں، ناگواریاں، ذلت اور بدمزگی ہوتی ہے۔ لیکن سفر پورا کرنے کے بعد کوئی بھی انھیں یاد نہیں رکھتا۔ پاپا نے غلط کیا یا صحیح، اب تو ہماری زندگی اپنی اور خود مختار زندگی ہے۔ پاپا اس میں کہاں آتے ہیں؟''

ہاں، پاپا اس میں کہاں آتے ہیں! نہ ہوگا تو آگے ان سے کوئی واسطہ نہیں رکھیں گے۔ اس دن سنسان مال پر کشور نے لینا کو کمر سے اپنے پاس کھینچ لیا، ''تم بہت سمجھدار ہو لینا، پتا نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے کبھی کبھی! یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بہت اہم لگنے لگتی ہیں۔ اسی طرح بھٹکاؤ میں مجھے سہارا دیتی رہنا...'' دل میں سوچا، لینا جس طبقے اور رجن لوگوں میں رہتی آئی ہے، قوت فیصلہ اور واضح انداز فکر ان لوگوں کی بہت بڑی خصوصیت ہے، کیوں کہ حالات پر ان کا اختیار ہوتا ہے...

چھوٹی چھوٹی باتوں کے زیادہ اہم لگنے کا سلسلہ شروع کہاں ہوا تھا، یہ تو صحیح یاد نہیں، لیکن وہ ختم کہیں نہیں ہوا— ختم ہوا کشور اور لینا کو الگ کرا کے، ایک نئے سلسلے کی شروعات کر کے... آج لینا کا منشا اسی ماضی سے ہے کیا؟... اس نے پائپ نکال لیا، سلگایا اور سر سے پکڑ کر پیتا رہا...

کچھ واقعات ابھی بھی بھلائے نہیں بھولتے... اور آج بھی کسی لڑکی کو ٹینس کھیلتے دیکھ کر، کسی پارٹی میں، ہوٹل میں، چھری کانٹے اٹھاتے رکھتے یاد آجاتے ہیں... دیکشت صاحب کی طرف سے شادی کا ڈنر تھا— ان کے لان میں ہی۔ چھری کانٹے سے دوستوں کے ساتھ، کالج کینٹین یا کسی کے گھر ایٹ ہوم پارٹی

کھاچکا تھا۔ لیکن خاص مہارت نہ ہوتے ہوئے بھی کھانے میں دقت نہیں ہوئی، ختم کر کے اس نے چھری کانٹے کا کراس بنا کر خالی پلیٹ میں رکھ دیا، اور چپ چاپ ہونٹوں پر فرمائشی مسکان لاکر مہمانوں کی چہل پر ہنسنے کی کوشش کرنے لگا... وہ سب اپنی ہی باتوں میں مگن تھے اور شاید کسی کو احساس نہیں تھا کہ جس کی شادی کی پارٹی وہ لوگ کھا رہے ہیں، وہ شخص بھی وہاں موجود ہے۔ پاس بیٹھی لینا نے بہت دھیرے سے پوچھا، ''ارے آپ کھا چکے کیا؟'' لاپروائی سے اس نے ''ہاں'' کہا اور دیکشت صاحب کا تہہ کیے نیپکن کو ہونٹوں سے لگانا دیکھتا رہا۔ تبھی اوروں کی نگاہ بچا کر لینا نے دھیرے سے اس کی پلیٹ کے چھری کانٹے کے کراس کو بگاڑ کر انھیں دو متوازی لکیروں کی طرح رکھ دیا۔ اس نے بھی دیکھا، کھانا ختم کرنے والے متوازی ہی رکھتے ہیں اور اس کی معلومات غلط تھی۔ تھوڑی دیر وہ اُدھر سے دھیان ہٹائے رہا، مگر بعد میں جانے کیا ہوا کہ پھر سے انھیں کراس کی شکل دے دی۔ میز کے نیچے لینا نے دھیرے سے اُس کا پاؤں چھوا تو ضدی انداز سے بولا، ''ابھی ایک کٹلٹ اور لوں گا...''

تب سے وہ لینا کے ساتھ کھاتے سمے، کھانا ختم کر کے چھری کانٹے کراس کی حالت میں ہی رکھتا...

پھر اس کا غٹ غٹ پانی پینا، چپ چپ کھانا، اور ''ہری اوم'' کی لمبی ڈکار کے ساتھ آسودگی کا اظہار کرنا، لینا کو پسند نہیں ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی وہ اسے چڑانے کے لیے یہی کرتے ہوئے کھاتا۔ اسے لگتا اس میں لینا کی ذاتی ناپسندیدگی اتنی نہیں ہے، جتنی حقارت کی یہ ادا کہ ''تمھیں مہذب سماج میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا، اس لیے شاید یہ نہیں جانتے کہ یہ جہالت ہے۔'' کوئی چیز لذیذ لگتی تو جلدی جلدی لمبی سڑاکے دار آواز کے ساتھ منھ بھر لیتا، اور جھوم جھوم کر گنگناتے ہوئے اس کا مزہ لیتا اور لینا کی آنکھوں میں پڑھتا: ''شاید پہلی ہی بار کھا رہے ہو نا؟'' حالانکہ یہ بھی سمجھ لیتا کہ اس کے ایسا کرتے وقت جان بوجھ کر لینا دوسری طرف منھ کر کے رسوئی میں جھانکنے لگی ہے۔

لینا کو دھوبی کی دُھلی، صاف سفید، استری کی ہوئی ساڑھی پہن کر سونے کا شوق تھا، اور اس کا خیال رہتا کہ وہ بھی دھوبی کا دھلا کرتا پاجامہ پہن کر سوئے۔ لیکن کشور کسی بھی طرح اپنے من کو تیار نہ کر پاتا۔ جس طرح کے کپڑوں کو وہ دو دو تین تین دن پہنتا، اور باہر سے لوٹ کر جنھیں کھونٹی یا کواڑ پر لٹکا دیتا رہا ہے کہ اگلے دن پہننے لائق رہیں، انھیں پہنے ہی کیسے بستر میں گھس جائے؟ دو گھنٹے ان پر کیا اسی لیے بے چارے دھوبی نے محنت کی تھی (اکثر ہی لینا استری ٹھیک نہ ہونے پر آدھے کپڑے دھوبی کو لوٹا دیتی تھی) کہ انھیں پہنتے ہی بستر پر لیٹ کر برابر کر دینا ہے؟ لوٹے میں انگارے بھر کر رات کو دیر تک اپنے ہاتھ کے دھلے کپڑوں پر استری کرنا اسے ابھی تک یاد ہے، اس لیے استری کرنے کی مشقت کو جانتا ہے۔ وہ اس کرتے پاجامے کو یوں ہی سرھانے رکھا چھوڑ کر کہیں سے کوئی گندے کپڑے نکال لیتا۔ ''کیا ہے، کہیں کونے میں

نہ پڑے رہے، جسم پر ہی رہے۔ سونا ہی تو ہے!'' لینا چڑتی، ''تمھیں گندے کپڑے پہننے کا خاص شوق ہے۔'' اسے لگتا، جیسے کہہ رہی ہو، ''صاف کپڑے پہننے کی عادت نہیں ہے نا!''

انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ لینا نے اس کی اٹیچی بستر تیار کیے۔ اپنی بید کی چوکور ٹوکری میں دو پلاسٹک کی پلیٹیں، گلاس، تولیہ، نیپکن، کیلے سنگترے وغیرہ رکھ دیے۔ غسل خانے سے نکل کر گیلے بالوں کو جھٹکے سے کاڑھتے، چھینٹے اڑاتے ہوئے کشور نے پوچھا، ''ارے بھئی، یہ سب کیا ہے؟'' لینا مصروف انداز سے سامان لگاتی رہی، ''کچھ نہیں، راستے کی تیاری ہے۔ پاپا کی تیاری میں ہی کرتی تھی۔'' کشور نے ملائم لہجے میں کہا، ''کیوں یہ سب بے کار محنت کر رہی ہو؟ راستے میں میرا من ہی نہیں ہوتا کچھ کھانے پینے کو۔ پھر تھرڈ کلاس میں آدمی خود بیٹھ جائے، اتنا ہی کافی ہے۔ یہ تام جھام جتنا کم ہو اتنا اچھا ہے۔ بے کار ٹوٹ ٹاٹ جائے۔'' پھر جب کنگھی اندر رکھ کر لوٹا تو اصلی بات کہی، ''اس کے لیے ایک قلی الگ سے کرنا ہوگا۔ اٹیچی بستر کا کیا ہے۔ لیے اور ہاتھ میں لٹکا لیے!'' لینا کا ہاتھ رک گیا۔ اُس نے غور سے کشور کو دیکھا اور اس کے آگے بائی فوکل چشمے سے جھانکتی دیکشت صاحب کی آنکھیں آ گئیں...

لینا کو شوق تھا، گھر میں اچھے پردے ہوں؛ اور اسے لگتا، پرانی ساڑیوں کے پردے کیا برے ہیں؟ گھر میں نئے ٹی سیٹ کی ضرورت تھی۔ تحفے میں ملے ٹی سیٹ دیکشت صاحب کے ساتھ ہی، اُس شہر میں چھوٹ گئے تھے اور وہ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ طے ہوا، شام کو ساتھ چلیں گے۔ لیکن وہ خود ہی کالج سے بازار چلا گیا، اور جب آیا تو سیکنڈ گریڈ کاٹی سیٹ سائیکل کی ڈولچی میں تھا۔ کسی بے معلوم سی چیخ یا ٹیڑھے پن کو کون غور سے دیکھتا ہے؟ چیز تو آدھے داموں میں آ گئی۔ لینا نے دیکھا تو ناک بھوں سکوڑ لیں، ''کیا اٹھا لائے!'' اگلے دن وہ خود جا کر نیا سیٹ لائی۔ بولی، ''تمھارے پیسے نہیں خرچ کیے ہیں۔ اپنے پیسوں سے لائی ہوں...'' اپنے پیسوں کو لے کر اس کے منھ تک کوئی بات آئی تھی، تبھی کوئی آ گیا۔

یہ سب تو چلا بغیر بولے؛ لیکن ایک دن جب ریستوران سے نکلے تو بولنے کا لحاظ بھی ٹوٹ گیا۔ شاید اسے اتنا برا نہ لگتا، لیکن ساتھ میں تھا کشور کا ایک شریک کار، انگریزی شعبے کا مہتہ۔ لینا کا فائنل تھا، اس لیے مدد کرنے اکثر مہتہ آ جاتا تھا۔ شام کو اکثر ساتھ ہی پروگرام بنتا۔ کم سے کم چائے ساتھ ہی پیتے تھے۔ جب تک کشور پیسے نکالے نکالے کہ مہتہ نے جھٹکے سے پرس نکال کر دس کا نوٹ تھالی میں پھینک دیا۔ ٹپ کے چار آنے چھوڑے اور باہر آتے ہوئے بولا، ''میں سمجھتا ہوں ان بے چاروں کو ضرور کچھ نہ کچھ چھوڑنا چاہیے۔ یہ ہوٹل والے انھیں دیتے ہی کیا ہیں؟ سارا گذارہ تو ٹپس پر ہی چلتا ہے ان کا...''

''ہمارے 'یہ' ٹپ دینے میں سب سے زیادہ تکلیف پاتے ہیں،'' لینا ہنس کر بولی، ''بہت دل کڑا کر کے چھوڑا تو ایک آنہ چھوڑ دیا!''

''ہم پوچھتے ہیں، یوں پیسہ پھینکنے سے فائدہ؟'' اس نے صفائی کے وکیل کی سی دلیل دی۔ ''ایک تو دو پیسے کی چیز کے چار آنے دو— پھر یہ ٹیکس! میں کہتا ہوں کہ یہ ٹپ بازی پردیس میں اتنا بڑا سردرد ہوگیا ہے کہ لوگ پریشان ہیں۔ دروازہ کھولا ہے، ٹپ دیجیے، لفٹ سے لائے ہیں؛ ٹپ دیجیے، ٹیکسی کا بھاڑا دیا ہے، ٹپ دیجیے، ہوٹل کے بیرے نے آپ کی ڈاک لاکر دی ہے، ٹپ چاہیے! ٹپ نہ ہوئی سالی مصیبت ہو گئی! ہمیں تو اِس سب کو ڈس کریج کرنا چاہیے۔ بھئی، چیزوں کے دام آپ دو پیسے اور بڑھا دیجیے، لیکن ٹپ کے نام پر یہ جیب کترائی تو بند کیجیے... میں تو اس کے ایک دم خلاف ہوں...'' وہ لینا سے بحث کے انداز میں بولتا رہا۔

''خیر، اچھا یا برا، مہذب سماج کا ایک طریقہ بن گیا ہے،'' لینا نے بتایا۔

''اچھا مہذب سماج ہے! ایک پورے طبقے کو بخشش اور ٹپس پر پالنا غلامی ہے۔'' کشور کو غصہ آ گیا۔

''ایسا نہ کریں تو یہ لوگ بھی تو ٹھیک سے سرو نہیں کرتے— کوئی سنے گا ہی نہیں...''

''یعنی جس کے پاس ٹپ دینے کو فالتو پیسے نہ ہوں، اسے یہاں آنے کا حق نہیں ہے؟ اسے نہ کھانے پینے کا حق ہے، نہ اچھی جگہ بیٹھنے اٹھنے کا!'' اس کی بات میں کڑواہٹ آ گئی۔ ''بل کے پیسے ہوں نہ ہوں، لیکن ٹپ ضرور ہو!''

''اسے پرسنل کیوں بناتے ہو، کشور؟'' لینا نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ ''بہرحال، آپ کی بات ٹھیک بھی ہو، پھر بھی میں نے دیکھا ہے کہ پیسہ آپ سے چھٹتا نہیں ہے۔'' لینا نے مہتہ کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے پان لے کر منھ بھر لیا۔

کشور کی آنکھوں کے آگے ''بی ویئر آف ڈاگ'' کا پھاٹک گھوم گیا۔ بولا، ''لینا جی، مجھے ملتے ہیں دو سو روپے— سو بھی آج۔ اور آپ کو رہنے کی عادت ہے اس ماحول میں جہاں ہزار روپے تنخواہ اور ڈیڑھ ہزار کی اوپری آمدنی ہوتی ہے— وہ لوگ پانچ روپے کے بل پر ایک روپیہ ٹپ دے سکتے ہیں...''

اُس دن لینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے، اور گھر آ کر تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رات بھر روتی رہی اور کشور ڈرے بچے کی طرح معافی مانگتا رہا۔

اکثر اسے رحم بھی آتا تھا۔ لینا سبزی کاٹتی، جھاڑو لگاتی، صفائی کرتی، یا کپڑے دھوتی، تو کشور کا من ایک عجیب رحم سے بھر بھر آتا۔ بے چاری لاڈ پیار، نازنخروں سے پلی لڑکی کہاں آ گئی ہے! تب وہ آگے آ کے

سارے کام کر دیتا۔ وہ کپڑے بھیگے چھوڑ کر آتی تو دھو کر سکھا دیتا؛ وہ برش کرتی، تب تک خود اسٹوو جلا کر چائے بنا دیتا۔ وہ کھانا بناتی تو نہانے سے پہلے کمرے جھاڑ دیتا۔ لینا کتابیں کھولے پڑھ رہی ہوتی اور وہ چپکے سے برتن مل ڈالتا۔ حالانکہ یہ چیز اسے اور بھی چبھتی کہ لینا جان گئی ہے، پھر بھی نہ جاننے کا بہانہ کر کے بیٹھی پڑھ رہی ہے۔ لیکن دیکھ کر ان دیکھا کرنا مشکل ہو جاتا تو لڑتی، اور وہ کہتا، ''دیکھو لینا، مجھے تو یہ سب کرنے کی عادت ہے۔ شروع سے کیا ہے۔ بھابی بیمار یا باہر ہوتی تھیں تو سبھی کچھ کرتا تھا۔ لیکن تم نے تو رسوئی میں جھانک کر بھی نہیں دیکھا ہوگا۔'' اس کا گلا رندھ جاتا، ''تم بھی کیا سوچتی ہوگی، لینا۔ کہاں...'' لینا گہری سانس لے کر جھڑک دیتی۔

جب وہ سج سنور کر باہر نکلتی تو کشور اسے دیکھتا رہ جاتا— ہیئر اسٹائل، میچنگ سنس، ہر چیز کا چناؤ اور مقام، سبھی میں کچھ ایسی نفاست اور سلیقہ رہتا کہ لگتا وہ کشور سے بہت دور چلی گئی ہے، رسائی سے باہر ہو اٹھی ہے۔ اسے اپنا آپ بہت ہی چھوٹا اور حقیر محسوس ہونے لگتا۔ وہ خود ہی جیسے حق نہ رکھنے والا، غیر اور اجنبی بن کر اسے ٹھگا سا دیکھتا رہ جاتا۔ اس لمحے اسے لینا کے حسن اور ذوق پر فخریہ اطمینان ضرور ہوتا، لیکن پیچھے کہیں ریڑھ کے اندر مشکوک خوف سرسرایا کرتا— سچ مچ وہ لینا کے لائق نہیں ہے! کہاں وہ اور کہاں لینا! ضرور لینا بھی تو اپنے آپ کو اور اُسے دیکھ کر کبھی کبھی سوچتی ہی ہوگی کہ وہ کہیں غلط کر بیٹھی ہے۔ جانے کیسے اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب لینا کو اس کے ساتھ آنے کا افسوس ہونے لگا ہے، اِدھر وہ زیادہ سست اور اداس رہنے لگی ہے۔ کہاں اس وقت وہ کسی شان دار گاڑی میں بیٹھی گھومنے جا رہی ہوتی اور کہاں اب بار بار دھوپ میں رومال سے گلے کنپٹیوں کا پسینہ پونچھتی، دھول دھکڑ میں، رکشے میں لدی، پہیے سے ساڑھی بچاتی چلی جا رہی ہے... ساتھ لگے اِس بدھو، چغد، گھنے، منحوس اور کنجوس (یا غریب) کو دیکھ کر کیا ہر لمحے دھڑکتے دل سے یہی نہیں مناتی ہوگی کہ ہائے رام، اِس وقت کوئی جان پہچان کا نہ مل جائے! حالانکہ وہ خود بھی بہت خیال رکھتی تھی کہ جب کشور اس کے ساتھ ہو تو سب سے اچھے کپڑوں میں ہو... مگر اُس کے پاس اچھے کپڑے تھے کہاں؟

''دیکھو، کل ایک جہاز کریش ہو گیا... آئی اے سی کا وِسکاؤنٹ تھا...'' اخبار پڑھتے پڑھتے اس نے مہتہ اور لینا کو سنایا۔ اکثر جب وہ تینوں بیٹھتے تو کشور کو لگتا جیسے اس کے پاس بات کرنے کو کوئی موضوع ہی نہیں ہے۔ اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے وہ کچھ اٹھا کر پڑھنے لگتا— حالانکہ ایک آدھ بار لینا نے بتایا بھی کہ یہ بدتمیزی ہے۔

''کیا تھا؟'' لینا اسٹوو کے پاس تھی۔ جیسے کم سنتی ہو، اس طرح کان پر زور دے کر پوچھا۔ ویسے بھی

اسٹوو کی آواز رسوئی میں گونج رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے مہتہ کو دیکھا کہ کہیں سن تو نہیں لیا۔

''انڈین ایرلائنز کا وِسکاؤنٹ تھا،'' کشور نے دہرایا۔ وہ اور مہتہ آنگن میں مونڈھوں پر بیٹھے تھے۔ لینا رسوئی میں، پاس ہی، چائے بنا رہی تھی۔

''وسکاؤنٹ نہیں، پروفیسر صاحب، وائکاؤنٹ بولو!'' لینا نے ہنس کر کہا تو پھر وہی بائی فوکل شیشے اور حقارت کا احساس کراتی دو بے نیازی سے بھرپور آنکھیں اسے تلملاتا چھوڑ گئیں۔

''ارے ہاں ہاں، آپ کانونٹ میں پڑھی ہیں۔ ذرا اسپیلنگ تو دیکھو!'' کشور ضد کرتا رہا۔

''مہتہ صاحب، ذرا انھیں بتایئے،'' وہ وہیں سے بولی۔

مہتہ اچکچا اُٹھا۔ معافی مانگنے کے لہجے میں کہا، ''پروفیسر صاحب، ہے تو وائکاؤنٹ ہی...''

''ارے، ان انگریزی لفظوں کا کوئی ایک تلفظ ہے؟'' کشور بھڑک اٹھا۔ ''انگریز اور امریکنوں کی بات چھوڑ دیجیے۔ انگلینڈ میں خود ہزاروں لفظوں کے تلفظ طے نہیں ہیں۔ ایک انگریز بولتا ہے ڈاریکشن، دوسرا کہے گا ڈائریکشن! ایک کہے گا آفن، دوسرا بولے گا آفٹن! لکھا ہے لیوٹیننٹ، اسکیننگ، پڑھ رہے ہیں، لیفٹیننٹ، شیئنگ! اسپیلنگ ہے جی او اے ایل، بولا جا رہا ہے جیل!... آئی ہیٹ دِس لینگویج، جو صرف کانونٹ کے بچوں کی میراث ہو، یعنی غریب آدمی کی پہنچ سے باہر ہو — دی لینگویج آف امپیئر یلسٹس اینڈ بیوروکریٹس!'' اور اس لفظ کے یاد آتے ہی اسے لگا جیسے وہ مہتہ اور لینا کو نہیں، اِن دونوں کے پیچھے کہیں پیچھے کھڑے دیکشت صاحب کو یہ سب سنا رہا ہے، ''سالے ہماری زبان کو کہیں گے ورنا کیولر... جانتے ہیں، ورنا کیولر کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ ورنا کیولر مینس دی لینگویج آف رومن سلیوز... جنم جنم کے غلاموں کی زبان...''

اس کے غصے پر لینا زور سے ہنس پڑی۔ ''لیکن اِس پر اتنا غصہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ اپنی غلطی مان لیجیے نا، اور ناراض ہو کر بھی وہی زبان بول رہے ہیں جس پر ناراض ہیں!'' وہ ہنستی رہی۔

شٹاٹ! جانے اسے کیا ہوا کہ زور سے اُس نے اخبار زمین پر پٹکا اور جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا، ''ٹھیک ہے، ہم کانونٹ میں نہیں پڑھے ہیں۔ ہمارا تلفظ خراب سہی، لیکن اِسی کانونٹ نے تمھارا دماغ خراب کر دیا ہے...'' اور وہ مہتہ کو حیران چھوڑ کر باہر چلا آیا۔ آتے ہوئے کہہ آیا، ''میں غریب آدمی ہوں لینا، لیکن میری اپنی عزت ہے!''

بعد میں اپنی اشتعالی کیفیت پر اسے افسوس ہوتا رہا... تین چار دنوں کے تناؤ، رونے دھونے کے بعد اس نے خود لینا سے معافی مانگی کہ غلطی اسی کی تھی، نہ معلوم اسے کیا ہو گیا تھا...

کیا ہو گیا تھا نہیں، کیا ہوتا چلا جا رہا تھا — سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اسے جیسے لینا سے، اس کے

سامنے پڑنے سے ڈر لگنے لگا تھا۔ لینا کا ایک خاص طرح کا سخت یا ضدی انداز ہے، جس کے سامنے وہ نروس ہوجاتا ہے، اور یا تو کچھ اول جلول کہہ بیٹھتا ہے یا اس سے ایسا ہی کچھ ہوجاتا ہے۔ اسے ہمیشہ خطرہ رہتا ہے کہ نہ معلوم کسی مذاق میں یا سنجیدگی سے وہ کیا کچھ کہہ دے اور لینا کا چہرہ سانولے گمبھیر چہرے میں بدل جائے اور وہاں بائی فوکل چشمہ ابھر اٹھے...

وہ اپنی تھیسس کے سلسلے میں روز شام کو یونیورسٹی لائبریری جاتا تھا، اور لینا امتحانوں کی تیاری کرتی تھی۔ پریویس میں اٹھاون فی صد نمبر تھے اور اگر اس بار تیاری ٹھیک ہوجائے تو کمی پوری کر کے فرسٹ کلاس لایا جاسکتا تھا۔ اس لیے باقاعدگی سے مہتہ کی موٹر سائیکل دروازے پر پانچ بجے آ کھڑی ہوتی تھی۔ تینوں ساتھ چائے پیتے۔ اس لمحے لینا سب سے زیادہ خوش رہتی۔ ویسے اکثر اس کو یہ شکایت رہتی تھی کہ نہ تو ہم کسی کے یہاں جاتے ہیں، نہ کسی کو چائے پر بلاتے ہیں۔ تب اسے خیال ہوا تھا کہ سچ مچ اس کی جان پہچان کتنے کم لوگوں سے ہے— ایسے لوگوں سے جن کے ساتھ ربط ضبط رکھنے میں لینا کو خوشی ہو— اس لیے وہ اکثر ہی چپ رہتا اور خیال رکھتا کہ کہیں چائے سے سڑسڑ کی آواز نہ ہو، یا وہ دانتوں کے پیچھے زبان لگا کر اپنی پسندیدہ ''چسی! چسی!'' نہ کر بیٹھے۔ کھانے کے بعد ایک دِن وہ نہایت مطمئن انداز سے یوں ہی دانتوں سے زبان لگا کر سانس کھینچ رہا تھا، جس سے آواز ہوتی تھی۔ لینا کھا رہی تھی۔ اچانک بولی، ''فار گاڈز سیک، یہ مت کرو! مجھے الٹی ہوجائے گی۔'' اور تب سے جب بھی وہ ایسی آواز نکالتا کہ لینا کا یہ فقرہ اس کی ''چسی! چسی!'' کو بیچ سے ہی روک دیتا۔ وہ اور مہتہ کپڑوں کی باتیں کرتے، فلموں کی باتیں کرتے، دلی اور بمبئی کے ہوٹلوں کی باتیں کرتے، ڈرائیونگ اور پارٹیوں کے دلچسپ قصے سناتے۔ ''مسز کشور، آپ نے 'رینس آف رانچی پور' دیکھا ہے؟ بھوال سنیاسی والے قصے پر بیس کیا ہے...'' اور وہ فلموں کی کہانیاں سنانے لگتا۔ لینا نہایت محویت سے سنتی رہتی۔ یا کبھی لینا سناتی، ''مجھے کریم کھانے کا شوق ذرا زیادہ ہی تھا، فروٹ کریم، کریم جیلی، آئس کریم... پتا نہیں، ایک دن پاپا کو کیا سوجھا— دس سیر کریم اٹھالائے...''

''دس سیر!'' مہتہ اتھاہ حیرت دکھاتا۔ ''مائی گاش!''

''ہاں ہاں، دس سیر!'' لینا خوشی سے بتاتی۔ ''کہتے تھے، جی بھر کر کھالو۔ ایک بار خوب نیت بھر لو تو نارمل ہوجاؤ گے۔ یہ پاپا کا اصول تھا۔'' یا ''اُن دنوں دو گھوڑوں کی بوسکی، چار گھوڑوں کی بوسکی آتی تھی۔ اور پاپا نے گھر بھر کی چادریں اُسی سلک کی بنوادی تھیں...''

''وہ تو بڑا قیمتی سلک ہوا کرتا تھا!'' مہتہ تعجب سے کہتا۔

''روپے کی تو پاپا نے کبھی فکر ہی نہیں کی۔ مخمل کے پردے، دو دو ہزار غالیچے ہیں اُن کے پاس۔

چے، اُن دنوں کے دو ہزار! اس وقت وہ کشور کی موجودگی بھول جاتی۔ ''فرسٹ کلاس سے نیچے کبھی کیا۔ اور پاپا وہ سگار پیتے ہیں— آپ سوچیے، انگریز کلکٹر کہا کرتے تھے، مسٹر دیکشت، آپ کے ں جو سگار ملتے ہیں وہ ہمیں انگلینڈ میں نصیب نہیں ہیں... گھر کے ہر آدمی پر ایک بیرا تو آج بھی ہے۔ پانچ دس روپوں کا تو حساب ہی نہیں مانگتے...''

''کمال ہے!'' کے انداز سے مہتہ سنتا رہتا۔ وہ خود اچھے خاندان کا تھا اور تنخواہ کے علاوہ سو دو سو گھر سے منگا کر خرچ کر دیتا تھا۔ وہ تو یہاں صرف انتظار کا وقت کاٹ رہا تھا، اصل میں اسے تو آگے پڑھنے کے لیے انگلینڈ جانا تھا۔ صاف ستھرا، اسمارٹ سا نوجوان، ملائم، گھنے، بغیر تیل کے بالوں کا گچھا سامنے جھکا رہتا اور کبھی بو یا کبھی ٹائی میں وہ سچ مچ متاثر کن لگتا تھا۔ اپنے مسے پر انگلی رکھے اکثر کشور اسے دیکھتا۔ شام کو اکثر وہ سفید پینٹ قمیص میں آتا۔ آنگن میں ہی نیٹ لگا کر بیڈمنٹن کورٹ کاڑھ لیا جاتا، اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دونوں کھیلتے۔'' میرے یہاں بے کار پڑا تھا،'' کہہ کر اُس نے بلّے اور شٹل کاک کا پورا ڈبا لا کر رکھ دیا تھا۔ تب پڑھائی ہوتی تھی۔ ایک بار اُس کے آتے ہی لینا نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا، ''انھیں ملتا ہی کیا ہے...''

اور اس سب میں کشور سچ مچ اپنے کو فالتو ہی پاتا تھا۔ نہ اسے کسی نے دس سیر کریم لا کر دی تھی، اور نہ بوسکی کی بیڈشیٹس اس نے دیکھی تھیں— اس کے پاس قمیص کرتے تک سلک کے نہیں رہے پہلے۔ اُسے لگتا، اگر مہتہ لینا کا کلاس فیلو ہوتا تو؟ وہ یہ ساری باتیں سنتا اور دانت پیستا— شیخی... شیخی... یہ طبقہ صرف شیخی پر زندہ رہتا ہے۔ ایک کی بات سن کر انتظار کرتا، دیکھیں اب دوسرا کون سی شیخی اس کے جواب میں کھوج کر لاتا ہے۔ مہتہ کے سدھے ہوئے کھیلنے کا ڈھنگ اور ساڑھی کا پلّو کمر میں کھونس کر بار بار جوڑا کھول کر کستے ہوئے لینا کا مگن انداز سے کھیلنا دیکھتا تو کہیں کسک تیکھی ہو جاتی— کہیں کچھ غلط ہو گیا ہے۔ پھر کتاب اٹھا کر چپ چاپ باہر چل دیتا اور ''آئین اکبری'' کے ترجمے میں پڑھنے کی کوشش کرتا کہ اکبر کے پسندیدہ کھیل کیا کیا تھے۔ اُسے بار بار وہ دن یاد آتے رہتے جب بی اے میں وہ لینا کو ہسٹری کا پیپر تیار کراتا تھا اور لینا محو ہو کر ذرا سے ہونٹ کھول کر اُسے ایک ٹک سنتی رہتی تھی... من ہوتا تھا، بات آدھی چھوڑ کر اُن ہونٹوں کو دھیرے سے چوم لے... کالج کی مونالیزا فتح پور سیکری میں کھڑی نور جہاں بن جاتی۔ مہتہ کے منھ سے بریڈ لے کو بھی تو ٹھیک اُسی طرح سنتی ہوگی۔ اور مہتہ تو کشور سے ہر حالت میں آگے ہے... عورت کا من ایک بار اگر آ سکتا ہے تو... اُس کے پیچھے بھی تو وہ پاگل ہی ہوا تھی۔ کبھی بھول سکتا ہے وہ لینا کے چہرے کے اُس انداز کو، جب مہتہ نے کہا تھا، ''مسز کشور، آپ کی انگریزی تو سچ مچ کمال کی ہے۔ من ہوتا ہے گھنٹوں سنتا رہوں... کچھ بھی کہیے صاحب، کانونٹ کی بات ہی اور ہے! جو اُن اسکولوں میں ایک بار پڑھ

لیتا ہے، زندگی بھر اُس کی چھاپ بنی رہتی ہے...'' اور تب ایک سخت چہرہ، سانولے ہونٹوں میں ایکسپریس سے نکلتا دھواں کشور کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ کشور ڈرتا تھا اور کسی بھی طرح کہنے کی، کر پاتا تھا— ''گیٹ آؤٹ آف مائی ہاؤس، یو اسکاؤنڈرل!''

لینا کا جنم دن تھا۔ وہ بیٹھا بیٹھا کانچ کے گلاس میں بلیڈ گھس رہا تھا۔ لینا نہا دھو کر ساڑھی لپیٹے نکلی تھی۔ گیلے بالوں کو سر پر پاروتی کی طرح باندھ لیا تھا۔ بھیگی ساڑھی کو ڈوری پر پھیلاتی ہوئی بولی، ''ابھی پروفیسر مہتہ پاسپورٹ کے سلسلے میں دلّی گئے تھے۔ کہتے تھے، ایک ڈاکٹر ہے، جو شرطیہ مسّا دور کر دیتا ہے...''

''بیس بار تو دور کرا لیا، یار! لوگ کہتے ہیں، گھوڑے کا بال باندھو، پھر نہیں ہوتا۔ لیکن ہر بار آ جاتا ہے۔ اسی لیے مونچھیں رکھنی پڑتی ہیں...'' وہ افسوس سے بولا۔

''ایک بار دکھا لینے میں کیا حرج ہے؟'' لینا نے پیار سے کہا، ''جب وہ خود جا کر ڈاکٹر سے ملے ہیں، اتنی پریشانی اٹھائی ہے تو ایک بار یہ بھی کر دیکھو... اور پتا ہے، ہمارے لیے جنم دن پر کیا لائے ہیں؟''

''کیا؟'' اُس نے ہاتھ روک کر پرتجسس سوالیہ انداز سے اُدھر دیکھا۔

لینا اندر سے ایک ڈبا اٹھا لائی۔ برانز شیڈ کی راسلک ساڑھی تھی۔ لینا بتا رہی تھی، ''دلّی میں تو آج کل کریز ہے راسلک...''

کشور کی ہمت چھو کر کپڑا دیکھنے کی نہیں پڑ رہی تھی۔ سوکھے گلے سے لفظ ٹھیل کر کہا، ''یہ تو بڑی قیمتی ہوگی۔ سو سوا سو سے کم کیا ہوگا دام...''

''دام تو نہیں بتائے، لیکن ہاں، اس سے کم کیا ہوگی! ایک بلاؤز پیس بھی ہے۔'' شوق اور مسرت سے لینا نے ساڑھی کے نیچے رکھے بلاؤز پیس کو کھینچ لیا۔ ''ہمارے پاس تو سچ، اچھی ساڑھی بھی نہیں رہ گئی کوئی۔ وہی شادی کے وقت کی چار چھ پڑی ہیں۔''

''بس؟'' کشور نے بھولے پن سے پوچھا، ''ساڑھی بلاؤز ہی دیے ہیں؟ اور کپڑے نہیں دیے؟''

لینا جیسی کھڑی تھی ویسی ہی رہ گئی۔ بڑی مشکل سے صرف اتنا ہی پوچھا، ''کیا مطلب؟''

کشور نے کوئی جواب نہیں دیا اور ڈبا ایک طرف کھسکا کر بلیڈ گھسنے لگا۔ تبھی اس کے کندھوں کو چھو کر قریب قریب چوکنی آواز میں لینا نے پوچھا، ''میں پوچھتی ہوں، مطلب بتاؤ!''

جھٹکے سے کشور نے اُدھر منہ گھمایا اور دُگنی اونچی آواز میں پوچھا، ''مارو گی مجھے؟ لو، مارو... نہیں بتاتا مطلب! کر لو جو تمھارا من ہو۔ مجھے بھی باپ کا چپراسی سمجھ لیا ہے جو گھر کیوں میں آ جائے گا؟... اندھا ہوں؟ مجھے دکھائی نہیں دیتا؟... ہنہ، مجھے ملتا ہی کیا ہے...''

لینا کا لہجہ گر گیا۔ وہ نہ چیخی نہ چلائی۔ بہت سخت آواز میں بولی، ''دیکھو کشور، آج سے — بلکہ اسی لمحے سے، ہم لوگ ساتھ نہیں رہیں گے۔ میں بھی سوچ رہی تھی کہ اب تم سے بات کر ہی لی جائے۔ نہ تم اندھے ہو نہ بہرے۔ تم صرف انفیریئرٹی کمپلیکس کے مارے ہوئے ہو۔ اِس لیے تمھیں میری ہر بات وہ نہیں لگتی جو ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے اور اور باتیں نظر آتی ہیں۔ میں سمجھتی تھی کہ مینرز، بات چیت، اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے اور چال ڈھال ایسی چیزیں ہیں جنھیں بہت جلدی بدلا جا سکتا ہے، سیکھا اور بھلایا جا سکتا ہے۔ لیکن اِس کمپلیکس کا تو کوئی علاج ہی نہیں... تمھیں میرے ہنسنے، بولنے، چلنے، سب میں شوخی اور دکھاوا لگتا ہے...''

''ہاں ہاں، میں جاہل ہوں، بے وقوف ہوں!'' جھٹکے سے کشور اٹھا اور پوری طاقت سے کانچ کے گلاس کو زمین پر پٹخ کر بکتا رہا، ''لاٹ صاحب کی بچی کہتی ہیں، ہمیں انفیریئرٹی کمپلیکس ہے!... ہم میں بات چیت، اٹھنے بیٹھنے کے مینرز نہیں ہیں!... ہم کنجوس اور بدزبان ہیں!... بڑے باپ کی بیٹی اور مٹھ بولی تو آپ ہیں! یا تو جو من میں آئے سو کرنے دو یا یہ سب سنو... زندگی تباہ کر کے رکھ دی... بھائی بھابی کے پاس نہیں گئے۔ ماں باپ کی طرح انھوں نے لکھایا پڑھایا اور شادی کے بعد سے انھیں دھیلے کی مدد نہیں کر سکے... اپنے لیے ایک رومال نہیں لیا۔ کچھ بچے تو لیں... دن رات کالج میں محنت کرو، تھیسس کے بہانے ٹیوشن کرنے جاؤ... اور یہاں دل میں بھری ہے کوٹھی بنگلا، نوکر چاکر... باپ کی نوابی!...''

''دیکھو کشور، پاپا کو...''

''بیس بار کہوں گا! روک، تو مجھے روک۔ نقلچی بندر کہیں کے! سالے انگریزوں کی نقل کر کر کے، ان کے جوتے چاٹ چاٹ کر آج صاحب بن گئے ہیں... ہا ہا ہا، صاحب! دس سیر کریم لائے تھے... بوسکی کی چادریں... دو دو ہزار کے غالیچے...''

پتا نہیں کیا کیا بکتا جھکتا وہ باہر چلا گیا اور سارے دن اپنے آپ سے باتیں کرتا سڑکوں پر بھٹکتا رہا۔ دن ڈھلنے کے بعد جب ڈرتا ڈرتا آیا تو دروازے پر تالا تھا اور لینا چلی گئی تھی...

وہ پاسٹ، ماضی، آٹھ سال پہلے کا ہے۔ دوسرا ماضی ہے آٹھ سال کا یہ عرصہ — یعنی اگلے سال اُس کے خود کلکتہ چلے آنے کے بعد بیتا ہوا وقت۔ اس کا ایک شاگرد بہت بڑی جگہ گھر داماد بن کر آیا تھا اور اس نے کشور کو چار سو کا اسٹارٹ دیا تھا... یہ اِس ماضی کا آغاز ہے۔

''سارا کھیل روپے کا ہے، اور اب روپیہ کمانا ہے،'' اُس نے طے کیا اور بھوت کی طرح روپے کے پیچھے لگ گیا۔ بھول گیا، کہیں کوئی لینا ہے، کہیں کوئی دیکشت صاحب ہیں اور کہیں کوئی ماضی ہے۔ ایک

نوکری پر پاؤں ٹکا کر دوسری کا سودا ہوتا رہا... پہلا تلا... دوسرا تلا اور ایک دن لفٹ اسے دسویں تلے کے اس چیمبر میں لے آئی جس کے دروازے پر لکھا تھا، ''جنرل منیجر...''

مگر نہیں، رابطہ چاہے لینا اور دیکشت صاحب سے نہ رہا ہو، اور اُس نے دو سال پتا نہ لگایا ہو کہ لینا کہاں ہے — بھولا وہ دونوں میں سے ایک کو بھی نہیں تھا۔ آج تو اسے لگتا ہے، لینا نام کا ایک پردہ تھا جس کے ہٹتے ہی اس نے اپنے آپ کو دیکشت صاحب کے روبرو کھڑے پایا۔ پردہ کہنا بھی غلط ہوگا؛ وہ صرف میز کا تختہ تھی اور اس پر کہنیاں ٹکا کر وہ اور دیکشت صاحب پنجہ لڑا رہے تھے — اپنی اپنی طاقت آزما رہے تھے۔ جس دن اس نے جانا کہ لینا نے لیکچرشپ لے لی ہے، اُس دن اسے سچ مچ بہت اطمینان ہوا۔ ''چسی! چسی!'' کی شمولیت کے ساتھ اس نے محسوس کیا کہ جرم کا بوجھ اس کی چھاتی سے دور ہوگیا ہے۔ دوسرے طریقوں سے اس نے یہ پیغام بھی بھجوادیا کہ لینا چاہے تو کسی کے ساتھ — چاہے تو مہتہ کے ساتھ ہی — سیٹل ہوجائے، اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ چاہے گی تو قانوناً بھی بالکل سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ اسے لینا سے کوئی شکایت، کوئی نفرت نہیں ہے۔ بعد میں سنا، مہتہ انگلینڈ سے ہی کسی کو لے آیا ہے...

بہرحال، اس یقین کے ساتھ ہی اسے لگا کہ وہ لینا کو بھول سکنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ سبھی سے غلط فیصلے ہوجاتے ہیں — پورے ہوش حواس میں، سارا آگا پیچھا سوچنے کے باوجود۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے لائق نہیں تھے۔ یوں اکثر ہی اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے لینا کے ساتھ والے دنوں کی تصویریں دماغ میں کوندتی تھیں — اور آج یہ آنک سکنا اس کے لیے ناممکن ہوگیا ہے کہ کتنے واقعات اور باتیں حقیقت میں ہوئی تھیں اور کتنی اس کی اپنے تصور کی اُپج ہیں۔ ان کی اصلیت میں اسے خود ہی یقین نہیں ہے اور اس نے یہ تو مان ہی لیا ہے کہ اُن دنوں جس غیر معمولی ذہنی تناؤ اور دباؤ سے وہ گذر رہا تھا، اس کے رہتے ہوئے باتوں کو صحیح تناظر میں لے سکنا سچ مچ اس کے لیے ناممکن تھا۔ ساتھ ہی وہ اس بات کو بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ لینا مرجائے گی، خودکشی کرلے گی، لیکن نہ تو کسی کے ساتھ سیٹل ہوگی نہ اس کے سامنے جھکے گی... جھکنا پچھتانا، سمجھوتا کرنا اس کے خون میں ہی نہیں ہے۔ ایک تو وہ خود اتنی مستقل مزاج، اور پھر اس کے افسری تکبہ کے قاعدے، جو آدمی کو توڑ دیتے ہیں، بکھرا کر چور چور کردیتے ہیں، لیکن جھکنے نہیں دیتے... اس کی رگ رگ میں سگریٹوں سے کالے پڑے ہونٹ اور بائی فوکل چشمے سے جھانکتی کالی خرانٹ آنکھیں تیرتی ہیں —

کسی نے بتایا تھا کہ دیکشت صاحب ہارٹ فیل ہوجانے سے چل بسے ہیں۔ نہ اسے افسوس ہوا نہ خوشی۔ وہ رہیں نہ رہیں — اس کی دنیا میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں، وہ توقع ضرور کہیں من میں اُن دنوں کرتا رہا کہ ان کی موت کی اطلاع تو کم سے کم اسے ملے گی ہی۔ لیکن کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ ''اسٹیٹس

ن'' کے پرسنل کالم نے ان کے نہ رہنے کی اطلاع کو ضرور پکا کر دیا۔ لینا نے مسوری میں ہیک مین کے
امنے چلتے ہوئے کہا تھا (اسے ابھی بھی وہ جگہ یاد ہے)، ''ہماری اپنی خودمختار زندگی ہے۔ پاپا اُس میں
لہاں آتے ہیں!'' لیکن وہ ایک جھوٹ تھا— بہت بڑا اور تکلیف دہ جھوٹ— کیوں کہ جس دن انھوں
نے لینا کو اسٹیشن پر وِداع کیا تھا، پانچ ہزار کے چیک کے ساتھ بند لفافے میں بیٹھ کر وہ خود کشور کی زندگی
ں بھی گھس آئے تھے، اور اَن چاہے مہمان کی طرح اس کے وجود پر حاوی ہو گئے تھے— جن سے سات
نم میں وہ جانے کو نہیں کہہ سکتا تھا اور جن کی موجودگی اُس کی نس نس کو تڑکائے دے رہی تھی...

ہاں، جس دن لینا نام کا پردہ بیچ سے ہٹا، یا اُس نے جانا کہ لینا صرف میز کا تختہ تھی اور وہ دونوں
ں پر اپنی کہنیاں ٹکائے طاقت آزما رہے تھے، اُسی دِن محسوس کیا کہ اس کی اصلی لڑائی دیکشت صاحب سے
ہے...

وہ منیجر ہوا تو پہلی بات اس کے من میں ابھری: دیکشت صاحب اب تو کمشنر ہو کر ریٹائر ہو گئے
ں گے۔ انکم ٹیکس کے معاملوں میں تو ان کا کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ سرکاری آدمی رہے ہیں۔ بیس
ملقات ہوں گے اور ساری اندرونی باتیں انھیں پتا ہوں گی— سیٹھ سے کہہ کر کیوں نہ انھیں یہاں بلوالیا
ئے۔ اس کے نیچے کام کریں گے اور چیمبر میں آنے سے پہلے کھٹ کھٹ کر کے کہا کریں گے، ''مے آئی کم
ن، سر؟'' وہ بیٹھا بیٹھا اُن کی فائل کے کاغذوں پر دستخط کرتا رہے گا اور وہ ادب سے ایک طرف کھڑے
ہیں گے۔ وہ بھاری آواز میں کہے گا، ''مسٹر دیکشت، آپ نے وہ جیوپیٹر پلائی وڈ کا اینول اسٹیمنٹ تیار
یں کرایا؟ اسے پرسوں جانا ہے۔ اس کی ہی وجہ سے نئے پرمٹ بہت ڈیلے ہو رہے ہیں...'' اور تصور میں
ز کے پاس کھڑے دیکشت صاحب سے یہ سب کہہ کر اسے روحانی تسکین ہوئی۔ تبھی فکر ہوئی— ان کے
امنے وہ یہ سب کچھ کہہ پائے گا؟ اس وقت نہ اس کا لہجہ ہکلائے گا، نہ زبان لڑکھڑائے گی؟ ناممکن! وہ باز
ہی تیز نگاہیں، وہ سپاٹ بے تاثر چہرہ— اس سب کا سامنا وہ کبھی بھی نہیں کر پائے گا... یہاں آ کر وہ
دگی بھر کوئی کام نہ کریں، وہ ان کے سامنے کبھی زبان نہیں کھول سکے گا۔ چوتھی پانچویں کلاس میں جن
یئن صاحب سے اُس نے کین کھائی ہیں، انھیں آج بھی چاہے سوا سو روپے ہی ملتے ہوں، ان کے
امنے اس کی آنکھیں نہیں اٹھ سکتیں۔ وہ خوف اب اس کی فطرت بن گیا ہے۔

اسے یاد ہے: چپکے سے پیچھے والے برآمدے کے پاس والی کھڑکی کے نیچے وہ سائیکل کھڑی کرتا
بغیر جوتوں کی آواز کیے لینا کو پڑھانے چلا جاتا۔ باہر نکلتا، تب تک دیکشت صاحب آ گئے ہوتے— یا تو
والے کمرے میں چائے پی رہے ہوتے یا باہر السیشین کتے کو لیے لان میں چہل قدمی کر رہے ہوتے،
کو طرح طرح احکامات دے رہے ہوتے۔ چور کی طرح وہ برآمدہ اترتا— کہیں نگاہ نہ پڑ جائے، اسے

بلا نہ لیں! سائیکل لے کر ایسا ہڑ بڑاتا ہوا نکلتا جیسے وہ بھی پیچھے پیچھے آ رہے ہوں۔ باہر سڑک پر آ کر کھلی سانس لیتا اور سر اِس طرح جھٹکتا جیسے پانی کی دم گھونٹ سطح کے نیچے دبا جا رہا ہو... وہ دیکھ لیتے تو بلا بھی لیتے، ''کشور بیٹے، کیسے ہو؟ لو چائے پی لو...'' ان کے سامنے رہنا کتنا تکلیف دہ تجربہ تھا! وہ بہت ہی کم بولتے تھے، سگار کو ہونٹوں میں گھما کر پپولتے ہوئے کچھ سوچتے رہتے، بار بار ماچس جلاتے رہتے— لیکن وہ دو لمحے اس کے لیے ہزار امتحانوں میں بیٹھنے سے زیادہ ناقابل برداشت ہوا اٹھتے۔ ''جی، ٹھیک ہوں!'' کہنے میں اسے چکر آ جاتا، ہکلاہٹ بڑھ جاتی اور پنڈلیوں تک پسینہ تیر آتا۔

دیکشت صاحب نے کبھی اُس سے کچھ نہیں کہا۔ آج لگتا ہے، کچھ نہ کہنا ان کا بہت ریزرو رہنا نہیں، اسے بات کرنے کے لائق نہ سمجھنا تھا۔ ان کا افسری دبدبہ، باہر کا رعب اور گھر کا— لینا تک کا— خوف، کچھ اس طرح اس کے شعور پر چھا گیا تھا کہ وہ مجبور ہوا اٹھتا تھا۔

دوسروں کے ہاتھوں سونپا گیا خوف لوگوں کے لیے کتنا اذیت رساں اور مہلک ہو سکتا ہے، یہ بات منطق سے چاہے سمجھ میں نہ آتی ہو، لیکن خود کشور جانتا ہے؛ اس کی ساری قوت ان آٹھ برسوں میں صرف اُسی خوف سے لڑنے میں لگی رہی ہے... نوکریاں بدلنا، دنیا کی نظر میں کامیاب ہوتے چلے جانا تو صرف اُس خوف کے سامنے بار بار شکست خوردہ ہو کر نئے نئے ہتھیاروں سے لڑنے جیسا رہا ہے... ایسپ کی کہانی کے مینڈک کی طرح وہ گویا ان ایک سے ایک اونچی جگہوں پر کھڑے ہو ہو کر ہر بار اپنے آپ سے سوال کرتا؛ کیا بیل اِتنا بڑا تھا؟ کیا ابھی بھی وہ دیکشت صاحب سے ڈرتا ہے؟ کیا ابھی بھی وہ ان سے چھوٹا ہے تبھی خیال آتا کہ وہ تو جانے کب کے گذر چکے ہیں...

بڑی بڑی پارٹیوں میں وہ آرام سے چھری کانٹوں کا استعمال کرتا، قیمتی شرابیں پیتا، کوئی پُر مذاق بات کہتا، یا ریستورانوں میں پانچ پانچ دس دس روپوں کی ٹپ چھوڑتا، بیروں، چپراسیوں کے سلام لیتا، کہیں بائی فوکل چشمے سے جھانکتی دو آنکھیں— آنکھیں نہیں، آنکھوں کا بے شکل احساس ہوتا اور انھیں للکار دے کر دکھاتا رہتا۔ ''تم نے کبھی پندرہ روپوں کی ٹپ چھوڑی ہے؟'' من کی گہرائی میں اسے لگتا تھا نہیں تھا کہ وہ نہیں ہیں، اور ایسے موقعوں پر وہ ٹھیک وہی انداز اختیار کرنے کی کوشش کرتا جو اس کے حساب سے دیکشت صاحب ایسے موقعوں پر اختیار کر سکتے تھے— وہی خود آگاہ لاپروائی۔ حجامت بناتے وقت گھنٹوں وہ اپنے چہرے کو الگ الگ کونوں سے دیکھتا، کدھر سے وہ دیکشت صاحب جیسا رعب دار لگتا ہے اُس نے چہرہ زیادہ رعب دار کرنے کے لیے موٹے فریم کا چشمہ بھی لے لیا تھا، جسے وہ جھٹکے سے اتارتا لگاتا تھا۔

ہال اینڈرسن سے ہزار روپے کا نیا سوٹ بن کر آیا تو پہننے سے پہلے اس نے دل ہی دل میں کہا،''

نے دیکھا بھی ہے ایسا سوٹ؟'' پہنا تو منھ سے نکلا، ''آنکھیں پھٹی رہ جائیں گی!'' لق دق وردی میں جب ڈرائیور ادب سے لپک کر کار کا دروازہ کھولتا تو وہ کسی سے بلا آواز کہتا، ''ابھی تک اُسی بل مین کو دھکیلتے ہو گے!'' کسی ملازم کی غلطی پر اُسے معاف کرنے کو من ہوتا تبھی دھیان آتا، ''وہ اس وقت کیا رویہ دکھاتے؟'' اور تبھی بھاری سخت آواز اُس کے گلے سے نکلتی، ''نو نو، مسٹر سین! میں پوچھتا ہوں، ایسا ہوا ہی کیوں؟ آپ جانتے ہیں، میں غلطی کسی بھی حالت میں برداشت نہیں کرسکتا...'' اسے لگتا کہیں اِس بات کو ''وہ'' بھی سن رہا ہے، اور آواز کی سختی بڑھ جاتی۔ کسی بہت ضروری کام سے کوئی چھٹی مانگتا تو اپلیکیشن منظور کرتے کرتے اُسے سگریٹ والے ہونٹوں کا خیال ہوآتا اور ہاتھ رک جاتا۔

شروع سے ہی ایک عجیب مخاصمانہ نفرت بھر گئی تھی اسے نوکری چاہنے والوں کے خلاف۔ ایسی درخواستیں وہ بغیر پڑھے پھاڑ دیتا اور کوئی سامنے ہی پڑ جائے تو بے مروتی سے کہہ دیتا، ''بھوکے مر رہے ہو تو یہاں کیا کرنے کو رکے ہو؟ اپنے گھر کیوں نہیں جاتے؟ کوئی ضروری ہے کہ کلکتہ رہ کر نوکری ہی کرو؟ کلکٹر کے داماد ہو جو تھوڑے میں کام نہیں چلتا؟ میں نے کہا نا، یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ نہیں سنا؟'' اور بات پوری ہونے سے پہلے ہی باہر کھڑے بیرے کے سر پر گھنٹی گھن گھنا اٹھتی۔ ''وہ'' ہوتا تو ٹھیک یہی سلوک کرتا— میں تو چپ ہوں، اس نے تو اتنی دیر میں دھکّے دے کر نکلوا دیا ہوتا۔ اسے فرصت تھی اتنی سب بکواس سننے کی؟ انٹرویو میں جان بوجھ کر آڑے ٹیڑھے سوال پوچھ کر امیدوار کو نروس کر دینے میں اسے ظالمانہ سکون ملتا۔ ایسے لوگوں کو تو برداشت کرسکنا ہی اس کے لیے مشکل تھا جو ہکلاتے ہیں، بات ٹھیک سے نہیں کر پاتے، پسینے پسینے ہوجاتے ہیں، مسلے ہوے، بغیر اِستری کے، سستے سے کپڑے پہن کر آتے ہیں، اور وائکاونٹ کو وِسکاؤنٹ بولتے ہیں۔ وہاں اسے برسوں پہلے کا کشور دکھائی دیتا ہے۔ اور اب وہ اُسے بالکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ ایسے کشوروں کو دھرتی پر رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ایسی آزمائش میں ہرنا کام امیدوار اسے فضول فالتو، کوڑے کی طرح لگتا تھا۔

سگریٹ پیتے پیتے اچانک اسے خیال آتا— اکثر ''وہ'' جب بہت متفکر ہوتا تو آدھی پی ہوئی سگریٹ کو ہی ایش ٹرے میں ڈال دیتا تھا۔ جھٹ اس کا ہاتھ دوکش پی ہوئی سگریٹ کو ایش ٹرے میں مروڑ دیتا۔ دھندلا سا خیال آتا، یہ بارہ پیسے کبھی بہت قیمتی تھے۔ کبھی کسی جگہ دو چار سو روپے کی بات آتی اور اسے دھیان آتا کہ ''اُسے'' روپے کی فکر ہی نہیں تھی، تو وہ جھٹکے سے روپے لکھ کر دستخط کر دیتا۔ وہ ''اس'' سے کس بات میں کم ہے؟ اکثر جب وہ کھڑے ہوکر باتیں کرتا تو سگریٹ کا ٹن ٹھیک اُسی طرح اس کے ہاتھوں میں کھیلتا جیسے لینا کو وداع کرتے وقت ''اسے'' کرتے دیکھا تھا۔ اسٹیٹ ایکسپریس کے سوا کوئی سگریٹ زبان پر چڑھتی ہی نہیں تھی۔ جب اس نے پہلے پہل کندھے اچکا کر انکار کرنا سیکھا تھا تو اکثر اسے دو باتیں ساتھ

یاد آتی تھیں — جس فلم میں ایک آدمی کو اس نے اِس طرح کندھے اچکا کر انکار کرتے دیکھا تھا اس کی کیسی خوب صورت نقل کی ہے، دوسری یہ کہ ''تم'' تو ابھی بھی سر ہلا کر انکار کرتے ہوگے — سولھویں صدی کا طریقہ! قیمتی ریشم کا ڈریسنگ گاؤن پہن کر، سگار ہونٹوں میں گھما گھما کر پپولتے ہوے، جب وہ سوچ میں گم بالکنی میں کھڑا ہوتا تو کئی لمحے اسے شک ہو جاتا، جیسے ''وہ'' خود دروازے پر ہی ٹھٹکا کھڑا ہے، یا ڈرائنگ روم میں انتظار کر رہا ہے اور یہ گھومنے والا شخص خود وہ نہیں — لگتا، کیسے خود اعتمادی اور رعب سے وہ چہل قدمی کر رہا ہے، جیسے ارسٹوکریسی اُس کے خون کی بوند بوند میں گھل گئی ہے۔ ایسی شان سے بھلا ''وہ'' کیا کھا کر گھومے گا! کبھی کسی کمزور لمحے میں اپنے آپ سے ایک سوال کرتا — اسے دیکشت کا بھوت تو نہیں آتا؟... شاید اسے ہی ''بھوت آنا'' کہتے ہیں! پھر اپنے کو جھٹک دیتا: کیا بھوت ووت...

''تمھارے باپ نے بھی کبھی یہ جہاز دیکھا ہے؟'' بوئنگ پلین میں قدم رکھتے ہی پہلا فقرہ من میں آیا۔ کسی دکان کے سامنے سے گذرتے ہوے کبھی کسی چیز کو خریدنے کی ضرورت محسوس ہوتی، دو ایک قدم اُدھر بڑھتا بھی، تبھی دھیان آتا: ''وہ'' اِس دکان میں قدم رکھنا اپنی بے عزتی سمجھتا۔ اور وہ الٹے پاؤں لوٹ آتا۔ ڈرائیور کو نوٹ دے کر بھیجتا۔ کسی بھی شخص کو دیکھ کر پہلا سوال من میں اٹھتا، جسے وہ کسی نہ کسی طرح سے پوچھ ہی لیتا۔ اِسے کتنا ملتا ہوگا؟ وہ آدمی کی قیمت اُس کو ملنے والے پیسے سے لگاتا۔ زیادہ پیسے ملنے والے کے ساتھ اپنے لاپروا برتاؤ کا اسے سچ مچ افسوس ہوتا۔

سنیماؤں میں، میگزینوں میں، آس پاس کی دنیا میں، وہ دھیان سے دیکھتا سنتا کہ اُسی پوسٹ اور پوزیشن والے لوگ کیسے بولتے ہیں، کس وقت اُن کے چہرے پر کیا انداز رہتا ہے، کیسے کھڑے ہوتے ہیں اور کام اور آرام کے وقت اُن کے کیا کیا پوز رہتے ہیں۔ اور جب انھیں ماہرانہ سادگی سے نقل کر لیتا تو سناتا، ''سنا صاحب بہادر، یہ نئے افسروں کے اٹھنے بیٹھنے، بولنے چالنے کے ڈھنگ ہیں! تم سولھویں صدی کے انگریزوں کی نقل کر کے اپنے کو بڑا ماڈرن لگاتے ہو!''... نیچے والے کہتے، ''باس بڑا سخت ہے!'' تو من میں کوئی کہہ اٹھتا، ''دیکھا، اسے کہتے ہیں افسری! اُس گاؤں میں تم راجا بنے بیٹھے ہو۔ یہاں آؤ تو آٹے دال کا بھاؤ پتا چلے!'' پھر اطمینان سے اس کا چہرہ کھل اٹھتا، ''دی رسپیکٹ آئی کمانڈ وازیٹ این ان رئیلائزڈ ڈریم فار یو...'' (میرا جو رُعب ہے، وہ تمھیں سپنے میں بھی نصیب نہیں تھا۔)

جب کبھی وہ گھبرا جاتا، یا پریشانیوں سے بے چین ہو اٹھتا اور اس کے گھٹنے جواب دے جاتے، تب وہ ''اس'' کے اس سپریم کانفیڈنس کا دھیان کرتا، اور سچ مچ ہی من میں ایک جوش اور قوت بھر اٹھتی۔ تصور میں کبھی اطمینان بخش سکھ کا حیران کن لمحہ بھی آتا — کیسی عجیب بات ہے! میں ''اسی'' کے ہتھیاروں سے اُس سے لڑ رہا ہوں، کامیابی کے ساتھ لڑ رہا ہوں...

اِس طرح ایک ان کہی جنگ تھی جو ہر پل، وجود کے ریشے ریشے میں چل رہی تھی، اور اس کی موجودگی ہی اس کی زندگی کی قوت کا مترادف بن گئی تھی، جو گھوڑے پر چڑھے بے مثال سوار کی طرح ایڑ مارتی تھی، کونچتی تھی۔ اور یہ سب اس کے لیے سانس لینے جیسا فطری ہوا تھا...

لیک سے اٹھ کر کشور گاڑی پاس آیا تو اس کا سر گھوم رہا تھا۔ بے دِلی سے دروازے کے ہینڈل والی چابی کا سوراخ ٹٹولتا رہا۔ پھر انجن اسٹارٹ کر کے دیر تک یوں ہی بیٹھا باہر دیکھتا رہا۔ نہایت غیر جانبدار، بے پروا، اونچائی پر کھڑے ہو کر نیچے گھاٹی میں پڑے گھائل، پست سپاہی کو دیکھ کر من میں ہمدردی اُمنڈ آئی تھی۔ اس کی آنکھیں پھر سجل ہو آئیں۔ دو بے قابو طاقتوں کے بیچ لینا — ایک لاتعلق لڑکی لینا — پس گئی!

''کیا ہم ماضی کو بھلا نہیں سکتے؟'' کشور کو لگا یہ لینا نے معافی نہیں مانگی، پہلی بار دیکشت صاحب کے حقیقت میں مرجانے کی خبر دی ہے۔ تو سچ ہی طاقت آزماتا دوسرا ہاتھ لینا کا نہیں تھا؟ لینا تو صرف میز کا ایک تختہ تھی۔ وہ دوسرا ہاتھ ''اس'' کا تھا... بے چارہ! اسے پہلی بار لگا — مہارانا پرتاپ کے ٹوٹ جانے کی خبر سے اکبر کو کیسا لگا ہوگا؟ ایک بہادر حریف کی شکست پر کیسا لگتا ہے؟...

فلیٹ پر آ کر اس نے سب سے پہلے رامن کو فون کیا۔ ''رامن، صبح برٹن کو فون کرنا ہے دلّی... میں شاید نہیں جا پاؤں گا۔ طبیعت اچھی نہیں ہے... پھر باتیں تو ساری آخری شکل میں بڑے بابو کو ہی طے کرنی ہیں — میں صبح ان سے بات کر لوں گا۔''

پھر گویا اپنے کو جیسے تیسے اُٹھا کر اُس نے پلنگ پر ڈال دیا۔ پھیپھڑوں میں گہری سانس لے کر دِھیرے دِھیرے چھوڑا تو محسوس ہوا وہ بہت، بہت تھک گیا ہے۔ تیس پینتیس کی عمر تک آدمی میں جوش ہوتا ہے اور ہر نئی جگہ اسے للکار کر بلاتی ہے۔ چالیس بیالیس تک تکان طاقت کو چوس ڈالتی ہے۔ ایسے ڈھیلے تن اور من سے اب زندگی کا ڈھرا بدلنا، نئے سرے سے نئی ذمے داریوں کو اوڑھنا... اور پھر آخر اسے اب ضرورت بھی کیا ہے؟ ''وہ'' اب رہ ہی کہاں گیا جو...

وجے موہن سنگھ

ہندی سے ترجمہ: یعقوب خاور

شیر پور ۱۵ میل

شیر پور ۱۵ میل — بائیں طرف کے آدھے ٹوٹے اور آگے کی طرف لٹکے پتھر پر لکھا تھا۔ دھول سے اٹی اس سڑک پر دو لڑھیاں (چھوٹی بیل گاڑیاں) ایک ساتھ چل سکتی تھیں۔ بیچ میں اپنے آپ ایک تقسیم کرنے والی پگڈنڈی بن گئی تھی۔ برسات کی اُمس بھر صبح تھی، پچھلے کئی دنوں سے بارش نہیں ہوئی ہوگی۔ ہوا نادارد تھی اور دونوں طرف پیڑوں کی پتیوں پر دھول جمی تھی۔ پیڑ سب جامن کے تھے۔ سڑک کے متوازی دونوں طرف بینگنی کالے جامنوں کی قطار بھی چل رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی خوب پکا، رس بھرا جامن ٹپک پڑتا تو راہی جھک کر منھ میں ڈال لیتے تھے۔ وہ بہت دیر سے انھیں دیکھ رہا تھا۔ رات کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ ٹرین کی تھکان اور نہ نہانے دھونے کا باسی پن، پھر بھی بیچ میں اس نے لڑھیا رکوائی اور نوکر سے کچھ جامن بین لانے کو کہا۔ نوکر لچھمن بھی شاید یہی چاہتا تھا۔ وہ کود کر گیا اور ڈھیر سے اچھے اچھے بھونروں کی طرح چمکتے جامن گمچھے میں بین لایا۔ لچھمن کے ناٹے بدن پر کارتوسوں کی پیٹی جانگھوں تک لٹک رہی تھی۔ بارہ بور کی ڈیسکس بیرل دونالی، لڑھیا میں بے جان پڑی تھی۔ بدذائقہ اور بے کار جامن سے زبان اور بدذائقہ ہو گئی، اس پر جامن کی بینگنی گندلی پرت بھی جم گئی ہوگی۔ گلے میں بھی کچھ اٹکنے سا لگا تھا۔ جامن کھانے کے بے ہودہ لالچ پر اسے کوفت ہوئی۔ لڑھیا سست رفتار سے چل رہی تھی۔ جتنی کم زور، دوغلی اور چھوٹی وہ تھی، اتنی ہی ناٹی اس میں جتے دو بیلوں کی جوڑی بھی۔ چوں کہ اس سے تیز وہ چل نہیں سکتی تھی، اس لیے اس پر اندر ہی اندر چڑنا بھی بے کار تھا۔ وہ شیر پور ۱۵ میل کے ۱۴ میل ہونے کا انتظار کرتا ہوا بیٹھا رہا۔ اس نہایت پریشان کرنے والی اُمس میں جھپکی لینے یا اونگھنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ بے حد تھکا دینے والا سفر تھا۔

شیر پور کے 'نواب صاحب' کے 'گیسٹ ہاؤس' میں انھیں ٹھہرایا گیا۔ گیسٹ ہاؤس کی پلنتھ، یعنی

چبوترا کافی اونچا تھا۔ مٹی کی چار دیواری کے بیچ بنی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھ کر ہی وہاں پہنچا جاسکتا تھا۔ چونے، مٹی اور گارے سے بنے دو تین کمرے، ایک کھپریل کا برآمدہ، مٹی کا آنگن۔ آنگن کے بیچوں بیچ ڈول والا کنواں، ایک کونے میں رسوئی گھر اور دوسرے کونے میں پیخانہ، یعنی ایک چھوٹے کمرے کے اندر بنے چبوترے کے بیچ ایک گڑھا، جس کے نیچے لوہے کی بالٹی۔ نہانے کی سہولت یا تو کنویں کے جگت پر تھی یا برآمدے میں۔ کنویں کا پانی خوب ٹھنڈا تھا اور برآمدے کے ایک کونے میں بیٹھ کر نہانے کے بعد بڑی راحت محسوس ہوئی۔ مونج کی چارپائی پر پچھمن نے بستر بچھادیا اور پنکھا جھلنے لگا۔ تبھی باہر کی کنڈی کھڑکی۔ ایک سانولا نوجوان پٹھانی شلوار قمیص میں پسینے سے تربتر آیا اور آداب کر کے ادب سے کھڑا ہوگیا۔ ''نواب صاحب لکھنؤ گئے ہیں۔ کل آئیں گے۔ پہلے خبر نہیں تھی، اسی لیے گستاخی ہوگئی۔ بیگم صاحبہ نے کہلایا ہے، اس کا خیال نہ کریں۔ جس چیز کی ضرورت ہو، بے جھجک کہلا دیں۔ جو بھی بن سکے گا کیا جائے گا۔ فی الحال انھوں نے یہ ناچیز ساتحفہ بھیجا ہے۔'' وہ زری سے کڑھا ہوا ایک بٹوا تھا جس کے منھ پر دو ریشمی ڈوریاں لگی تھیں۔ اس میں مہین نفاست سے کٹے ہوئے سپاری کے چھلے، الائچیاں، لونگ اور سونف تھی، زعفرانی خوشبو میں بسی ہوئی۔ اس نے عزت کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے بٹوا لے لیا۔ ''بیگم صاحبہ سے کہیے کہ میں اس کے لیے ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔ مجھے کسی بات کی تکلیف نہیں ہے۔ پھر نواب صاحب تو کل آ ہی جائیں گے۔'' وہ نوجوان ظاہراً طور پر نواب صاحب کا خاص آدمی رہا ہوگا۔ دھیرے دھیرے وہ کافی سہج ہو کر کھلنے لگا اور شیر پور، نواب صاحب کے خاندان وغیرہ کے بارے میں کافی معلومات اس نے دیں۔ یہ بھی پوچھا کہ اگر گوشت کھاتے ہوں تو شام کو کس چیز کا گوشت کھانا پسند کریں گے۔ مرغے اور بکرے بہتات سے ہیں۔ کالے تیتر بھی اِدھر آس پاس ہی ملتے ہیں، حالانکہ ان کا شکار کرنا تھوڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے مزہ بھی بہت آتا ہے۔ وہ بے حد چالاک ہوتے ہیں اور خوب تھکاتے ہیں۔ وہ زیادہ اڑ نہیں سکتے پر کنٹیلی جھاڑیوں کے پیچھے چھپتے چھپاتے وہ آپ کو اتنا پست کر دیتے ہیں کہ اکثر آپ ہلکان ہو کر واپس آ جاتے ہیں یا پھر اتنا اندھیرا ہو جاتا ہے کہ اس میں آپ کالے تیتر کا شکار کر ہی نہیں سکتے۔ اچانک باتونی ہو گیا وہ سانولا نوجوان اسے کافی دلچسپ لگا اور کالے تیتر کے بارے میں بھی اس میں اشتیاق پیدا ہوگیا۔ ''ایسا کرو کہ شام کو چار بجے، یا جب بھی مناسب سمجھو، آجاؤ۔ کالے تیتر کے شکار پر ہم بھی چلنا چاہیں گے۔''

اس کے جانے کے بعد جھپکی سی آ گئی۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ نہانے کے بعد کی ٹھنڈک دھیرے دھیرے اُمس کی سیلن میں گم ہوتی جارہی تھی۔

وہ کچھ ہی دیر سویا ہوگا کہ کنڈی پھر کھڑکی۔ کئی رکابیاں لیے دو تین لوگ کھڑے تھے۔ رکابیاں مہین، مہنگی، لیکن خستہ حال رومالوں سے ڈھکی تھیں۔ وہاں کچھ رنگ ڈلے اسٹول تھے۔ وہ انھیں پر رکھ دی

گئیں۔ صراحی میں پانی اور دو چینی کے گلاس۔ ان کے جانے کے بعد لچھمن نے رکابیوں سے رومال ہٹا دیے۔ رکابیوں کے اندر بنی کٹوریوں میں چاول، رومالی روٹیاں، گوشت، لوکی اور چنے کا ملا جلا سالن تھا۔ کھانا کچھ دور سے لایا گیا ہوگا اس لیے تھوڑا ٹھنڈا ہو چلا تھا، پر گوشت واقعی لذیذ تھا۔ اس کی بوٹیاں بڑی اور ہڈیوں والی تھیں جنھیں اطمینان سے چوسا جا سکتا تھا۔ دور دراز کی اس جگہ میں اس نفاست بھری مہمان نوازی کے مزے مل رہے تھے۔

کھانے کے بعد وہ پھر سو گیا۔ خوب گہری نیند رہی ہوگی کیوں کہ اٹھنے کے بعد کچھ دیر پتا بھی نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے۔ ایک آنگن، ایک برآمدہ، ایک کنواں اور مٹی کی اونچی چار دیواری۔ لچھمن بھی وہیں زمین پر سو رہا تھا۔ اس نے خود کو ذرا غیر محفوظ محسوس کیا۔ لگ بھگ ہزار کلومیٹر دور! سب سے نزدیک کا ریلوے اسٹیشن بھی ۱۵ میل۔

پٹھان نوجوان چار بجے کے بعد آیا۔ وہ تیار تھا۔ کالی چمکیلی نال والی بارہ بور کی بندوق کو وہ بیچ سے پکڑ کر زمین کی طرف جھکائے چل رہا تھا۔ اس میں چھ نمبر کے چھرے بھرے تھے جو شاید تیتر کے شکار کے لیے کافی تھے۔ ایک بار غلطی سے اس نے ہریلوں کی ڈار پر ایل جی سے فائر کر دیا تھا۔ زمین پر ان کے پنکھ اور جگہ جگہ چپکے گوشت کے ٹکڑے ملے تھے۔

وہ شیر پور کی گلیوں سے گذر رہے تھے۔ گلیوں میں آدمی اکا دکا ہی تھے، عورتیں بالکل نہیں۔ اتنا سونا اور ویران گاؤں اس نے شاید ہی دیکھا ہو۔ دھول اور مٹی محض گھروں اور گلیوں ہی میں نہیں تھی، سست رفتار چلنے والے آدمیوں میں بھی شامل تھی۔ گاؤں کے باہر جھاڑ جھنکاڑ کا ایک لگ بھگ لا متناہی سلسلہ تھا۔ کنٹیلی جھڑ بیریاں اور ببول۔ انھیں کے بیچ سے گذرنا تھا۔ پٹھان نوجوان نے کہا کہ انھیں جھک کر اور لگ بھگ بے آواز چلنا چاہیے۔ کالے تیتر اب کبھی بھی دِکھ سکتے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک کالا تیتر سچ مچ دِکھ گیا۔ چھوٹے چھوٹے پنجے اٹھاتا وہ جھاڑیوں کے بیچ چل رہا تھا۔ اس نے نشانہ لیا۔ اچانک وہ پھر سے اڑا اور جھاڑیوں کے اوپر سے ہوتا ہوا اوجھل ہو گیا۔ پٹھان نوجوان نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ اس نے بندوق جھکالی اور جھاڑیوں کے بیچ جدھر بھی راہ ملی، وہ چلنے لگے۔ اس بار تین کالے تیتر ایک ساتھ دکھے۔ وہ کافی فاصلے پر جھاڑیوں کے بیچ کی کھلی جگہ میں گھوم رہے تھے۔ وہ دبک کر پنجوں کے بل بیٹھ گیا اور گھٹنوں پر کہنی رکھ کر نشانہ لینے لگا۔ لیکن جیسے ہی اس نے بائیں آنکھ میچی، تینوں تیتر غائب۔ عجیب کرشمہ تھا یہ۔ پٹھان نوجوان اس بار کھل کر مسکرایا۔ ایسا کئی بار ہوا۔ دھیرے دھیرے جھاڑیاں سیاہ ٹیلوں میں بدل گئیں۔ ''صاحب واپس چلیے، اب وہ نہیں ملیں گے۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔'' وہ شرمندہ اور شکست خوردہ سا لوٹ رہا تھا۔ تھکا ہارا بھی۔

لوٹ کر وہ پھر نہایا اور مہین کرتا پاجامہ پہن کر سرھانے لالٹین رکھ کر پڑھنے لگا۔ رات کافی ہو گئی ہو

گی۔ گاؤں کے لحاظ سے تو زیادہ ہی۔ آنگن کی مٹی کو کچھمن نے پانی سے تر کر دیا تھا۔ چارپائی پر بچھی سفید چادر اور تکیے کے غلاف چاندنی میں چمک رہے تھے۔ باہر جھینگروں کی آواز آرہی تھی اور کتوں کے رونے کی... شیر پور لگ بھگ آدھی نیند لے چکا ہوگا۔ وہ ٹھیک سامنے پڑتا چاند دیکھ رہا تھا اور گاؤں کا آسمان۔ نہیں لگتا تھا کہ آس پاس کوئی ہوگا بھی... تبھی آنگن کے باہر دروازے پر کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ پھر کنڈی کھڑکی۔ کچھمن نے دروازہ کھولا تو باہر شکور (اس پٹھان نوجوان کا نام شکور تھا) اور ایک دو لوگ کھڑے تھے۔ دوپہر کی طرح سب کے ہاتھوں میں رکابیاں تھیں۔ شکور کچھ جوش میں دکھ رہا تھا۔ اسٹول پر رکابی رکھ کر بولا، ''صاحب، بکرے کی ران کا خاص قسم کا گوشت ہے۔ میں نے پکایا ہے۔ کالے تیتر سے کم لذیذ نہیں ہوتا۔'' اس کے کالے ہونٹوں کے بیچ سفید دانت چاندنی میں چمک رہے تھے۔ اس نے رکابی کے اوپر سے کروشیے سے بنا رومال ہٹا دیا۔ اندر تندوری روٹیاں، ران والا گوشت اور آلو میتھی کا ساگ تھا۔ دوسرے آدمی نے لاپروائی سے چھوٹی طشتری سے رومال ہٹایا اور کہا، ''صاحب یہ شامی کباب ہیں۔ بیگم صاحبہ نے خاص طور پر آپ کے لیے پکائے ہیں۔'' اس میں عجیب سی دلچسپی اور شوق جاگا۔ اس نے فوراً اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ منہ میں آتے ہی وہ کرکرا کباب گھلنے سا لگا۔ چنے کی دال اور قیمے سے بنا کباب۔ تبھی اسے شکور کا خیال آیا۔ اس نے چمچ سے ران والے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹا اور اسے بھی منہ میں رکھ لیا۔ اس میں الگ قسم کے مسالوں کی خوشبو تھی۔ ذائقہ بھی ایک دم علیحدہ تھا۔ وہ پسندیدگی سے مسکرایا۔ ''شکور، یہ ران والا گوشت کیسے پکتا ہے؟'' شکور خود اعتمادی اور ازدارانہ مسکراہٹ سے کھل اٹھا۔ ''صاحب یہ بہت محنت اور تردد کا کام ہے۔ شام سے یہی تو کر رہا تھا۔ اسی لیے آپ کے کھانے میں دیر ہوگئی۔ دراصل بکرے کی پوری ران کو ہی ایک ساتھ پکانا پڑتا ہے۔ اسے پوری طرح چاقو سے گود لیا جاتا ہے۔ کئی طرح کے مسالوں اور دہی میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔'' وہ کسی خاندانی اور ماہر رسوئیے کی طرح ران پکانے کی پوری ترکیب سمجھاتا رہا جو بے حد دلچسپ تھی۔

صبح اٹھا تو پتا چلا کہ نواب صاحب آگئے ہیں۔ وہ ناشتہ واشتہ کر لے، تب وہ حاضر ہوں گے۔ دس بجے کے قریب نواب صاحب آئے۔ وہ منجھولے قد کے خوب صورت اور پھرتیلے ادھیڑ تھے۔ کپڑے لتے اور طور طریقے میں انگریزیت اور نفاست تھی۔ ایک ملی جلی تہذیب کی وہ عمدہ مثال تھے۔ وہ بہت جلدی بے تکلف ہو جانے والے انسان تھے۔ ان کے پیچھے بڑھیا قسم کے دسہری آموں کی ٹوکری لیے ایک آدمی کھڑا تھا۔ ٹوکری اس نے رکھی تو دسہری آموں کی خاص نشیلی خوشبو پھیل گئی۔ ''امید ہے میری غیر موجودگی میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہوگی آپ کو۔'' نواب صاحب کے شائستگی سے مسکراتے چہرے پر ترتیب وار دانتوں کی خوب صورت قطار تھی۔ دو دانتوں پر سونے کی پتیاں دمک رہی تھیں۔ چہرے پر احسان مندی کی مسکان تھی۔ نواب صاحب نے اٹھ کر آنگن کے کونے میں ایک بند کمرے کا دروازہ کھولا۔ اس میں ڈھیر سا بھوسا بکھرا ہوا

تھا۔ پیچھے سے کئی لوگ کئی ٹوکرے لیے کمرے میں گھسے۔ ٹوکروں میں کچے، ہرے لیکن خوب کسے ہوئے، پوری طرح شگفتہ دسہری آم تھے۔ انھوں نے آموں کو بھوسے میں ڈال دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ ''اب وہ جلدی ہی ان آموں کی طرح پک جائیں گے۔ تب تک آپ یہیں رہیں گے۔''

''نہیں نہیں، مجھے فارم دیکھنے بھی تو جانا ہے،'' وہ گھبرا کر بولا۔

''وہ تو کل ہی انتظام ہو جائے گا۔ مجھے افسوس ہے میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکوں گا۔ مجھے کچھ ضروری کام ہے۔ کئی دنوں بعد واپس لوٹا ہوں۔ ابا بھی بیمار ہیں۔ لیکن میں نے سارا بندوبست کر دیا ہے۔ جب تک آپ لوٹیں گے، آم بھی پک جائیں گے۔''

دوسرے دن دوپہر بعد وہ شکور اور لچھمن کے ساتھ لڑھیا پر فارم دیکھنے، جسے وہ اخباروں میں اشتہار دیکھ کر خریدنے آیا تھا، روانہ ہو گیا۔ کچھ دور تک محض دھول بھری کچی سڑک اور مٹیا میدان تھے۔ پھر جنگل شروع ہو گیا۔ پہلے چھترے اور ناٹے قد والے پیڑ تھے۔ اس کے بعد ساگوان اور دوسرے لمبے درختوں والا گھنا جنگل۔ اس کے بیچ چھوٹی بیل گاڑیوں کے آنے جانے سے راستہ خود بخود بن گیا تھا۔ لڑھیا کے بیل سست رفتار سے چلتے رہے۔ ''اس جنگل کے بعد وکیل صاحب کا فارم آئے گا۔ وہ بھی آپ ہی کی طرف کے رہنے والے ہیں۔ پچھلے سال انھوں نے یہاں فارم خریدا تھا۔ ہم رات انھیں کے یہاں گذاریں گے۔ نواب صاحب کے دوست ہیں۔ اکثر شیر پور آتے ہیں،'' شکور کہہ رہا تھا۔ ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا، لیکن اچانک روشنی غائب ہو گئی۔ نیم روشنی میں سامنے سے ایک مور اپنی لمبی گردن اور کلغی ہلاتا جنگل میں گم ہو گیا۔ شکور مسخرگی سے مسکرا رہا تھا۔ ''صاحب راستے بھر کئی جانور سڑک پار کرتے رہیں گے۔ شاید ہرن بھی۔ پر گولی مت چلایئے گا۔ بڑے جانور بھی آس پاس ہی رہتے ہیں۔ لیکن ان پر بیلوں کی گھنٹیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ابھی وہ ہتیارے نہیں بنے ہیں۔ پر بندوق کی آواز سے وہ چونک جاتے ہیں۔ اور پھر یہ بشیر ڈاکو کا علاقہ بھی ہے۔ وہ لوگ بندوق کی آواز برداشت نہیں کر سکتے۔'' ظاہر تھا کہ شکور اسے تھوڑا ڈرانا بھی چاہتا تھا لیکن تب بھی وہ لگاتار مسکرا ہی رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت بندوق پر کڑی ہو گئی تھی۔ سیفٹی والو اپنی جگہ پر تھا۔ کچھ آگے جانے پر ایک لمبا سانپ سرسراتا ہوا سڑک پار کر گیا۔ جنگل کے ہرے اندھیرے سے ٹھنڈی نم مہک آ رہی تھی۔ سب کچھ چپ تھا۔ صرف بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں السائی سی بج رہی تھیں۔

''شکور، یہ جنگل کب ختم ہو گا جی؟'' لچھمن نے پوچھا۔ شکور نے اسے چڑانے والے انداز میں کہا، ''ابھی تو کئی پہر رات ڈھلنے تک اسی میں چلنا ہے۔'' لچھمن چپکی بی لے رہا تھا اور ڈر بھی رہا تھا۔ وہ خود بھی ہلکی آہٹ ہونے پر چونک جاتا تھا۔ اس کی پیٹھ اکڑ رہی تھی۔ وہ پچھلے دو گھنٹوں سے لگاتار چل رہے تھے۔ آخر جب نہیں رہا گیا تو اس نے لڑھیا رکوائی اور کچھ دور آگے جا کر پیشاب کرنے بیٹھ گیا۔ لچھمن بھی بڑی سی ٹارچ

لے کر اتر آیا۔ شاید یہ طلب متعدی تھی۔ شکور اور گاڑی بان بھی اتر آئے۔ وہ دوبارہ لڑھیا پر بیٹھا تو جیب سے بیگم صاحبہ والا بٹوا نکال لیا اور الائچی اور سپاری کی لچھیاں چبانے لگا۔

کچھ دور بعد جنگل اچانک ختم ہو گیا اور وہ ایک بڑے کھیتوں والے میدان میں نکل آئے۔ آسمان میں ابھی بھی ہلکی سی لالی تھی اور وہ اندھیرے میں ڈوبتی ہریالی پر خوب صورتی سے تن گئی تھی۔ وکیل صاحب ایک زندہ دل انسان تھے۔ وہ اسی کے پاس والے ضلعے کے تھے اور وکالت کی روز مرہ یکسانیت سے اُوب کر انھوں نے بھی اخباروں میں اشتہار دیکھ کر یہ فارم خرید لیا تھا۔ وہ اس ویرانے میں اس سے مل کر خوش تھے۔ اس کے علاوہ وہ انھیں کے ''دیش'' کا آدمی تھا۔ انھوں نے پھوس اور بانس کی کھپچیوں سے دو تین جھونپڑے بنوا رکھے تھے جن میں وہ اور کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ رہتے تھے۔ شاید ایک فصل ہو بھی چکی تھی۔ اس علاقے میں بارش زیادہ ہوتی تھی۔ کھیتی نئی نئی تھی اور ابھی جمی نہیں تھی۔ اس پر ٹریکٹر چل چکا تھا اور کیاریاں بنالی گئی تھیں۔ ایک کنواں اور دو ہینڈ پمپ تھے۔ کنویں میں رہٹ لگا تھا۔ چاروں طرف نمی تھی پر گرمی بالکل نہیں۔ پاس کے جھونپڑے میں ٹرانزسٹر بج رہا تھا۔

''نواب صاحب نے آپ کے آنے کی خبر بھجوادی تھی اور میں انتظار ہی کر رہا تھا۔'' وکیل صاحب یار باش لیکن سلجھے ہوئے آدمی تھے۔ رات ہوتے ہوتے ہلکی سی سردی اتر آئی تھی۔ بیچ میں لالٹین رکھ کر وہ بانس کی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ ٹرانزسٹر والے جھونپڑے سے گوشت پکنے کی خوشبو آ رہی تھی۔

''پچھلے دو برسوں میں یہاں فارم مٹی کے مول بکے ہیں۔ زمین داری تعلقہ داری جا رہی ہے اور یہاں کے ہزاروں ایکڑوں کے کاشتکار تا بڑ توڑ کھیت بیچ کر پیسے پالینا چاہتے ہیں۔ سیلنگ بھی لگنے والی ہے۔ اِدھر نہ بینک ہیں نہ بجلی۔ روپے پیسے تجوریوں میں رکھے جاتے ہیں اور وہاں سے نکال کر شہروں کے ہوٹلوں، شراب گھروں، ناچ گھروں اور کبھی کبھی نابدانوں میں بھی جاتے ہیں۔ اودھ کی شاندار روایت ابھی بھی یہاں چل رہی ہے۔ زندگی اس سے باہر بھی ہوتی ہے، اسے یہ لوگ نہیں جانتے۔'' وکیل صاحب نے سگریٹ سلگالی تھی اور اپنے بڑے پن سے خوش ہوتے ہوئے پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ''نہیں شکریہ، میں نہیں پیتا۔'' کچھ شرمندہ ہوئے اور ذرا دیر اَن منے ڈھنگ سے باتیں کرتے رہے۔ باہر سے ایک آدمی بیچ بیچ میں جھانک جاتا تھا۔ وکیل صاحب اپنی الجھن دباتے ہوئے بولے، ''آپ دو گھونٹ تو لے ہی لیتے ہوں گے؟ ٹھاکر آدمی جو ٹھہرے۔'' اس نے ان کی پریشانی کا مزہ اٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا، ''چلیے آج آپ کی صحبت میں لے لوں گا۔ اِدھر ایک عرصے سے نہیں لی۔'' حالانکہ اسے شراب سے پرہیز نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں گلاس کی جگہ دو پیالے اور جگ کی جگہ ٹی پاٹ میں پانی آ گیا۔ ایک چھوٹی سی چوکی پر ہائی لینڈ چیف وسکی کی بوتل بھی رکھ دی گئی۔ کچھ اور دیر بعد بطور چربنا نمک اور کالی مرچ میں لپٹی ہوئی کلیجی بھی آ گئی۔

وکیل صاحب نے لمبے لمبے دو گھونٹ لیے اور کچھ ترنم میں آ گئے۔ ''ٹھاکر صاحب، آپ ادھر ضرور آ جائیے۔ سچ پوچھیے تو زندگی یہی ہے۔ ہم لوگ نقلی اور بیمار زندگی جیتے ہیں۔ گھر، بازار اور چکا چوند والی زندگی اور ایک دوسرے کی جڑ کاٹنے والی لگاتار سازشیں۔ ایک ہی گھر میں ایک دوسرے سے حسد کرتے، کڑھتے ہوئے، پیلے بیمار، کھانستے لوگ۔ یہاں آ کر میں آزاد ہو گیا ہوں۔ جہاں تک نگاہ جاتی ہے، اپنے کھیت، زمین، کھلی بے کنار وسعت۔'' انھوں نے اس کا پیالہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، ''صبح آپ کو دکھاؤں گا اپنی سبزیوں کے کھیت۔ گوبھی، مولی، گاجر، ٹماٹر، بینگن، بھنڈیاں، سبھی کچھ ہے...'' وہ رک گئے، ''ابھی تڑوا کر کچھ تازہ ہرا بنوادوں؟'' ''نہیں وکیل صاحب، ابھی تو رہنے ہی دیجیے۔'' ''ویسے بھی آپ کے لیے عمدہ پالک گوشت بنوا رہا ہوں۔ پالک بھی اپنے ہی کھیت کا ہے۔ دودھ دہی، گھی، سب اپنی ہی گائے بھینسوں سے بنتے ہیں۔'' ''واہ، وکیل صاحب! آپ نے تو یہاں نرالی ہی دنیا بسا رکھی ہے۔'' ''ٹھاکر صاحب! ضروری ہے، بہت ضروری ہے یہ، مگر ہمت، حوصلہ اور طبیعت چاہیے۔ میں وہاں دِرہر بازار کی ایک پتلی سی گلی میں رہتا تھا۔ مٹ میلا کالا کوٹ اور پھانسی کے پھندے سی سفید کلف دار بو پہن کر کچہری جاتا تھا۔ ٹین کے شیڈ کے نیچے بجبجاتی بھیڑ کے بیچ منیموں والی ڈیسک پر قلم دوات لیے دن بھر پرومیسری نوٹس لکھواتا اور داخل خارج کرواتا رہتا تھا۔ بوڑھے، بیمار، بیوائیں، ویشیائیں، معذور، سبھی کھیت، زمین، گہنے، گروی رکھ کر کھیت، زمین کے لیے مقدمے لڑتے تھے اور ہم حرامی، نیچ، پاپی لوگ رات کو دانتوں کی ریخوں سے گوشت کے ریشے نکالتے ہوئے شراب کے گھونٹ لیتے رہتے تھے۔'' وکیل صاحب نے کلیجی کا ایک بڑا ٹکڑا انگوٹھے اور انگلی سے اٹھا کر منھ میں رکھا اور ہائی لینڈ چیف کا ایک گھونٹ بھرا۔ انھوں نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کہا، ''ٹھاکر صاحب! بہت بڑے پاپ پیک سے نکل کر آیا ہوں۔ اب لونسیانی اب نہ نسی ہوں۔'' اور وہ اس کے گھٹنے پر سر رکھ کر رونے لگے۔ وہ کچھ گھبرا گیا، حالانکہ اسے مزہ بھی آ رہا تھا۔ ''نہیں نہیں وکیل صاحب، آپ نے بہت اچھا کیا۔ کتنے لوگ ایسا کر پاتے ہیں؟ آپ نے بہت بڑا فیصلہ کیا اور اس کے مطابق جی رہے ہیں۔'' ایسے نامناسب موقع پر اسے اپنی کتابی زبان کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔ وکیل صاحب کچھ دیر ویسے ہی ہچکیاں بھرتے رہے، پھر ٹھیک ہو گئے۔ ''مجھے معاف کیجیے گا ٹھاکر صاحب، یہاں بالکل اکیلے پن اور ویرانے میں طرح طرح کے خیالات ستاتے ہیں۔ اپنا کیا جیا سب بار بار امڈتا رہتا ہے۔ آپ جیسے لوگ یہاں آتے کہاں ہیں؟ ویسے بھی میں نے کوئی جوگ تو لیا نہیں ہے۔ ساری کمائی لگا کر ایک نئی زندگی کی شروعات کر رہا ہوں۔ پہلی بار اپنی طرح سے جینے کی کوشش۔''

رات بہت ہو گئی ہوگی۔ کوئی آدمی پھر بار بار جھانک جاتا تھا۔ اسے اچانک شکور اور پچھمن کی یاد آئی۔ اس نے پوچھا وہ کہاں ہیں؟ ''وہ مزے میں ہیں صاحب، آپ چنتا نہ کریں،'' جھانکنے والے آدمی

نے مسکرا کر کہا۔ کافی دیر بعد انھوں نے پالک گوشت اور لکڑی کی آنچ پر پکی موٹی موٹی روٹیاں کھائیں جو بہت میٹھی تھیں۔ آٹا بھی شاید انھیں کے کھیت کے گیہوں کا ہوگا!

وہ بہت گہری نیند سویا ہوگا جب اس نے جھونپڑی کے پیچھے ایک گمبھیر ہنکار سنی۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نیند اور نشے میں اسے لگا کہ وہ جھونپڑی کے ٹھیک پیچھے آ گیا ہے۔ پاس ہی وکیل صاحب کی چارپائی تھی۔ بیچ میں تپائی پر مدھم لالٹین جل رہی تھی۔ چارپائی پر اس کے اٹھ بیٹھنے سے اتنی تو آواز ہوئی ہوگی کہ وکیل صاحب کی نیند اُچٹ جائے۔ وہ بھی اٹھ بیٹھے۔ وہ آواز انھوں نے بھی سنی ہوگی۔ ''وہ روز اسی وقت بولتا ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔ سو جایئے۔ یہ دور جنگل سے اٹھتی آواز ہے۔'' وہ جس طرح ہڑ بڑا کر ڈرا ہوا تھا اُسی طرح شرمندہ واپس سو گیا۔

صبح ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور ہوا میں خنکی تھی۔ جھونپڑی کے باہر کیچڑ ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے چھتری لگا کر ہینڈ پمپ کے پاس جا کر ہاتھ منھ دھویا۔ اسے فکر ہوئی کہ وہ فارم پر کیسے پہنچے گا، لیکن جلدی ہی آسمان صاف ہو گیا اور دھوپ نکل آئی۔ جب وہ لڑھیا پر چڑھنے لگے تو وکیل صاحب نے کہا، ''لوٹ کر رات یہیں بتانی ہوگی۔ تب تک شام ہو جائے گی۔'' پتوں پر پانی کی بوندیں ابھی تک اٹکی ہوئی تھیں۔ ذرا سی ہوا کے جھونکے سے جھر جھرا کر ان پر ٹپکنے لگتی تھیں۔ پتے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ وہ پھر گھنے جنگل کی ملی جلی مہک، اُسی تازگی میں شرابور چل رہے تھے۔ ''صاحب یہاں سے دو گھنٹے کا راستہ اور ہے،'' شکور نے کہا، پچھمن ایک ٹفن کیریئر لٹکائے بیٹھا تھا۔ ''اس میں کیا ہے؟' اس نے پوچھا۔ ''وکیل صاحب نے دوپہر کا کھانا رکھوا دیا ہے۔ صراحی میں پانی بھی ہے۔ کہہ رہے تھے، وہاں کنواں تو ہے، پر رسی ڈول کچھ بھی نہیں ہے۔'' ایسی جگہوں پر آ کر لوگ اچانک کتنے اپنے اور ملنسار ہو جاتے ہیں۔ سچ مچ وہ جگہیں اب رہنے کے قابل نہیں رہیں۔ وہاں جا کر وکیل صاحب پھر ویسے ہی ہو جائیں گے۔ بشیر ڈاکو اور شیروں کی دہاڑ کے باوجود یہ جگہیں ابھی رہنے کے قابل ہیں۔ لیکن یہاں بھی وکیل صاحب ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے؟ اور یہ جگہیں بھی؟ ہمیشہ؟

فارم پر جب وہ لوگ پہنچے تو سورج سر پر آ گیا تھا۔ جنگل اب اتنا نامانوس اور پرکشش نہیں لگ رہا تھا۔ وہ میدان پہاڑوں کی تلی میں تھا۔ اس کے پار جنگل کا ایک ٹکڑا تھا اور پھر پربت شروع ہو جاتے تھے۔ وہ وہاں سے بھی دِکھ رہے تھے— پہلے چھوٹے چھوٹے سانولے ٹیلے، پھر آہستہ آہستہ اونچے ہوتے ہوئے۔ ان کی چوٹی دھند میں کھوگئی تھی۔ میدان کے ٹھیک بیچوں بیچ ایک کنواں تھا اور اس کے ٹھیک کنارے ایک پیڑ۔ میدان تک پہنچنے کے لیے ایک چھچلی ندی سی پار کرنی پڑتی تھی۔ وہ سیلاب کے دنوں میں امڈ کر میدان کے کافی بڑے حصے کو ڈھک بھی لیتی ہوگی، اس نے کاروباری ہوتے ہوئے سوچا۔ لیکن اس وقت

وہاں دور دور تک صرف ہری دُوب تھی اور سرکنڈوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ۔ لیکن ندی پھر بھی فائدہ مند ہوسکتی ہے۔ میدان اس سے کافی اونچائی پر تھا۔ وہ پیڑ کے نیچے گھاس پر بیٹھ گئے۔ برساتی دھوپ تیز تھی، لیکن بادلوں کے ٹکڑے انھیں بیچ بیچ میں کافی دیر کے لیے ڈھک لیتے تھے۔ وہ اپنی تدبیروں اور منصوبوں میں مصروف تھا۔ بادلوں اور پہاڑوں کی طرف سے اس نے آنکھیں ہٹائیں تو لگا، لچھمن، شکور اور گاڑی بان کسی انتظار میں بیٹھے ہیں۔ کچھ دور پر لڑھیا کے بیلوں کو کھول کر ان کے سامنے چارا ڈال دیا گیا تھا۔ وہ گلے کی گھنٹیاں بجاتے ہوئے اسے کھا رہے تھے۔ لڑھیا کے جھکے بازو زمین پر پھیلے تھے۔

''شکور میاں! جگہ تو اچھی ہے۔ کچھ کھانا پانی بھی ہوجائے۔'' شکور کے چہرے پر اطمینان دکھا، شاید اس لیے بھی کہ صاحب کو زمین پسند آگئی اور اس لیے اب کچھ کھایا پیا جاسکتا ہے۔ لچھمن نے ٹفن کیریئر کھولنا شروع کیا تو خوشبو کی لپٹیں اڑنے لگیں۔ سنہرے پراٹھے، گوشت اور ٹماٹر پیاز کے ٹکڑے۔ دو ڈبوں میں ڈھیروں پراٹھے ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے تھے اور دو میں سرخ شوربے میں ڈوبی گوشت کی بوٹیاں۔ مشکل انھیں کھانے کی تھی۔ شکور نے آناً فاناً سا گوان کے پتوں کے پتل بنا دیے اور شوربے سے تر بتر گوشت پراٹھے کھاتا ہوا وہ بے کنار ہریالی دیکھتا رہا۔

ہوا کبھی رک جاتی، کبھی چلنے لگتی، لیکن گرم نہیں تھی... بورنگ کرانا ضروری ہوگا۔ کچھ ٹیس ٹوس اور بجلی کے لیے ایک جنریٹر۔ آدمی وہ وکیل صاحب کی طرح اپنی ہی طرف سے لائے گا۔ ٹریکٹر وہ خود چلاتا رہا ہے۔ یہاں کے لوگوں کا بھروسا نہیں ہے۔ وہ انھیں جانتا بھی نہیں۔ اگر میدان کے تین طرف جھونپڑیاں بنادی جائیں تو ان میں کام کرنے والے آدمی رہ سکتے ہیں۔ بیچ میں وہ اپنا بڑا ٹینٹ کھڑا کرسکتا ہے۔ کچھ بیلوں کی بھی ضرورت پڑے گی ہی۔ یہاں کے بیل؟ اس نے لڑھیا کے مریل ناٹے بیلوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''شکور میاں، یہاں کن کن چیزوں کی اچھی کھیتی ہوسکتی ہے؟'' ''جناب ویسے تو یہ علاقہ دھان کی کھیتی کے لیے مشہور ہے، مگر گنے اور ارہر کی بھی اچھی کھیتی ہوتی ہے۔'' ''یہ سب تو اچھی فصلیں ہیں، بازار کے لحاظ سے بھی۔ مگر بازار تو یہاں سے بہت دور ہوگا،'' اس نے دور اندیشی سے سوچتے ہوئے پوچھا۔ تین سو ایکڑ کے اس ہرے بھرے فارم کے لیے ایک نیا فرگوسن ٹریکٹر لانا ہوگا۔ دھان اور گنے کی جنت ہے یہ... اتنی دور آکر بے شمار دولت والی اس زمین کو چھوڑنا تو نہایت بے وقوفی ہوگی۔ لوگوں نے کہاں کہاں جاکر کیا کیا کرشمے نہیں کیے ہیں۔ یہ بہت بڑی ترغیب تھی۔ اس ترغیب کے لیے وہ سامنے اونچے پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ برف پوش تو نہیں تھے، پر فلک بوس ضرور تھے۔ ''نور پور تک تو جانا ہی ہوگا اور وہاں بازار ہے۔ اس کے لیے آپ کو ٹریکٹر میں ٹرالی بھر لگوانی ہوگی۔'' شکور نے اپنی حاضر جوابی سے فوراً اس مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالا۔ بھوکی انتڑیاں گوشت اور پراٹھے نگل کر آنکھوں اور دماغ میں غنودگی پیدا کررہی تھیں۔ ہاتھ دھونے

کے بعد وہ نرم دُوب پر تولیا بچھا کر اوندھا ہو گیا۔

شکور نے اسے جگایا۔ ''جناب، آج رات بھی وکیل صاحب کے فارم پر بتانی ہوگی اور شام ہونے سے پہلے ہی وہاں پہنچ جانا بہتر ہوگا۔'' اس نے اپنے آس پاس اور دور تک للک اور حسرت سے دیکھا۔ آخر لوٹ کر تو یہیں آنا ہے۔ اسے لہلہاتی فصل، اوپر منڈلاتے بے شمار پرندوں، مزدوروں اور ٹریکٹر کی پھٹ پھٹ سے گنجان کرنا ہوگا۔ ''پھر آؤں گا، بھلے ہی...'' اور کپڑوں سے دُوب کے تنکے الگ کرتا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پیٹ تھوڑا بھاری لیکن دماغ روشن تھا... لڑھیا کے بیل بھی السائے ہوئے بیٹھے جگالی کر رہے تھے۔ انھیں دوبارہ جب لڑھیا میں جوت دیا گیا تو گلے کی گھنٹیاں میدان میں ترنگوں کی طرح پھیل گئیں۔ تیسرے پہر کے سورج کے لیے وہاں ایک طرح سے ان کی اور اِکلوتے پیڑ کی پرچھائیاں تھیں۔

لڑھیا میں بیٹھ کر وہ واپس چلے تو وہ سپنوں اور کاہلی سے بھرا ہوا تھا۔ دن ڈھلتے ڈھلتے وہ وکیل صاحب کے فارم پر پہنچ گئے۔ کل کی طرح وہ آج بھی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ''ٹھاکر صاحب، آپ کا آنا میرے لیے بہت مبارک ثابت ہوا۔ پاس ہی ایک الگ قسم کا جنگل ہے۔ اس میں کئی طرح کے پیڑ اور بیلیں ہیں۔ قسم قسم کے جانور بھی۔ غنیمت ہے، شیر اور بھالو ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں۔ پر مشکل اس میں چلنا ہے۔ پیدل آپ چل نہیں سکتے اور لڑھیا پر چلنے سے کب کوئی ٹہنی آپ سے ٹکرا جائے یا کب کوئی بیل آپ کو گھیر لے، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ وہاں وہ پھندوں کی طرح بے شمار ہیں۔ آپ کو لگاتار اپنا سر بھی بچانا پڑتا ہے اور ہاتھوں کو بھی تیار رکھنا پڑتا ہے۔ ایسے میں آپ کو کچھ بھی مل جائے تو آپ خوش نصیب ہیں۔ مثلاً تیتر، بندر، ہارل اور کبھی کبھی ہرن بھی... کل آپ کے جانے کے بعد میں نے سوچا کیوں نہ آپ کا سواگت اور بدائی بھی انوکھے ڈھنگ سے کیا جائے۔'' وکیل صاحب! اپنے مزاج کے مطابق خوش اور جوش میں تھے۔ ''وکیل صاحب بدائی کیسی؟ میں تو آپ کا پڑوسی ہو کر آ ہی رہا ہوں۔'' ''نہیں بھائی صاحب، وہ بات نہیں۔ پڑوسی ہو کے تو جب آئیں گے تب آئیں گے۔ پر مستقبل کو کون جانتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں یہی تو ایک شغل ہے۔ دوپہر میں بندوق لے کر نکلا تو خیال آیا کہ بہت دنوں سے اس نایاب جنگل کی سیر نہیں کی ہے، سو چلا گیا۔ کیا بتاؤں ٹھاکر صاحب، جنگل کیا ہے، قدرتی طور سے بنا ہوا نیشنل پارک ہے۔ کون سے جانور اور پرندے یہاں نہیں ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا نا، شیر، بھالو، چیتے وغیرہ کو چھوڑ کر، ورنہ بے نیاز جانور اتنے بے خوف ہو کر نہیں گھومتے۔ تو تا، مینا، کویل، کبوتر وغیرہ سے لے کر خرگوش، مور، نیل گائے، کیا نہیں ہے وہاں... اور اچانک مل گیا کالا تیتر۔ نو نمبر سے ڈھیر کر دیا اسے۔'' شکور کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہی کالا تیتر جو ہاتھ سے نکل گیا تھا اس دن، وکیل صاحب کے رسوئی گھر میں پک رہا ہے۔

شام دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اچانک سیاہ سونا پن چھا گیا۔ تھکان گھر آئی اور

اداسی نے سینوں کو دبوچ لیا... لیکن وکیل صاحب موج میں تھے۔ انھیں کالا تیتر نہیں مل گیا تھا، بلکہ شام بتانے کا ایک اور سامان مل گیا تھا۔ باہر چوں کہ بارش نہیں تھمی تھی، اُمس بھی نہیں تھی، اس لیے وہیں ٹین کی کرسیاں اور میز لگا دی گئی تھیں۔ پیٹرومیکس جلایا جا رہا تھا جس کی سفید ریشمی جالی کبھی چمک دار ہو کر روشن ہو جاتی اور کبھی چمک کر لپٹ بن جاتی۔ یہ کھیل کچھ دیر یوں ہی چلتا رہا۔ گھنگھور اندھیرے کے بیچ اس کا دھیان اسی پر مرکوز تھا۔ وکیل صاحب نے کل کی طرح بھنی ہوئی کلیجی اور وسکی کی بوتل منگوالی تھی۔ کچھ دور اسٹول پر چھوٹا سا ٹرانزسٹر رکھوالیا گیا تھا جو کھنکھناتی آواز میں اس زمانے کے فلمی گیت اگل رہا تھا۔ اس نے وسکی پینا شروع کیا تو کچھ دیر خاموشی رہی۔ وکیل صاحب نے بھی ابھی بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ بے کنار اندھیرا، پیٹرومیکس کے سفید روشن ہالے اور اس چھوٹے سے ڈبے سے نکلتے فلمی گیتوں کے بیچ ایک عجیب سا رشتہ بن گیا تھا۔ وکیل صاحب دھیرے دھیرے ترنم میں آنے لگے تھے۔ لیکن وہ ابھی بھی کم ہی بول رہے تھے۔ انھوں نے وسکی کے گھونٹوں اور کلیجی کے ٹکڑوں کے بیچ ایک بازی سی قائم کر رکھی تھی اور فی الحال اسی میں مگن تھے۔ انھیں کلیجی میں کبھی کالی مرچ زیادہ لگتی اور کبھی نمک کم، اور کبھی کبھی اس کا الٹا بھی۔ کلیجی خوب اچھی طرح بھونی نہیں گئی تھی۔ اس لیے وہ اسے لگ بھگ چیونگ گم کی طرح کھا رہا تھا۔ وکیل صاحب بیچ بیچ میں واہ واہ ضرور کر رہے تھے، جو پتا نہیں کلیجی کے لیے، وسکی کے لیے یا فلمی گیتوں کے لیے تھا۔ گیت ریڈیو سیلون سے آ رہے تھے۔ ان دنوں وہ وہیں سے آتے تھے۔

...تبھی کالا تیتر آ گیا۔ سرخ شوربے میں ڈوبے بازو، گردن، سینہ اور اوپر کو اٹھی ہوئی دو ٹانگیں۔ سب سرخ، بیچ بیچ میں کچھ سفیدی لیے ہوئے جھانکتے۔ پتا نہیں کیسے اس نے مان رکھا تھا کہ کالے تیتر کا گوشت بھی کچھ سانولا ہوگا... عام طور پر کھائے جانے والے پرندوں سے الگ چولھے کی آنچ پر پکی، موٹی، کالی، لیکن سوندھی روٹیوں کے ساتھ ان کے ٹکڑے بھی کچ کچ کر کے چبائے جا سکتے تھے۔ وسکی سے تر بہ تر گلے کے اندر ان کا سواد بھی ٹھیک سے الگ کر کے پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ ''دیکھا ٹھاکر صاحب، عام گوشت اور کالے تیتر کے گوشت کا فرق! مہینوں بعد میسر ہوا ہے یہ۔ آپ کے قدم پڑے اور کالا تیتر حاضر۔''

اسے تھکان، نیند اور نشہ جکڑ رہے تھے۔ گیت بند ہو چکے تھے اور رات کے شاید گیارہ بجے ہوں گے۔ بستر آج بھی باہر ہی لگے تھے۔ وکیل صاحب بھی کچھ بول نہیں رہے تھے لیکن ہل جل رہے تھے... اندھیرے کے باوجود پتا نہیں کہاں سے ہلکا سا اجالا پیدا ہو گیا تھا... کچھ دیر بعد وہ اور وکیل صاحب اپنی اپنی مچھر دانیوں کی سرنگوں میں گھس گئے۔ پھر کچھ دیر تک جھینگروں، کتوں اور چیتلوں کی ملی جلی آوازیں آتی رہیں۔

...صبح پھر شیر پور۔ وکیل صاحب نے ان کا راستے کا سامان بندھوا دیا تھا۔'' ٹھاکر صاحب جلدی

واپس آ کر کام دھام شروع کر دیجیے۔ فصلوں کا موسم آ رہا ہے۔ بس ایک بارش پڑنے کی دیر ہے۔ بچوں کی آپ فکر مت کیجیے گا، میں انتظام کرا دوں گا،'' پر جوش ہو کر وہ ایسے بول رہے تھے جیسے وہ کل ہی واپس آ رہا ہو۔ ''ضرور ضرور وکیل صاحب، ایک بار پہنچ کر ضروری چیزوں کا انتظام کر لینے دیجیے۔'' شکور بار بار ان کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ انھوں نے اس کے مہمانوں کی اتنی مہمان نوازی کی۔

اگر چہ اس صبح سفر انھوں نے جلدی شروع کیا تھا، پر پتا نہیں کیوں لڑھیا کے بیل کچھ زیادہ ہی سست رفتار تھے۔ شاید لگا تار سفر سے تھک گئے تھے۔ شیر پور پہنچتے پہنچتے سورج پھر سر پر تھا۔ دن بھی کچھ زیادہ ہی گرم تھا اور چوں کہ ابھی ایک دن پہلے ہی اسی راستے سے گذرے تھے اس لیے راستہ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ جب وہ نواب صاحب کے مہمان خانے کے چبوترے پر پہنچے تو پسینے سے شرابور اور غیر فطری سی تھکان سے چور تھے۔ لڑھیا سے اترتے ہوئے اس نے یاد کیا، راستے بھر کوئی کچھ نہیں بولا تھا۔

اچانک نواب صاحب اپنے پرتپاک انداز میں سامنے آ گئے۔ ''دیکھیے میں نے کہا تھا نا، دسہری آم خوب اچھی طرح پک گئے ہیں... تھوڑی دیر ہو جاتی تو اترنے لگتے۔ میں نے نور پور سے برف کی سلّیاں منگوا کر آموں میں لگا دی ہیں۔ تب تک آپ نہا دھو کر تھوڑا آرام کر لیں۔ ہماری طرف تو آموں کا مزہ تیسرے پہر کے بعد ہی آتا ہے۔ کچھ لوگ دوپہر کے کھانے کے ساتھ بھی کھاتے ہیں۔ اس کے بعد دوپہر میں سونے کا سکھ کچھ اور ہی ہوتا ہے کیوں کہ آم کا بھی اپنا ایک نشہ ہوتا ہے۔'' پھر انھوں نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور جیسے آئے تھے اور ویسے ہی جھپاکے کے ساتھ چلے گئے۔

...ان کے مہمان خانے کا آنگن دسہری آموں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ وہ خوشبو کچھ زیادہ ہی تھی، اتنی کہ دم گھونٹ بھی لگ سکتی تھی... نہانے اور کھانے کے بعد وہ سچ مچ سو گیا... دسہری آموں والی سانسوں کی خوشبو پیتا ہوا... شام کو شکور آیا، ''جناب، رات کا کھانا نواب صاحب کے دستر خوان پر ہوگا۔ کچہری کے اوپر والے کمرے میں۔''

کچہری کے اوپر والا کمرہ کچی مٹی کی دیواروں کے اوپر بنا کھپریلوں سے ڈھکا ایک ہال تھا۔ نیچے گدوں پر سفید چاندنی بچھی تھی۔ اوپر کھپریلوں کے نیچے چھوٹا سفید شامیانہ ٹنگا تھا۔ بیچوں بیچ چھت سے لوہے کی سلاخوں کے سہارے سفید روشنی بکھیرتا پیٹرومیکس جل رہا تھا۔ یعنی سب کچھ جھکا جھک۔ فرش پر چاندی کی نقشین ٹرے تھی۔ نواب صاحب خس کی خوشبو بکھیرتے ہوئے لکھنوی چکن کے کرتے پجامے میں تھے۔ ان کا اوپری سنہری دانت، روشنی میں جھلملا رہا تھا۔ چوں کہ دیوار تک بچھا گدا گدگدا تھا اس لیے اس پر چلنے میں بھی دشواری ہو رہی تھی... اس نے نیچے کی ٹرے کی طرف دیکھا، وہاں بلیک لیبل، اسکاچ کی بوتل کھلی تھی اور کٹ گلاس کے گلاس میں سنہری شراب بھی جھلجھلا رہی تھی۔

''ٹھاکر صاحب، یہ شام آپ کے نام! یہ کچہری والا کمرہ بھی کبھی کبھی ہی کھلتا ہے۔'' دروازے کے باہر شکور اسی انداز میں کھڑا تھا کہ نواب صاحب بجا فرما رہے ہیں۔ چاندی کی طشتری میں شاید ہر شام والے شامی کباب تھے۔'' ٹھاکر صاحب، شکور نے مجھے بتایا کہ ہمارا فارم آپ کو بے حد پسند آیا۔ یہ شام اسی خوشی میں ہے۔''

''نواب صاحب، اس فارم کا مالک بن کر میں کتنا خوش ہوں، بیان نہیں کرسکتا۔ میں بڑ بولا پن نہیں کرتا، پر سال دو سال ہی میں اس فارم میں آپ اتنی تبدیلیاں پائیں گے کہ اس خوشی میں کچھ شامیں وہاں کے لیے بھی محفوظ رکھنی پڑیں گی۔'' اس بار دونوں ہنسے۔ چھت سے لٹکتے پیٹرومیکس کو لگ بھگ ہلاتی ہنسی۔

''ٹھاکر صاحب، رجسٹری وغیرہ تو کل نور پور میں ہوجائے گی۔ وہ تو فارمیلیٹیز ہیں۔ اصل چیز تو ہمارا آپ کا یہاں ہونا ہے۔'' انھوں نے بلیک لیبل کی بوتل اٹھائی اور اس کے گلاس میں ڈھیر سی انڈیل دی اور پھر اپنے گلاس میں۔ ''ٹھاکر صاحب، جس فارم پر آپ کل گئے تھے، اس فارم اور شیر پور میں کوئی فاصلہ نہیں تھا۔''... وہ چپ ہوگئے۔ شکور پیٹرومیکس میں ہوا بھرنے لگا کیوں کہ وہ بیچ بیچ میں نارنجی زبانیں لپکانے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ بولے، کچھ اونچی آواز میں۔ ''وہ فاصلہ پیدا کردیا گیا،'' وہ کچھ ہانپتے سے بولے، ''میری پرانی پیڑھیوں اور آپ کی پرانی پیڑھیوں میں۔'' وہ تھوڑا حیران ہوگیا... میری پرانی پیڑھیوں اور آپ کی پرانی پیڑھیوں میں۔'' ''میری پرانی پیڑھیاں؟ وہ تو یہاں کبھی تشریف لائیں نہیں۔''

''میرا مطلب ہے ٹھاکر صاحب، کہ وہ بھی وہاں وہی کر رہے تھے جو میری پرانی پیڑھیوں کے لوگ یہاں کر رہے تھے۔ سب فاصلے بڑھا رہے تھے۔ زمینیں بیچی جارہی تھیں۔ جاگیریں گروی رکھی جارہی تھیں.. ہم نے بچپن سے یہی دیکھا ہے، علی گڑھ پڑھنے جانے سے پہلے اور علی گڑھ میں پڑھنے کے بعد بھی۔'' پیٹرومیکس تمتمانے لگا تھا، اپنی سفیدی میں ایک گلابی دھبا سا۔

''ہم نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد لوٹ کر پایا کیا؟ فاصلوں کے بڑھنے اور سمٹنے کا سلسلہ۔ میرا بیٹا بھی علی گڑھ میں ہے۔ تعلیم پا رہا ہے۔ اگلے ہفتے وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں آرہا ہے۔ وہ پائے گا کہ ایک فاصلہ آپ لے آئے۔''

اچانک وہ دسترخوان کی طرف جھکنے لگے۔ تب تک وہ بریانی کھانے لگے تھے۔ اسے حیرانی کے ساتھ تھوڑا عجیب بھی لگا کہ نواب صاحب کا ہاتھ دسترخوان کی بجائے چکن کے کرتے کی جیب کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن وہاں پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ محض اس کے اردگرد گھوم رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا، ''نواب صاحب،

بریانی بے حد لذیذ ہے، کیسر کی خوشبوؤں میں بسی۔ اور روغنی روٹی تو کمال ہے۔ گھر کے تندور میں پکی لگتی ہے۔''

''رکیے ٹھاکر صاحب، بات دراصل یہ نہیں ہے۔ بات ہمارے یہاں ملنے کی ہے۔ اور باقی رہے روپے... وہ بیس پچیس ہزار جو آپ نے فارم کے لیے دیے۔ وہ فارم تو آپ کا ہو گیا یا کل تو ہو ہی جائے گا۔ لیکن وہ کیا ہیں؟'' اچانک وہ اٹھے اور لوہے کی سلاخوں سے لٹکے پیٹرومیکس کے نیچے جا کر کرتے کی جیب سے نوٹوں کا بنڈل نکال کر پیٹرومیکس پر رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچ پاتا، کچہری والا کمرہ جلتے کاغذوں کی رنگین مہک سے بھر گیا۔ شکور نواب صاحب کو سنبھالنے دوڑا۔ وہ چاندی کی ٹرے کی بریانی پر جھکے پڑے تھے۔

اس صبح جب وہ لڑھیا پر بیٹھنے جا رہا تھا تو صبح تو رہ نہیں گئی تھی پر دھوپ ابھی کومل تھی۔ نواب صاحب شارک اسکن کے کریم کلر سوٹ میں تر و تازہ کھڑے تھے۔ ''تو چلیے، نور پور کی کچہری میں دس ساڑھے دس تک پہنچ جانا ہے۔''

کچھ گھنٹے بعد لڑھیا وہاں کھڑی تھی جہاں سے ایک سڑک کچہری کی طرف جاتی تھی اور دوسری جس کے کنارے جھکے ہوئے پتھر پر لکھا ہوا تھا— شیر پور ۱۵ میل۔

نریندر جین

ہندی سے ترجمہ: یعقوب خاور

قلعہ

اپنی بغل میں بیٹھے بوڑھے آدمی سے میں نے قلعے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ قلعہ اب ایک دم ویران ہے۔ ایک دم اُجاڑ۔ میں نے دیکھا اُس کے چہرے پر بھی ویرانی چھائی ہوئی ہے۔ بس کے اندر ڈرائیور کی سیٹ کے سامنے ۷۸۶ لکھا ہوا تھا۔ مسافروں کے لیے نیک تمنا کی گئی تھی کہ ایشوران کی یاترا کامیاب کرے۔ پتا نہیں کیوں یہ جملہ پڑھتے ہی میں کچھ گھبرایا۔ بس کے بونٹ کے بغل والی سیٹ پر تین مسافر بیٹھے تھے۔ سر پر انگوچھا باندھے ایک ادھیڑ شخص، ہاتھ میں کتاب لیے ایک جوان لڑکا اور سات آٹھ سال کا ایک بچہ۔ بچہ بے صبری سے اپنے آس پاس کے ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے نئی سوتی قمیص پہن رکھی تھی۔ جوان لڑکے کی کتاب کے ٹائٹل پر ہیجان خیز انداز میں ایک عورت کی تصویر چھپی تھی۔ ادھیڑ آدمی ڈرائیور کا واقف رہا ہوگا۔ بیڑی کے بنڈل سے دو بیڑیاں سلگا کر ایک بیڑی اُس نے ڈرائیور کو دی۔ میں نے غور کیا کہ وہ لوگ وہی بیڑی پی رہے تھے جو میں پیا کرتا ہوں۔ بونٹ پر، جو دراصل بس کے انجن کو ڈھکے ہوئے تھا، دس بارہ کیلیں ٹھکی ہوئی تھیں۔ اسی پر یہ جملہ لکھا ہوا تھا کہ ''مجھ پر نہ بیٹھیں۔'' ٹھکی ہوئی کیلیں دیکھ کر میں نے سوچا کہ وہ جملہ لگ بھگ بے معنی ہے۔ ادھیڑ آدمی کیلوں کو دیکھ کر اُن کے بارے میں ڈرائیور سے پوچھنے لگا۔ ڈرائیور شرارت سے مسکرا کر بولا، ''اب تو انھیں کا راج چل رہا ہے۔'' پھر اس نے ان کیلوں کو ضلعے کے حکام، منصفوں اور چھٹ بھیّے لیڈروں کا نام دیا۔ وہ کہنے لگا کہ پانچ سال تک یہ کیلیں چبھتی رہیں گی۔ ادھیڑ نے سب سے موٹی کیل کو چھوا اور بولا کہ یہ تو کھاپی کر خوب موٹا ہوا جا رہا ہے۔ ڈرائیور نے پھر کہا کہ اِن سب کی چاندی کٹ رہی ہے۔ پہلی بار حکومت کیا لی، حکومت کی گائے کے تھن سے ہی لٹک گئے ہیں۔ اس جملے پر سب نے ملا جلا قہقہہ لگایا۔

کلنجا کے پاس بس رُکی۔ ایک بلّی پر ٹنگے بورڈ پر گاؤں کے متعلق لکھا ہوا تھا کہ وہ دو کلو میٹر دور ہے اور اس کی آبادی ۲۷۵ ہے۔ وہیں بڑ کے پیڑ پر ڈاک کا لال ڈبا لٹکا ہوا تھا۔ بڑ کے نیچے ایک آدمی اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ کنڈکٹر اُن کی طرف دیکھ کر کہنے لگا، ''ہے کوئی اٹاری کھیجڑا، گیارسپور، حیدرگڑھ۔'' کوئی اشارہ نہ پا کر اس نے سیٹی بجائی۔ بس کھڑکھڑاتی آگے بڑھی۔ رستے کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے کھیت تھے۔ گیہوں کی کٹائی چل رہی تھی۔ کہیں کہیں گیہوں پوری طرح پکا نہیں تھا۔

قلعے کے بارے میں مجھے حکم دیا گیا تھا کہ اس جگہ جا کر میں قلعے کو دیکھ آؤں۔ ڈرائیور نے کندھے پر پڑے انگوچھے سے اپنا منھ پونچھا اور مڑ کر سواریوں کو دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر اب بھی شرارت تھی۔ اس کا چہرہ تھالی جیسا گول تھا۔ ناک بھی ایک دم گولائی لیے تھی۔ جانے کیوں ایسا لگا کہ وہ شخص اپنی بیوی اور بچوں کو پیار کرتا ہوگا۔ میں نے غور کیا کہ میرا سارا دھیان ڈرائیور پر مرکوز ہے۔ اسے دیکھتے ہی جیسے ایک امید بندھتی تھی۔ میں نے سنا، ادھیڑ مسافر سے وہ کہہ رہا تھا: ''تینتالیس پچاس لے کر میں جا رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں شیاما بیٹھی ہوئی ہے۔ اب تو بار بار میں سامنے لگے آئینے میں بس شیاما ہی کو دیکھوں۔ بلا کی سندر عورت بنائی میرے مالک نے۔'' کہتے ہوئے وہ جیسے شیاما کی یاد میں ڈوب گیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ بس میں آج شیاما ہوتی تو میں بھی اسے ضرور دیکھتا۔ شیاما کو ہر کوئی دیکھتا۔ شیاما یقیناً ایسی ہی ہوگی جو آنکھوں کو راحت دے۔ اب اجاڑ اور ویران قلعے سے مجھے کیا خاص کام تھا، لیکن نہیں، آپ وہاں جا ہی رہے ہیں تو لگے ہاتھ قلعے کو بھی دیکھ لیں۔ زیادہ سے زیادہ وہاں ایک دو توپیں رکھی ہوں گی۔ اونچے وشال دروازے ہوں گے۔ کہیں باؤلی ہوگی، کہیں سے کوئی خفیہ سرنگ جاتی ہوگی۔ راستہ بہت پتھریلا اور چڑھائی دار ہوگا۔

اٹاری کھیجڑا میں بہت سے مسافر اتر گئے۔ ڈرائیور چائے پینے چل دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ادھیڑ آدمی بھی گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہر کہیں دھول اور دھوپ کا راج ہے۔ گرمیاں شروع ہونے کو تھیں، اس لیے دھول کے بگولے ہوا میں اڑے جا رہے تھے۔ چار پہیوں والے ایک ٹھیلے پر بیٹھا ایک لڑکا بیر بیچ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا، کیا بیر میٹھے ہوں گے؟ وہ کہنے لگا کہ کھا کر دیکھ لو۔ میں نے بیر چکھا۔ اس میں کھٹا پن تھا۔ لڑکا تیکھی نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اُس کی عمر کوئی دس برس ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی بے چینی بھی تھی۔ ان آنکھوں میں ایک سوال بھی شاید رہا ہو کہ کیا میں بیر خرید سکوں گا۔ اسے لگا تار گھورتا دیکھ کر میں گڑبڑا گیا اور انکار نہیں کر پایا۔ ایک اٹھنی میں نے اس کی طرف بڑھائی۔ ترازو میں ایک پتھر کا باٹ رکھ کر وہ بیر تولنے لگا۔ باٹ گم ہو گیا ہے اس لیے سوگرام کا پتھر کا باٹ ہے، وہ بتانے لگا۔ اس کے بغل میں پان کا ٹھیلا تھا۔ فلمی اداکارہ ریکھا کے دس بارہ رنگین فوٹو ٹھیلے کے اندر لگے ہوئے تھے۔ میں سستی سے

پان والے کو دیکھنے لگا۔ مجھے وہ ٹھیک ٹھاک لگا۔ ایک فلمی اداکارہ کی تصویروں سے اس کا لگاؤ مجھے بہت جائز لگا۔ جانے کیوں لگا کہ آخر اس دیس میں، اس اٹاری کھیڑا میں سخت بدحالی اور بے کاری کے عالم میں کسی کو ریکھا یا ثریا سے لگاؤ ہو جائے تو یہ ایک دم جائز بات ہے۔

اب قلعہ دیکھ کر ہی میں کیا کرلوں گا؟ سنا ہے گاؤں سے دور ایک پہاڑی پر ہے۔ اب قلعہ پہاڑی پر نہیں ہوگا تو کسی کے گھر کی بغل میں تو ہونے سے رہا۔ گھر گھر ہے، قلعہ قلعہ، میں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ کم سے کم وہاں گیا کی سرائے ضرور دیکھ کر آنا۔ سرائے ہر حالت میں قلعے سے بہتر جگہ ہوتی ہے۔ سرائے میں تھکے ہارے جا کر تم سو سکتے ہو۔ اور قلعے جیسی جگہ میں ایسی گستاخی پر ممکن ہے تمھارا سر قلم کر دیا جائے۔ آخر قلعہ ہے، کوئی مذاق نہیں، کہ جسے دیکھو وہی چلا آ رہا ہے۔ با ادب با ملاحظہ ہوشیار، جہاں پناہ تشریف لا رہے ہیں۔

بیر یقیناً کھٹے ہی نکلے۔ میں نے دیکھا ایک اور گاہک بیر والے لڑکے سے مول تول کر رہا تھا۔

ڈرائیور چائے پی کر لوٹ رہا تھا۔ منھ میں پان دبائے تھا وہ۔ اسے آتا ہوا دیکھ کر کئی مسافر بس کی طرف لپکے۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی انگلی پر لگا چونا اس نے اسٹیئرنگ پر لگا دیا۔ ایک بار میں نے اسے اسٹیئرنگ پر لگے چونے سے چونا کھاتے دیکھا۔ آگے کوئی آٹھ کلومیٹر کی پٹی کچی تھی۔ کھٹارا بس اب زیادہ کھڑکھڑا رہی تھی۔ کھڑکی سے گردن نکال کر میں نے مخالف سمت میں دیکھا۔ سڑکوں پر ڈلی بجری کے سبب بگولے کا رنگ کتھئی ہو گیا تھا۔ دیر تک اسے دیکھنا اچھا لگا۔ بس جب تک گہرے موڑ پر پہنچی، سڑک کے کنارے لگے بورڈ پر خبردار کیا گیا تھا: ہوشیار، آگے اندھا موڑ ہے۔ ڈرائیور نے ایک بیڑی سلگا کر جو کچھ کہا، اس کا مطلب سمجھ کر ہی میں لرز اٹھا۔ بورڈ پر ترچھی نگاہ ڈالتے ہوئے وہ بولا، ''میرے لیے تو یہ پورا ملک ہی اندھا موڑ ہے، کہاں کہاں بچوں گا۔'' وہ جیسے کسی خیال کے گھیرے میں تھا لیکن گاڑی بہت اطمینان سے چلا رہا تھا۔ مشینی انداز میں اس کے ہاتھ اپنے آپ اسٹیئرنگ گھما رہے تھے، گیئر بدل رہے تھے، ہارن بجا رہے تھے۔ لیکن اپنے آس پاس کی دنیا سے وہ قطعی خوش نہیں لگا۔ اسے لگاتار دیکھتے ہوئے جانے کیوں لگا کہ ڈپو میں بس لگا کر راتوں کو خالی ہاتھ گھر کی طرف لوٹتے ہوئے وہ ضرور یہ نظم گنگنایا کرتا ہوگا: اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں۔

ایڈیٹر کی ہدایت تھی کہ اس قلعے پر ایک خاص فیچر دینا ہے۔ آخر اس طرح کے اخباروں رسالوں کی بھوک کو کون نہیں جانتا؟ بس، ٹائٹل پر قلعے کا کلوز اپ دے دیں گے اور ۱۶ پائنٹ میں چھپا ہوگا، ''یہ کس کی روح ہے جو بھٹک رہی ہے قلعے میں؟'' یا توپ کی تصویر چھاپ کر ایک افسانہ گھڑیں گے کہ کیسے تو پچی محمد بخش نے بدچلنی کے شبہے میں ایک دن اپنی محبوبہ منی بائی کو توپ دم کر دیا اور خود بھی کھائی میں کود پڑا۔ دل

ہلا دینے والا منظر۔ ریاست حیدر گڑھ کی ایک دکھ بھری داستان۔ تاریخ کے جھروکوں سے پہلے پہل جھانکنے والی رومان پرور حقیقت۔ دو، خوب دو ڈسپیچ۔ گھڑو قصے۔ نظام سال بھر میں ایک بار نہاتا تھا۔ دس سال تک اس نے ایک ہی چیکٹ ٹوپی پہنی۔ یعنی نظام کی کنجوسی کی مثال کہیں نہیں۔ بس شمارہ ہوگیا تیار۔ چھپ گئے دس صفحے۔ نظام کی لوٹ کھسوٹ پر دیا ہے کبھی ڈسپیچ؟ مہاراج سندھیا کے محل کی سونے سے بنی رتن جڑی ریل گاڑی کا اسپیشل فوٹو فیچر سکسینہ سے کروایا تھا۔ شان وشوکت اور سنک سے بھرے سنسنی خیز واقعات افیم کی پینک کا مزہ دیتے ہیں۔ ''جب مہاراج سندھیا نے کوتوال کی خدمات سے خوش ہوکر جاگیر میں پورا گاؤں اسے دے دیا۔'' کیا ہیڈنگ جمائی! چھپ گیا شری منت کا فوٹو، کوتوال کے ناتی پوتوں کا اقبالی بیان اور خزانے کی مہر کے ٹھپے کا عکس۔ اب تم تھوڑے ہی کہو گے کہ وارن ہیسٹنگز جب بھارت آیا تو اس کے سامنے ان کی روح فنا ہوگئی۔ ''مائی باپ دیا کریں'' والے انداز میں پہنچے تھے دلّی دربار۔ دو، خوب دو کہانی۔

ہر گاؤں سے تباہ حال لوگ بس میں بیٹھ اتر رہے ہیں۔ مرد، عورتیں، بچے۔ بستر، کنستر، بالٹی، لوٹا، رسّی لیے۔ گرہستی کا پورا سامان۔ کھیتوں کے کنارے پیڑوں کی ڈال پر پڑے جھولے میں چھوٹے بچے نیند میں ڈوبے ہیں۔ سورج اب سر پر آ گیا ہے۔ ہنسیا درانتی چل رہی ہے۔ فصل کٹ رہی ہے۔ پسینہ بہہ رہا ہے۔ ہنسیا چل رہی ہے۔ اناج باہر آ رہا ہے دھرتی کی کوکھ سے۔ دیکھتا ہوں کہ صرافے کا سیٹھ کھیت میں کھڑا ہے۔ اس کی انگلی میں جڑا ہیرا، دھوپ میں دور تک لشکارا پھینک رہا ہے۔ کہنے لگتا ہے کہ سالے انکم ٹیکس والے گلا کاٹے دے رہے ہیں۔ ہاتھ دھوکر پڑے ہیں پیچھے۔ ''ہم بھی اپنے ہی کھیت کا گیہوں کھائیں گے'' کہہ کر سوا ایکڑ زمین لے لی۔ اب کھیتی پر تمھارا باپ بھی ٹیکس نہیں لگا سکتا۔ پچھلے سال گودام میں بھرا ۳۰۶ شربتی ۶۵۰ میں بمبئی بھیجا۔ کل منافع دو لاکھ، خرچہ کاٹ کر۔ اگر سین مہاراج خوش رہیں۔ اپنی دھرم شالا میں ایک بورا آٹا بھجوا دیا دان دکشنا کے واسطے۔ خوب چاندی کٹ رہی ہے۔ لکشمی جی کے فوٹو میں ان کے دونوں ہاتھوں سے سونے کی گنیاں برس رہی ہیں۔ دھن دھانیے سے لبالب بھرا ہے جیون۔ لالہ نے بہی کھاتے پر ''شری لکشمی جی سدا پرسن رہیں،'' لکھ کر پورا زعفران چھڑک دیا ہے۔ خوب خوش ہیں لکشمی جی۔ دکان میں رکھی دان پیٹی میں تالا ڈالا ہوا ہے۔ سیٹھ جی منڈی کے آنگن میں مندر اُٹھوا رہے ہیں۔ رام جی کی بڑائی ہوگی۔ ''بھومی پوجن'' آنے والے دسہرے کو ہے۔ گور صاحب کے کرکملوں سے۔

دھوپ میں سورستی کا چہرہ کیسے نکھر آیا ہے، سوچتے ہیں سیٹھ جی۔ کھیت کی کوٹھریا میں ایک آدھ شام مل جائے تو تن من کی پیاس بجھے۔ سورستی کے ہاتھ میں درانتی ہے۔ فصل کی دھار اور درانتی کی دھار ایک میک ہوگئی ہے۔ لوہا چمک رہا ہے۔ گیہوں کٹ رہا ہے۔ کیا مجھے سیدھے جا کر نواب صاحب سے ملنا چاہیے؟ قلعے میں ان کا محل کہاں ہوگا؟ دوپہر کے وقت تو وہ سو رہے ہوں گے۔ شاید کوئی سپنا دیکھ رہے ہوں۔ دونالی

دیوار پر ٹنگی ہوگی۔ آس پاس کے جنگلوں میں، سنا ہے، جانور بہت ہیں۔ بہتر ہوگا کہ گاؤں کے سب سے پرانے باشندے کو پکڑوں۔ اس سے بے کھٹکے کوئی بھی سوال قلعے کے متعلق کرسکتا ہوں۔ گاؤں کا کوئی حجام مل جائے تو اس سے بھی کافی کچھ دریافت کیا جاسکتا ہے۔ لوٹنا تو کل صبح والی بس سے ہوگا۔ دیکھیں کوئی جیپ مل جائے۔

لو، گیارسپور آ پہنچا۔ ایک عورت بس میں سوار ہوئی۔ کوئی کہتا ہے کہ دیہی سیوکا جی ہیں۔ پڑھی لکھی عورت لگ رہی ہیں۔ جسم تانبئی ہے لیکن سانچے میں ڈھلا ہوا۔ چلو ایک اچھا منظر بس میں پیدا ہوا، زندہ اور امید سے بھرا۔ لگتا ہے کہ سفر میں عورت کے سنگ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ جیسے آنکھیں بہت سے کالے چوخانوں کے بیچ بنے ایک سفید چوخانے ہی پر مرکوز ہوجاتی ہیں۔ اِس وقت یہ عورت کئی مسافروں کے بے ترتیب خیالوں میں مکمل طور پر موجود ہے۔ سڑک کے دونوں طرف پیڑ اپنے پتے گرا رہے ہیں۔ ایک رفتار ہے جو بس کو لیے جارہی ہے۔ پتوں کو گرارہی ہے۔ انھیں اڑا رہی ہے۔ مرتعش کررہی ہے اس عورت کے بدن کو۔ کہیں ایک قلعہ ہے جو تیزی سے میری طرف آرہا ہے۔ میں جیسے چیزوں کے مرکز میں ہوں۔ ڈرائیور، اس کی مسکان، بونٹ پر لگی چمپتی ہوئی کیلیں، ربڑ کا لال بھونپو، ڈیزل کی بو، اڑتے پتوں کی کھرکھراتی ہوئی آوازیں، کنڈکٹر کی سیٹی کی صدا۔

دیسی دارو کے اڈے پر دولڑکے بیٹھے ہیں۔ پینے والے وہ یقیناً نہیں لگتے۔ مٹ میلی الماری میں بوتلیں بھری ہیں، سفید، گلابی بوتلیں۔ پیڑ کے نیچے ایک بوڑھا تھال میں بھنی مچھلیاں لیے بیٹھا ہے۔ انڈے بیچنے والے لڑکے کے چہرے پر گھنگھور اداسی ہے۔ پینے کا وقت شاید ہوا نہیں ہے۔ شام کے بعد سے آواجاہی بڑھے گی۔ انڈے پھٹیں گے، مچھلیاں بکیں گی۔ اجاڑ جگہوں پر ایسا چھوٹا موٹا شغل تو ہونا ہی چاہیے۔ تھوڑی بہت بہشام کو پینے کو نہ ملے تو بہت سے لوگ شاید پاگل ہوجائیں۔ شاید جو دنیا انھیں دی گئی ہے، اسے بھلانے ہی کے لیے کبھی کبھار وہ پیتے ہوں گے۔ نکڑ پر لگے پان ٹھیلے پر پچھلے عام چناؤ کے پوسٹر لگے ہیں۔ رام راج کی طرف جانے کا نعرہ ان میں چھپا ہے۔ امیدوار کا بڑا سا فوٹو بھی ہے۔ دیکھتا ہوں کہ کسی شرارتی شخص نے امیدوار کے فوٹو میں اس کی آنکھیں پھوڑ دی ہیں۔ سوراخ والی آنکھیں لیے امیدوار کا چہرہ کراہت پیدا کررہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس طرح بھی ہنس کھیل کر لوگ باگ اپنا اختلاف درج کردیتے ہیں۔

چوراہے پر لگے نوٹس بورڈ پر مسافروں کی جانکاری کے لیے گیارسپور کی تاریخی وراثت کا تذکرہ ہے۔ ہر کہیں فن کاری کی شان ہے۔ چھینی ہتھوڑے کا ایسا کام کہ آنے والی صدی بھی مسحور ہوجائے۔ مجھے قلعے پر ایک مکمل فیچر تیار کرنا ہے۔ پندرہ سو روپے کا ایک چیک میرا انتظار کررہا ہے۔ ہفتہ وار کا سرورق قلعے کی تصویر کی راہ دیکھ رہا ہے۔ یہاں فن بکھرا پڑا ہے۔ بھوک بکھری پڑی ہے۔ مایوسی اور بدحالی بکھری پڑی

ہے۔ بھائیں بھائیں کرتا سناٹا ہے۔ سائیں سائیں کرتی دوپہر ہے۔ یورپ کے بازارِفن میں اس شاہکار کھمبے کی قیمت کیا ہوگی؟ چوری سے بکے گا یہ کوئی دس لاکھ میں۔ شاید اس سے بھی زیادہ میں۔ لیکن گیارسپور میں بھوک ہے، اور بھوکا آدمی اپنی وراثت نہیں دیکھتا۔ ماضی کی شان وشوکت کے بارے میں وہ کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ ان خیالوں نے جیسے مجھے گھیرلیا ہے۔ گھبرا کر میں بس میں چڑھ گیا ہوں۔ یہ وہ لمحہ ہے جب آس پاس کا پورا ماحول ایک بھاری سل کی طرح میرے دماغ پر جیسے ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔ سوچتا ہوں کہ چیزوں سے تبھی بچا جاسکتا ہے جب تم دور سے اُنھیں ایک منظر کی شکل میں دیکھو۔ جہاں ایک بار داخل ہوے، ان کا الجھاؤ تمھیں کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ میری مصیبت یہ ہوگئی کہ میں منظروں میں داخل ہوکر ان کا حصہ بننے لگا۔ مجھے چاہیے تھا کہ بھوک کو میں ایک منظر کی شکل میں دیکھتا۔ بھوک یعنی ایک نہایت رینلسٹک اسٹائل میں بنی پینٹنگ۔ بدحالی میری نظر میں موزارٹ کی ایک اداس سمفنی ہونی چاہیے تھی۔

سڑک کی ڈھلان پر کھڑے ٹرک کا ڈرائیور اپنے کلینر سے جھگڑ رہا ہے۔ وہ اسے پورے عمل کو واضح کرتی ہوئی، ماں بہن کی گالیاں دے رہا ہے۔ بھونچکا رہ جاتا ہوں میں۔ لگتا ہے اس کی بھونڈی گالیوں کی گونج وہاں کی فضا میں ہمیشہ موجود رہے گی، شاندار وراثت کی شکل میں۔ اُن گالیوں میں نفرت ہے، غصہ ہے، اشتعال ہے۔ کہنے کو کہا جاسکتا ہے کہ ان میں ایک لَے بھی ہے۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ میں قلعے کے بُرج پر کھڑا ہوں اور اصطبل کے پاس کھڑا نواب مجھے ماں بہن کی گالیاں دے رہا ہے۔ مجھے جھرجھری آگئی۔

بس کے سارے مسافر اتر رہے تھے۔ بس جہاں کھڑی تھی وہاں ایک سپاٹ میدان تھا۔ ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے املی کے پیڑ پر چڑھے تین چار لڑکے کٹارے توڑ رہے تھے۔ قلعے میں داخل ہونے سے پہلے یہ منظر مجھے اچھا لگا۔ املی کے پتوں میں کچا ہرا پن تھا۔ پیڑ پر املی کی بہار آئی ہوئی تھی۔ گاؤں سے گذرتے ہوے مجھے لگا کہ میں وقت کے پار چلا گیا ہوں۔ قلعے کی مماثلتیں ہر کہیں تھیں— گلیوں میں، گھروں کے چھجوں میں، منڈیروں پر، آنگنوں میں۔ گلیاں بہت سکڑی تھیں۔ ایک بہت پرانے مکان کے پچھواڑے کی دیوار کو پھاڑ کر ایک پیپل باہر نکل آرہا تھا۔ میں ٹھٹک کر اُسے دیکھنے لگا۔ اپنے کچے گھر کے آنگن کو ایک عورت کھریا سے پوت رہی تھی۔ ایک بچہ وہیں بیٹھا سلیٹ پر قلم سے کچھ لکھ رہا تھا۔

گلی کے موڑ پر چائے کی گمٹی دِکھی۔ اوٹلے پر بیٹھ کر چائے پیتے ہوے میں سوچنے لگا کہ وقت کیسے ٹھہر جاتا ہے۔ گاؤں کی گھڑیاں واقعی عرصے سے رکی ہوئی تھیں۔ لوگ باگ وقت کے اِس ٹھہراؤ کے ساتھ ہی ٹھہر گئے تھے۔

میں لکھنا چاہ رہا تھا لوگوں کے بارے میں، ان کی آنکھوں میں ٹھہرے سوالوں کے بارے میں،

رکے ہوے وقت کے بارے میں۔لیکن ایڈیٹر کا صاف حکم تھا کہ قلعے کو دیکھوں اور گذرے دور پر ایک سنسنی خیز فیچر لکھوں۔ٹھیک ہے، کروں گا تیار ایک حیرت انگیز کہانی، قلعے کے بارے میں، حرم کے بارے میں، قتل اور خودکشیوں کے بارے میں۔

سیدھے نواب صاحب کے محل میں جانا درست ہوگا، میں نے سوچا۔اُن سے احترام سے پیش آؤں گا تو ممکن ہے وہ کچھ نرم پڑیں۔یوں سن رکھا ہے کہ کسی باہری شخص سے میل ملاقات نہیں کرتے۔غصہ تو ناک کی نوک پر ہے۔قلعہ نیچے میدان ہی سے نظر آرہا ہے۔وہی قلعہ، وہی بناوٹ، جیسی قلعوں کی ہوا کرتی ہے۔بُرج پر ایک توپ دکھائی دے رہی ہے۔راستہ گھماؤ دار ہے۔سیڑھیاں اوپر تک پہنچتی ہیں۔سیڑھیاں مکڑی کے جالوں سے اٹی ہوئی ہیں۔سب کچھ ہیبت ناک ہے۔جتنا ایک قلعے کو ہونا چاہیے۔دہشت پیدا کرنا آسان کام نہیں۔وہ اتنا ہی ہیبت ناک اور پیچیدہ ہوتا ہے۔بس ایک بار دبدبہ چھا جائے تو تمھیں اپنا غلام بنالیتا ہے۔''سنتری جھپکی لیتا ہوا پایا گیا۔نواب صاحب نے ننگا کروا کر ڈنڈا گھسیڑ وادیا۔رعایا نے پوری طرح کورنش میں سر نہیں جھکایا۔نواب صاحب نے سر منڈوا کر کوڑے لگوائے۔''اب حکومت ایسے ویسے تو نہیں چلتی۔چابک کی پھٹکار تو ہواؤں میں سنائی دینی چاہیے۔اسی قلعے کے اندر سے سرنگ گلاب گنج تک گئی ہے۔ابھی اور سیڑھیاں باقی ہیں۔کچھ دم لے لوں۔اونچائی سے گاؤں کیسا نظر آتا ہے۔جادوئی اور سپنوں میں ڈوبا ہوا۔میرے سپنوں میں کہیں دلّی ہے، اس کے گھماؤ دار راستے ہیں۔پارلیمنٹ ہاؤس ہے، جنتر منتر ہے،۔سوچتا ہوں کہ پارلیمنٹ کسی پہاڑی پر نہیں بسی ہے لیکن پھر بھی اس نے جیسے قلعے کی شکل اختیار کرلی ہے۔اس میں فوج ہے، پولیس ہے، لاٹھیاں ہیں، بندوقیں ہیں، حکومت کا دبدبہ ہے۔ایک کھجلایا ہوا کتا جھاڑی سے نکلتا ہے اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے۔اس کا سموچا جسم خارش کے چکتوں سے بھرا ہے۔قلعے کے قریب اس کی موجودگی مجھے حیرت سے بھر دیتی ہے۔خواہش ہوتی ہے کہ اسے تھپتھپادوں اور اس کے چکتوں پر ہاتھ پھیروں۔میں قلعے کے اندر ہوں۔چاروں طرف اونچی اونچی وسیع و عریض دیواریں ہیں۔دیواروں کی سیندھ میں ہری گھاس اُگی ہوئی ہے۔برج کے ٹوٹے ٹکڑے یہاں وہاں بکھرے پڑے ہیں۔توپ کے قریب جاکر اسے چھوتا ہوں، اس میں جھانک کر دیکھتا ہوں، جیسے وہ کوئی توپ نہ ہو، توپ کا مردہ ہو، ٹھنڈا اور گلتا ہوا۔توپ کے اندر کی ٹھنڈک چیونٹیوں کو بہت بھاتی ہوگی، مجھے لگتا ہے۔توپ کے منھ میں کم وبیش ناک گھسیڑ کر سونگتا ہوں۔بارود کی بو وہاں نہیں ہوتی۔

قلعے کی فصیل سے کچھ دوری پر بنے محل میں نواب صاحب اپنے خستہ حال پلنگ پر لیٹے پڑے تھے۔قلعہ مضبوط رہا ہوگا۔محل البتہ اتنا ہی خستہ حال دیکھا جتنے نواب صاحب۔میں نے دیکھا، وہاں ٹاٹ کا ایک پردہ لٹک رہا تھا۔نواب صاحب سے ملاقات ناقابل فراموش رہی۔شیشم کی میز پر کھانا لگوایا اُنھوں

نے۔ میں نے دیکھا کہ میز کا ایک پایہ ٹوٹا ہوا ہے۔ آلو کا سالن اور رومالی روٹی پیش کی گئی۔

قلعے کی مکمل داستان اور نواب صاحب سے ملاقات کا پورا حال اب آپ ہمارے ہفتہ و خاص شمارے میں پڑھیں گے۔

ستین کمار

ہندی سے ترجمہ: سلام بن رزاق

جہاز

یادداشت برف کی طرح ہوتی ہے، مجھے ہمیشہ لگتا رہا ہے۔ کوئی بھی چیز جیسی رکھ دو، ویسی ہی قائم رہتی ہے۔

قریب بیس سال بعد میں اس شہر کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ نہیں بدلا تھا۔ وہی جھیل، وہی اونچی نیچی سڑکیں، وہی آمنے سامنے کھڑی بالکل پرانی اور بالکل نئی عمارتیں۔ لیکن بہت سی چیزیں بدلی ضرور ہوں گی۔ جھیل گہری ہوگئی ہوگی یا اُتھلی۔ سڑکیں چوڑی ہوگئی ہوں گی۔ کچھ بہت پرانی عمارتیں گرگئی ہوں گی، کچھ نئی عمارتیں پرانی ہوگئی ہوں گی اور بہت سی نئی عمارتیں بنی ہوں گی... لیکن ٹیکسی کی کھڑکی سے گذرتا شہر نیا ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔

لیکن کچھ دیر بعد جب یکا یک ٹیکسی رکی تو میں یکبارگی بیٹھا سا رہ گیا۔ میری طرف والی کھڑکی کے باہر دور تک پھیلی ہوئی ویرانی پر نظریں جیسے چپک کر رہ گئی تھیں۔ غالباً چونک کر میں نے دوسری طرف دیکھا، گاڑی ایک بہت بڑی کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں آکر رکی تھی۔ لیکن مرادمنزل؟ اور اس کے ساتھ ہی دماغ میں بیس سال پہلے کی ایک چمچماتی کوٹھی کا جیسے ایک گلوسی سا پرنٹ ابھر آیا۔

اچانک نظریں پورچ کے اوپر، بیچوں بیچ لگے ہوئے سنگ مرمر پر ٹک گئیں۔ کالے پتھروں سے جڑے ہوئے اردو میں بڑے بڑے لفظ نظر آرہے تھے: ''مرادمنزل''، اور اس کے نیچے: ''۱۹۱۶ء''۔

اس سے پہلے کہ ٹیکسی ڈرائیور کچھ کہتا، میں نے دروازہ کھولا اور پیسے ادا کر کے سامان اتروانے لگا۔

ایک کہر آلود، دھندلی سی صبح، اور خوابیدہ ویرانی سے گھری ہوئی مرادمنزل۔ میں ابھی تک ویسے ہی کھڑا تھا۔ آنکھوں میں بیس سال پہلے کی چمچماتی ہوئی مرادمنزل کی تصویر جیسے پھیلتے ہوئے کہرے میں دھندلی پڑتی جارہی تھی اور دھیرے دھیرے سب کچھ ایک نئے انداز سے پہچان میں آتا جارہا تھا۔ پورچ،

اس میں کھڑی ہوئی کالی بیوک، اونچے اونچے ستونوں سے گھرے لمبے برآمدے، لان، فوارہ — سب کچھ وہی تھا لیکن... اور اچانک ایک تصویر دماغ میں کوند گئی۔ یورپ سے لوٹتے ہوئے نہ جانے کس پورٹ پر ایک جہاز دیکھا تھا، ڈاکیارڈ سے کافی فاصلے پر کھڑا ہوا ایک خستہ اور شکستہ بیکار جہاز...

اچانک پورچ کی دوسری جانب سے مرغیوں کا ایک جھنڈ چیختا ہوا سا باہر کی طرف بھاگا۔ سناٹا جیسے نیند میں چونک پڑا۔

ایک خمیدہ کمر ضعیفہ دھیرے دھیرے اسی طرف آرہی تھی۔ میں آگے بڑھا۔ ''کون؟'' شاید قدموں کی آواز سن کر ضعیفہ نے کہا۔

''السلام علیکم،'' نزدیک پہنچ کر میں نے سلام کیا۔

جواب میں ضعیفہ کچھ بڑبڑا کر رہ گئی اور پھر میری طرف دیکھنے لگی۔

''جناب رفعت اللہ خاں صاحب سے...'' میں نے کہنا شروع کیا۔ پھر جلدی سے جملہ پورا کیا:

''میں دلّی سے آیا ہوں۔'' بوڑھی آنکھیں اب غور سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ جواب ملا:

''رفعت میاں اس طرف ہیں... چلے جایئے۔'' اس نے اپنی پشت کی جانب اشارہ کیا۔

میں آگے بڑھا۔ دوسری جانب کونے والے حصے میں ایک دروازہ تھا۔ باہر ایک چھوٹی سی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی: ممتاز جہاں بیگم۔ یکبارگی میرے پاؤں ٹھٹکے، پھر سامنے بنے ہوئے چبوترے پر چڑھ کر میں نے نیم پلیٹ کے نیچے لگے کال بیل کے بٹن کو دبایا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ ایک ادھیڑ سے صاحب ڈریسنگ گاؤن پہنے، آنکھیں ملتے ہوئے کھڑے تھے۔

''کون؟''

میں نے سلام کیا اور پھر بولا، ''میں امروز... دلی سے...'' میں اتنا کہہ پایا تھا کہ ایک دم وہ بول پڑے، ''ارے!... اچھا اچھا... آؤ میاں، آؤ...''

نیند کے خمار کی کچھ پرتیں ہٹ گئی تھیں۔ انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اندر چلتے ہوئے پوچھا، ''سامان وغیرہ؟''

''جی، باہر...''

''ٹھیک ہے۔ منگوائے لیتے ہیں... آؤ۔''

ہم لوگ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ شاید ڈرائنگ روم تھا۔

''جی ٹی سے آئے ہوگے؟'' میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے انھوں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''تمھارے والد صاحب کا خط مل گیا تھا،'' انھوں نے کہا۔ پھر ''ایک منٹ'' کہہ کر وہ اٹھے۔ ''ذرا چائے کے لیے کہہ دوں،'' اور وہ سامنے والے دروازے سے اندر چلے گئے۔

نہ جانے کیوں مجھے ایک راحت سی محسوس ہوئی۔ ٹیکسی سے اترنے کے بعد سے ہی ایک عجیب سی بے چینی نے مجھے گھیر لیا تھا۔ بند کمرے کے سبب امس بھری گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر اپنے سامنے والی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اسے کھول دیا۔ سامنے ایک جھیل تھی، بہت دور تک پھیلی ہوئی۔ کہرا دھیرے دھیرے ہٹ رہا تھا۔ آسمان کے اس کنارے پر ایک ہلکی ملگجی سی سرخی ابھر رہی تھی۔ میں واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔

کمرہ نئے ڈھنگ سے سجا ہوا تھا۔ ہلکے زرد رنگ کی دیواریں، سرخ جوٹ کا کارپٹ، گلاس ٹاپ سینٹر ٹیبل، اور... نظریں رک گئیں۔ ایک بڑا سا گلدان سامنے والے کونے میں رکھا ہوا تھا— پرانے، رنگین بلجیین گلاس کا بہت ہی خوبصورت گلدان، مگر بالکل خالی۔

''یہاں آنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی؟'' رفعت میاں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''جی نہیں، کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔''

''اگر تمھارے آنے کے وقت کی صحیح اطلاع ہوتی تو گاڑی بھیج دیتے،'' انھوں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک سگریٹ منھ سے ہٹا کر بولے، ''لیکن تمھاری تو دیکھی ہوئی ہے مراد منزل، میرے خیال سے...''

''جی ہاں،'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں بہت چھوٹا تھا اس وقت۔''

''ہاں، دیکھو اب یاد آیا مجھے... سن باون کی بات ہے نا؟ جب تمھارے والد دلی چلے گئے تھے۔ تم تو میاں، چھوٹے سے تھے اس وقت۔ میرے خیال سے بمشکل تمام آٹھ نو سال کے رہے ہوگے۔''

''جی ہاں۔''

ایک نوکر چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ رفعت میاں نے اپنے پاس رکھی تپائی پر ٹرے رکھوالی اور چائے بنوانے لگے۔

''تم تو لندن گئے تھے نا تعلیم کے لیے؟'' انھوں نے چائے کا کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں، انجینئرنگ کے لیے۔''

''کافی دن رہے ہوگے؟''

''قریب دو سال۔ ابھی پچھلے مہینے واپس لوٹا ہوں۔''

''ہُم...'' کچھ دیر تک وہ چپ چاپ چائے پیتے رہے۔ پھر پیالے کی طرف دیکھتے ہوئے بولے، ''بہت اچھا ہے میاں، اس زمانے میں تو تعلیم اور قابلیت ہی کام آتی ہے۔'' پھر قدرے رک کر انھوں نے پوچھا، ''یہاں ایچ ای ایل میں نوکری ملی ہے نا؟''

''جی ہاں،'' میں نے چائے کا پیالہ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ چائے پینے کے بعد وہ اٹھے۔ ''اچھا، تم یہیں کچھ دیر بیٹھو۔ میں تمھارا کمرہ وغیرہ ٹھیک کروادوں۔ تم نہادھولو۔ جب تک سب لوگ جاگ جائیں گے۔ پھر ملنا...'' کہہ کر رفعت میاں چلے گئے تھے۔

میں ابھی ویسے ہی کھڑا کمرے کو گھور رہا تھا۔ ایک سرد مضطربانہ احساس ایک بار پھر لوٹ آیا تھا۔ یہ ایک دائرہ نما کمرہ تھا۔ بقول رفعت میاں، ''مرحوم ابا جان کی خوابگاہ'' چاروں طرف دیواروں میں بڑے بڑے آئینے جڑے ہوئے تھے جن کی آب اب اتر گئی تھی۔ ملازم کے ذریعے کروائی گئی جھاڑ پونچھ کے باوجود ان پر ایک پرانا سا پیلا پن چھایا ہوا تھا۔ کمرے میں جلتے ہوئے بلب کی روشنی ان میں سے منعکس ہو کر اور بھی زرد لگ رہی تھی۔ دیواروں پر آئینوں کے بیچ بیچ میں کچھ جگہیں خالی تھیں۔ سامنے کی طرف کچھ اونچائی پر لگی، بھاری سنہری فریم میں جڑی ہوئی، ایک پرانی پینٹنگ تھی۔

کمرے میں پرانے ریشم کی ایک تیکھی سی مہک بھری ہوئی تھی۔ باہر سورج نکل آیا ہوگا۔ میں آگے بڑھا اور بائیں طرف والے حصے میں لگے ہوئے بھاری، مخملی پردوں کو ہٹا کر کھڑکی کھول دی۔ سفید روشنی سے کمرہ بھر گیا۔ باہر کافی دور تک پھیلی ہوئی خشک گھاس اور بے شمار سوکھے پتوں سے ڈھکا ہوا باغ تھا۔ آم کا ایک تنہا درخت بیچوں بیچ گردن جھکائے کھڑا تھا۔ اس خاموش فضا میں بس ایک ہی آواز گونج رہی تھی، کسی سلائی مشین کے چلنے کی آواز، جو غالباً کہیں پاس ہی سے آرہی تھی۔

کھڑکی سے ہٹ کر میں نے یکبارگی کمرے پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی۔ اب کچھ بہتر لگ رہا تھا۔ سامنے کی طرف دیوار سے کچھ ہٹ کر ایک کافی بڑا فرنچ بیڈ تھا جس کے اوپر پرانے میرون رنگ کا جھولتا ہوا سا ساٹن کا بیڈ کور بچھا تھا۔ پلنگ سے ہٹ کر بائیں طرف ایک دروازہ تھا، شاید باتھ روم کا۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ سفید پتھر سے بنا ہوا کافی بڑا کمرہ تھا جس کی ایک دیوار پر ایک قدِ آدم آئینہ لگا ہوا تھا۔ دوسرے کونے میں سفید پتھر کا ہی ایک کافی بڑا ٹب تھا۔ پرانے طرز کا اچھا خاصا غسل خانہ تھا۔ میں کمرے میں لوٹ کر اپنا سامان وغیرہ کھولنے لگا۔ بیچ میں نوکر نے آکر خبر دی کہ غسل خانے میں گرم پانی رکھوا دیا گیا ہے۔ کپڑے

وغیرہ نکال کر میں نہانے کی تیاری کرنے لگا۔

رفعت میاں کے ڈائننگ روم میں جب میں پہنچا تو نو بج رہے تھے۔ ناشتے کی میز پر ایک نو دس سالہ لڑکا اور اس سے قریب دو تین سال چھوٹی ایک لڑکی تھی۔ ''شبنم اور فیروز،'' رفعت میاں نے بتایا، اور پھر ان دونوں سے بولے، ''بیٹے سلام کرو چاچا کو!'' دونوں بچوں نے ایک شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا۔ تبھی باورچی خانے سے ہاتھوں میں پلیٹیں لیے ایک محترمہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

''تمھاری بھابھی،'' رفعت میاں نے مجھ سے کہا، اور پھر ان کی طرف دیکھ کر بولے، ''امروز میاں...''

میں نے اٹھ کر انھیں سلام کیا۔

''بیٹھیے بیٹھیے...'' انھوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا اور پلیٹیں ٹیبل پر لگانے لگیں۔

''ممتاز جہاں بیگم!'' باہر لگی ہوئی چھوٹی سی نیم پلیٹ میری نظروں کے سامنے گھوم گئی۔ تیس بتیس سال کی عمر، حفاظت سے رکھا گیا ذرا بھاری جسم، گورا رنگ، خوبصورت تیکھے نقش اور گہری سیاہ آنکھیں۔

''کیا جوائن آج ہی کرنا ہے؟'' رفعت میاں پوچھ رہے تھے۔

''جی نہیں، کل۔''

''بس تو ٹھیک ہے، آج آرام کرو۔ رات کو ٹرین میں تو کیا سو پائے ہوگے۔''

''جی ہاں، ایسے ہی رہا کچھ...''

''بھئی دراصل بڑی واہیات سواری ہے۔ مجھے تو دہشت ہوتی ہے۔ اور یہ تو بالکل برداشت نہیں کر پاتیں۔'' انھوں نے بیگم صاحبہ کی طرف اشارہ کیا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ زیادہ تر وقت رفعت میاں ہی بولتے رہے۔ ناشتہ ختم کر کے جب ہم لوگ اٹھنے لگے تو بیگم صاحبہ نے پہلی بار مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، ''آپ کا کمرہ تو کھلا ہوا ہے نا؟ دراصل جلدی جلدی میں صفائی نہیں ہو پائی ہوگی۔ میں اب کرواؤں گی...''

''آپ پریشان نہ ہوں...'' میں نے کہنا شروع کیا۔ پھر ان کی مسکراہٹ دیکھ کر میں نے دھیرے سے جملہ پورا کیا، ''جی ہاں، کمرہ ویسے کھلا ہے،'' اور رفعت میاں کے ساتھ میں باہر آ گیا۔

''آؤ، ظفر بھائی کے پاس چلیں،'' باہر آ کر پورچ کے اندر داخل ہوتے ہوئے انھوں نے کہا۔

بالکل سامنے ہی ایک کافی بڑا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گہرے میرون رنگ کا ایک دبیز پردہ پڑا تھا جس میں جگہ جگہ زری کا کام کیا گیا تھا۔ اندر داخل ہو کر ایک صوفے کی طرف اشارہ کر کے رفعت میاں نے کہا، ''تم بیٹھو، میں دیکھتا ہوں۔'' اور وہ اندر کی طرف والے دروازے سے چلے گئے۔ صوفے پر بیٹھتے ہی میں

اس میں دھنس سا گیا۔ غیر ارادی طور پر نظریں اوپر کی طرف چلی گئیں اور پھر وہیں ٹھہر گئیں۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا فانوس چھت سے لٹکا ہوا تھا— کرسٹل گلاس کا۔ ایک لمحے کے لیے دماغ جیسے کہیں پر رک سا گیا۔ پھر یاد آیا کہ یہ کمرہ مراد منزل کا پرانا، خاص ڈرائنگ روم تھا۔ بچپن میں شاید کوئی جشن اسی کمرے میں دیکھا تھا اور تبھی اس فانوس کو بھی اپنی پوری جگمگاہٹ کے ساتھ جلتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن ساتھ ہی کوئی اور بھی چیز تھی جو فی الحال یاد نہیں آ رہی تھی۔

نظریں اب ایک سلسلہ وار طریقے سے کمرے میں گردش کر رہی تھیں۔ کافی بڑا کمرہ تھا، تقریباً ایک پورا ہال۔ اونچی اونچی دیواریں، چھت کے قریب بڑے بڑے روشن دان جن سے ریشمی رسیاں نیچے لٹک رہی تھیں، کھڑکیوں پر وہی دبیز قسم کے شنیل کے پردے۔ پورے کمرے میں ایک گہرے سرخ رنگ کا فرش بچھا ہوا تھا اور اس کے اوپر ایک بہت بڑا سرخ، کالے اور سفید رنگ کے پیٹرن کا ایرانی قالین اور اس کے اوپر کمرے کے بیچوں بیچ دیوار کے سامنے بچھا ہوا سفید فرکا غالیچہ، جس کے روئیں اب ختم ہو چکے تھے اور رنگ بھی زردی مائل ہو گیا تھا۔ پرانے وکٹورین فرنیچر کی بھاری بھرکم چیزیں یہاں وہاں کمرے میں رکھی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف دیواروں پر بڑے بڑے سنہرے فریموں میں بہت سے پورٹریٹس آویزاں تھے۔ میری بائیں طرف والی دیوار پر ایسی ہی تین چار جگہیں خالی تھیں۔ زیادہ تر تصویروں کے رنگ ابھی تک چمک رہے تھے لیکن سنہری فریموں کا رنگ دھندلا گیا تھا۔ دیوار کے پیچھے ایک کافی بڑا آتش دان تھا اور اس کی دونوں طرف والی دیواروں کے سہارے شیشے کی الماریاں جن میں بے شمار کتابیں قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔ سجاوٹ کے طور پر چاروں طرف اسٹینڈ اور دیواروں پر شکار کی ٹرافیاں لگی ہوئی تھیں— چیتل، ہرن، تیندوے اور چیتوں کے سر، شیشے کی چمکتی ہوئی، مصنوعی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے، اور سارے ماحول پر چھائی ہوئی وہی پرانے ریشم کی مہک۔

رفعت میاں ایک اور صاحب کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ میں نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

''ظفر بھائی،'' رفعت میاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام، صاحب زادے!'' ظفر بھائی نے پاس آ کر بڑی گرم جوشی سے جواب دیا اور پھر ہاتھ ملاتے ہوئے مجھے اپنے کندھوں سے لگا لیا۔

''بھئی واہ، ماشاءاللہ، بڑے خوبصورت نوجوان ہو۔ بالکل سرفراز کے بیٹے... بے حد خوشی ہوئی تمھیں دیکھ کر۔ آؤ بیٹھو!'' اور بڑے والے صوفے پر وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئے۔

میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔ گورا چہرہ اور لال داڑھی، اور اچانک پھر فانوس والی بات دماغ

میں روشن ہوگئی۔ پھر تو جیسے سارے گوشے جگمگا اٹھے...لندن سے واپسی کا سفر، جہاز، آئرش شپ کیپٹن، اس کا گورا چہرہ اور لال داڑھی، شپ کا ڈائننگ ہال اور اس کے بیچوں بیچ چھت سے لٹکتا ہوا کرسٹل گلاس کا بھاری فانوس...

ظفر بھائی کی آواز نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔

''سرفراز تو خیریت سے ہے نا؟'' وہ پوچھ رہے تھے۔

''جی، آپ سب لوگوں کو دعا کہی ہے۔ بے حد یاد کرتے ہیں۔ شاید آئیں گے یہاں پر...''

''ارے، اب آئیں گے کیا!...اب تو یہاں آکر رہنا چاہیے۔ زمانہ ہوگیا اسے بھوپال چھوڑے۔ اور پھر اب تو آرام کے دن آئے ہیں۔'' اور ظفر بھائی مسکرا پڑے۔

ظفر بھائی ابا کی ہی عمر کے تھے۔ حالانکہ ابا اس گھر کے ملازم رہے تھے لیکن مرحوم عطاء اللہ خاں صاحب نے کبھی بھی اپنے لڑکوں اور ابا میں کوئی فرق نہیں سمجھا تھا۔ ویسے بھی ظفر بھائی اور ابا میں ایک خاص ڈھنگ کی دوستی تھی۔

ظفر بھائی کی آنکھیں میرے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں، یا شاید گذرے زمانے کو، اور میری آنکھوں میں ان کا چہرہ جہاز کے آئرش کیپٹن کے چہرے کے اوپر جھلملا رہا تھا۔ دونوں چہروں میں عجیب سی مشابہت تھی۔ بس آنکھیں الگ الگ تھیں۔ کیپٹن کی آنکھیں نیلی تھیں— سمندر کی طرح گہری— اور ظفر بھائی کی آنکھیں کچھ بھوری سی، خشک پتوں سے ڈھکی ویرانی کی طرح۔

''ارے ہاں...'' کچھ دیر بعد ظفر بھائی کو جیسے کچھ یاد آیا۔ ''تم تو برطانیہ سے لوٹے ہو بھئی، وہاں کے حال چال سناؤ۔ اب تو بہت بدل گیا ہوگا انگریز بہادر کا ملک؟''

ظفر بھائی خود لندن میں رہے تھے قانون کی تعلیم کے سلسلے میں۔

پھر وہیں کی باتیں ہونے لگیں۔

رات ہوچکی تھی۔ سارا دن مراد منزل میں گذرا تھا۔ کوئی خاص کام تو نہیں کیا تھا لیکن بری طرح تکان چھا گئی تھی— قریب قریب ویسی ہی تکان جیسی اس روز جب جہاز بمبئی آکر لگا تھا۔ دماغ میں جیسے پانی سا بھر گیا تھا۔ نسیں پھول گئی تھیں۔ نہ جانے کیوں جس ڈھنگ سے سارا دن گذرا تھا اس سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ایک ایسے مریض کے پاس بیٹھے بیٹھے پورا دن گذار دیا جو ٹھیک سے بول بھی نہ سکتا ہو۔

لیکن حقیقتاً ایک عرصے بعد میں نے اتنی باتیں کی تھیں۔ ظفر بھائی کے ساتھ تو پورے تین گھنٹے بیت گئے تھے۔ نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں نکل آئی تھیں۔ اسی دوران بہت سی اور باتوں کا پتا چلا تھا۔ ان تین

گھنٹوں میں نہ جانے میں کتنی بار چونک پڑا تھا۔ ڈرائنگ روم کے ایرانی قالین کا پیٹرن میرے ذہن میں نقش ہوگیا۔ وہاں سے اٹھتے وقت لگا تھا جیسے ساری عمر میں نے اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے گذاری تھی اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی ایک ایک چیز پرانی ہوگئی تھی۔ وقت کا ایک پورا دریا وہاں سے بہہ کر گذر چکا تھا اور میں اور ظفر بھائی اس کے پیچھے چھوٹی ریت میں اپنے دھنسے ہوئے پیروں کے ساتھ کھڑے سامنے پھیلی اس کی شکن آلود سطح کو دیکھتے رہے تھے۔

مرادمنزل تین حصوں میں بٹ گئی تھی۔ جوں ہی ظفر بھائی نے یہ بات بتائی تھی میرے آنکھوں کے سامنے اسداللہ بھائی کی بیس بائیس برس پرانی تصویر گھوم گئی تھی۔ گورا رنگ، بلند قامت، بھرا ہوا جسم اور ہنستا، بے فکر خوبصورت چہرہ۔ میں ظفر بھائی سے ان کے بارے میں پوچھنے ہی والا تھا کہ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں دھیرے دھیرے کہا، ''اسد نہیں رہا... تم تو جانتے ہوگے۔'' اور میں ان کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر انھوں نے خود ہی بتایا تھا کہ اسد بھائی کو نہ جانے کیسے پیتھیڈین کی لت پڑ گئی تھی اور اسی نے انھیں ختم کر دیا تھا۔ جیتے جی ہی انھوں نے نہ صرف اپنے حصے کی ساری دولت لٹا دی تھی بلکہ بے حساب قرض بھی چھوڑ گئے تھے۔ ''اب ارمانہ دونوں لڑکیوں کے ساتھ بائیں طرف والے حصے میں رہ رہی ہیں،'' ظفر بھائی نے کہا تھا۔ ''کافی حصہ کرائے پر اٹھا دیا ہے۔ اسی سے چل رہا ہے سب کچھ،'' اور چپ ہوگئے تھے۔

باہر آکر ظفر بھائی نے کوٹھی کے الگ الگ حصے دکھلائے تھے۔ بیچ کے حصے میں ظفر بھائی رہتے تھے۔ انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ دائیں طرف رفعت میاں کا حصہ تھا اور بائیں طرف مرحوم اسد بھائی کا جس میں اب آپا بیگم، غزالہ اور فریال رہ رہی تھیں۔ ظفر بھائی کے ساتھ ہی آپا بیگم اور فریال سے ملنا ہوا تھا۔ آپا بیگم کو دیکھ کر اور ان کے سیدھے سادھے لباس کے باوجود یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ بیوہ ہیں۔ عمر اور قابلِ افسوس واقعات کے اثر کو پیچھے دھکیل کر بالکل نمایاں، دو ہیرے سی چمکتی آنکھیں جن میں دیکھنے کی میری ہمت نہیں ہوئی تھی۔ فریال بھی دیکھنے میں اتنی ہی خوبصورت تھی، مشکل سے پندرہ سولہ سال کی ایک خاموش طبع لڑکی، جو آپا بیگم کی بیٹی سے زیادہ ان کی چھوٹی بہن لگتی تھی۔

آپا بیگم والا حصہ کوٹھی کے دوسرے حصوں سے الگ تھا۔ بلکہ شاید ہی اسے مرادمنزل کا حصہ کہا جاسکتا تھا۔ کوٹھی کے بائیں طرف والے باہری حصے میں، تین کمروں اور ان سے گھرے ایک چھوٹے سے دالان کا یہ ایک بالکل معمولی سا گھر تھا۔ پیچھے کی طرف کھلنے والے دروازے میں ایک گندا سا پردہ پڑا ہوا تھا جسے دیکھ کر بالکل نہ چاہتے ہوئے بھی اس گھر، اس کے ماحول اور اس کی داخلی زندگی کے بارے میں ایک رائے بن گئی۔ دالان میں ہی ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی، جس کے پاس لکڑی کے ایک کھوکھے پر ایک سلائی مشین رکھی تھی اور آس پاس کپڑوں کی رنگ برنگی کترنیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس مشین کو دیکھ کر میری سمجھ میں آیا کہ میرا

کمرہ اس حصے سے لگا ہوا تھا۔

بہر حال، وہاں بھی کافی دیر بیٹھنا ہوا تھا۔ گفتگو کا سلسلہ پھر گذرے ہوئے ایام کی طرف چلا گیا تھا۔ اور اسی دوران جب آپا بیگم نے مجھ سے کہا، ''اب تو یقین نہیں ہوتا کہ بچپن میں تم کس قدر شریر تھے... تم اور غزالہ... توبہ... آفت کر دیتے تھے!'' تو میں نے پہلی بار ان کے چہرے کی طرف دیکھا تھا، اور اس کے بعد ایک ہلکی سی تصویر ذہن میں ابھر آئی تھی۔

ایک سرخ رخساروں والی گول مٹول سی لڑکی کی تصویر — غزالہ۔ پھر تو خود بخود جیسے کوئی پورا البم کھولتا چلا گیا... غزالہ فوارے کے نیچے بنے حوض میں کھڑی مجھ پر پانی پھینک رہی ہے... املی کے گھنے، سایہ دار درخت کے نیچے ہم دونوں بھری دوپہری میں کتارے چن چن کر کھا رہے ہیں... بہت سی اور تصویریں تھیں، لیکن ان میں سے کسی میں بھی غزالہ کا چہرہ صاف صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہاں سے لوٹنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ بچپن میں میں آپا بیگم کو چچی جان کہا کرتا تھا۔ لیکن لاکھ کوششوں کے بعد بھی نہ تو مجھے ان کا اُن دنوں کا چہرہ یاد آیا اور نہ ہی غزالہ کا۔ غزالہ آج کل کہیں نوکری کر رہی تھی، اس لیے اس وقت وہاں موجود نہیں تھی، یہ مجھے ظفر بھائی نے بتایا تھا۔ شام ہوتے ہوتے تو مجھ پر غزالہ کو دیکھنے کی ایک بے چینی سی سوار ہو گئی تھی۔ لیکن شاید غزالہ ابھی تک نہیں لوٹی تھی، کیوں کہ کچھ دیر پہلے تک رفعت میاں کے ڈرائنگ روم میں قریب قریب تمام لوگ بیٹھے بات چیت کرتے رہے تھے۔

اب ساڑھے دس بج رہے تھے۔ کل صبح جلدی اٹھنا ہوگا، مجھے یاد آیا۔ نوکری اور ایک نئی زندگی کی شروعات، لیکن نہ معلوم کیوں اس خیال سے کسی بھی تھرل کا احساس فی الحال نہیں ہو رہا تھا۔

بتی بجھانے کے ارادے سے میں اٹھا۔ یک بیک چاروں طرف نہ جانے کتنے سائے کھڑے ہو گئے۔ چاروں طرف، دیواروں کے آئینوں میں، میرے ہی بے شمار عکس مجھے دیکھ رہے تھے۔

کھڑکی بند کرنے کے لیے میں آگے بڑھا۔ برابر والے حصے سے آوازیں آ رہی تھیں۔

''ولایت سے لوٹا ہے۔ پہلے تو میں پہچان ہی نہیں پائی...'' آپا بیگم کی آواز تھی۔

''...''

''رفعت میاں ہی مہمان نوازی کر رہے ہیں۔ دوپہر کو خود ممتاز کمرہ صاف کر رہی تھی۔'' آواز میں اس بار ہلکا سا طنز تھا۔

''ہاں ہاں... وہ کیوں نہیں کریں گی...'' کسی لڑکی کی آواز تھی۔ ''رضوی سے اب طبیعت بھر گئی ہوگی نا ...اچھا ہے، نیا یار اور وہ بھی گھر بیٹھے...''

کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر آپا بیگم کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

''آج احسن آیا...''

''کیوں؟ کیا کہہ رہا تھا؟''

''پوچھ رہا تھا کہ تم دفتر کیوں نہیں آ رہی ہو؟''

''تم نے کیا کہہ دیا؟'' بہت بیزار سی آواز تھی۔

''میں کیا کہتی؟'' آپا بیگم جھنجھلاتی ہوئی بولیں۔ ''مجھ سے تو تو دفتر کا ہی کہہ کر جاتی ہے...''

''تو کیا پھر اشتہار چھپواؤں کہ کہاں جاتی ہوں، کیا کرتی ہوں...'' اچانک ہی آواز تیز ہوگئی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ غزالہ کی آواز تھی۔

کچھ دیر بعد پھر وہی آواز آئی۔ ''یہ لو... سو روپے ہیں۔ ذرا سنبھال کر خرچ کرنا۔'' اور اس کے بعد کافی دیر تک سناٹا دھڑکتا رہا۔ کھڑکی بند کر کے میں نے بتی بجھائی اور آ کر لیٹ گیا۔ بند آنکھوں میں جہاز کے کپتان کا سرخ داڑھی والا چہرہ ابھر آیا تھا۔ آنکھوں کا رنگ رہ رہ کر تبدیل ہونے لگتا تھا...

باہر ہوا تیز ہوگئی تھی۔ ایک عجیب سی آواز کانوں میں آ رہی تھی۔ شاید آم کے اکیلے درخت کی پتیاں کھڑکھڑا رہی تھیں یا شاید زمین پر پڑی ہوئی خشک پتیاں ہوا کے ساتھ ساتھ سرکتی چلی جا رہی تھیں۔ لگ رہا تھا جیسے میں پھر جہاز پر اپنے کیبن میں لیٹا ہوا ہوں اور رات کے سناٹے میں پانی کو چیرتا ہوا جہاز آگے بڑھ رہا ہے... قریب قریب ویسی ہی آواز، سناٹے سے اٹھ کر اسی میں گم ہوتی ہوئی۔ ایک دوسرا پرانا جہاز... لال داڑھی اور بھوری آنکھوں والا کپتان... پرانے بھاری مخملی پردوں کی کیپٹن کیبن... لگژری کلاس اور اس کی ایک کیبن میں رکھا ہوا رنگین، بلیلحین گلاس کا پرانا خوب صورت گلدان، اور اکانومی کلاس کے مسافر، آپا بیگم، فریال اور غزالہ، جن کے لیے سارے سفر کا مقصد صرف کسی طرح سمندر پار کرنا تھا...

صبح جب آنکھ کھلی تو نوکر چائے لے آیا تھا اور جگا رہا تھا۔ آٹھ بجے تھے۔ چائے پی کر جسم میں پھرتی آئی۔ ایک خوشگوار سا ہلکا پن محسوس ہو رہا تھا۔ کل دن بھر کی باتوں اور پرسوں کے سفر کی تھکان، نیند اپنے ساتھ بہا لے گئی تھی۔ فیکٹری کے آفس گیارہ بجے پہنچنا تھا۔ میں غسل خانے کی طرف بڑھا۔ نہانے کے بعد جب میں تیار ہو کر کمرے میں داخل ہوا تو یکبارگی ٹھٹک گیا۔ سامنے پلنگ کے پاس پڑی آرام کرسی پر ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے آپ میں بالکل محو، کچھ سوچتی ہوئی۔ دروازے کی آہٹ پر اس کی نظریں اٹھیں۔ بنا کچھ سوچے ہی میرا ہاتھ سلام کے لیے اٹھ گیا۔

''تسلیم!'' بڑی آسانی سے ایک رسمیہ مسکراہٹ کے ساتھ وہ کھڑی ہوتی ہوئی بولی، ''میں غزالہ...''

''ارے تم...'' بالکل بے ساختہ منہ سے نکل گیا۔ لیکن پھر میں کچھ اور نہ کہہ سکا۔

ایک پشیمان سی خاموشی گھر آئی تھی۔ غزالہ کے چہرے پر ایسا تاثر تھا گویا ہم بیس سال بعد پہلی بار ملنے کی بجائے صرف چند گھنٹوں بعد مل رہے تھے۔ برسوں ساتھ رہنے اور روزانہ ملتے رہنے سے جو ایک نہایت سادی اور مترنم سی بے نیازی دو افراد کے درمیان پیدا ہو جاتی ہے، بالکل وہی کیفیت اس وقت ہم دونوں کی تھی۔

''بیٹھو نا،'' کچھ دیر بعد میں نے کہا۔

''امی سے پتا چلا کہ تم آئے ہو،'' کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

''ہاں۔ کل تم کہیں گئی ہوئی تھیں اس وقت۔''

''ہاں۔'' بس ایک لفظ کا جواب تھا۔

شاید میں کہنا چاہتا تھا کہ میں نے باقاعدہ اس کا انتظار کیا تھا، لیکن پھر ہمت نہیں ہوئی۔

''آج سے جوائن کر رہے ہو؟'' کچھ دیر بعد اسی معمولی لہجے میں اس نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''اور... دلی میں سب لوگ اچھی طرح ہیں؟'' کچھ دیر بعد پھر وہی ایک فاصلے پر کھڑی ہوئی سی آواز تھی۔

''ہاں، سب ٹھیک ہیں،'' میں نے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''امی تمھیں یاد کر رہی تھیں۔''

وہ چپ رہی اور تھوڑی دیر بعد وہ کھڑی ہو گئی۔ ''اچھا... پھر، تمھیں جلدی بھی پہنچنا ہوگا...''

ایک لمحے کے لیے میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنی ساڑھی کا آنچل ٹھیک کر رہی تھی۔

''ہاں... پھر ملنا ہوگا،'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہوں...'' اور بغیر نظریں ملائے وہ چلی گئی۔

میں پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا اور اس کرسی کو گھورنے لگا۔ پچھلی رات کی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر سنی ہوئی ساری بات جیت دماغ میں گھومنے لگی۔ بار بار وہی آوازیں... آپا بیگم کی اور اس لڑکی کی... غزالہ کی۔

کچھ دیر بعد جب کھڑکی کے باہر نظر گئی تو دیکھا کہ اتنی ہی دیر میں دھوپ کے چمکتے ہوئے اجلے پن میں دوپہر کا سا ٹھہراؤ اور خالی پن بھر گیا تھا۔

نوکر نے آ کر خبر دی کہ ظفر بھائی ناشتے کے لیے یاد کر رہے ہیں۔ ضروری کاغذات کی فائل لے کر میں نوکر کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکلا۔ کوٹھی کے الگ الگ حصے تقسیم ہو جانے کی وجہ سے شاید اندر کے

بہت سے راستے بند کر دیے گئے تھے کیوں کہ ڈرائنگ روم کے ذریعے ہی ہم لوگ ڈائننگ روم تک پہنچے۔ ایک کافی لمبا سا کمرہ تھا، ٹیوب لائٹ کی روشنی سے بھرا ہوا۔ ایک بڑی ڈائننگ ٹیبل کے دوسرے سرے پر ظفر بھائی اکیلے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے اخبار رکھ دیا اور مسکراتے ہوئے بولے، ''آؤ بھائی، کہو، سوئے خوب؟''

''جی، بالکل بے خبر،'' میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور ان کی پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

انھوں نے نوکر کو آواز دیتے ہوئے کہا، ''بوا سے کہو، ناشتہ بھیجیں۔'' پھر مجھ سے بولے:

''تم تو بالکل تیار ہو گئے۔ کیا ابھی جانا ہے؟''

''جی نہیں، ابھی تو نہیں۔ سوچا پھر یہیں سے نکل جاؤں گا۔''

''ہاں، ٹھیک ہے۔ ٹیکسی یہیں منگوالیں گے۔'' پھر کچھ سوچ کر انھوں نے کہا، ''یا تم چاہو تو گاڑی لے جاؤ۔''

''جی نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔'' ڈرائنگ روم میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''میں ابھی آیا'' کہہ کر ظفر بھائی اٹھ گئے۔

میری نظریں سامنے کی طرف اٹھ گئیں۔ دیوار کے بیچوں بیچ فرش سے لے کر چھت تک ایک کافی بڑا سالم شیشہ لگا ہوا تھا، قریب پانچ چھ فٹ چوڑا۔ یہاں بیٹھے بیٹھے ہی اس کی دوسری طرف ایک چھوٹا سا سوئمنگ پول نظر آ رہا تھا۔ میں اٹھ کر وہاں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اب سارا منظر صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ سوئمنگ پول کے چاروں طرف سیمنٹ کی ڈیڑھ فٹ اونچی جالیاں لگی ہوئی تھیں جن میں سے شاید ہی کوئی ثابت بچی تھی۔ بیچ بیچ میں سے کئی جالیاں تو بالکل ہی اکھاڑ دی گئی تھیں۔ دوسرے سرے پر ٹوٹا ہوا ایک کبڑا سا مینار کھڑا تھا، یہاں وہاں سے جس کا اکھڑا ہوا پلاسٹر بالکل زخموں کی مانند لگ رہا تھا۔ کبھی ڈائیونگ ٹاور رہا ہوگا، میں نے سوچا۔ شاید برسات کا پانی پول میں بھرا ہوا تھا جس کے اوپر کائی کی ایک مخملی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ کوئی چیز تھی جس پر نظریں اٹک گئی تھیں۔

غور سے دیکھا تو ایک مرا ہوا سانپ پانی میں پڑا ہوا تھا۔ سوئمنگ پول کے پیچھے کچھ فاصلے پر سیمنٹ کا بنا ہوا ایک ٹینس کورٹ تھا جس میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ گئی تھیں اور بیچ بیچ میں جنگلی گھاس جھاڑیوں کی شکل میں اگ آئی تھی۔ ٹینس کورٹ کے پیچھے کافی دور تک پھیلی ہوئی اجڑی زمین تھی جس میں کچھ دور پر بے مقصد سی کھڑی ہوئی ایک شکستہ فصیل تھی۔

قدموں کی آواز سن کر میں مڑا۔ ظفر بھائی کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ میز پر ناشتہ لگایا جا رہا تھا۔

ہم دونوں انھیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''بڑے خاص ڈھنگ کا شیشہ ہے،'' آملیٹ کاٹتے ہوئے ظفر بھائی نے شیشے کی طرف اشارہ کر کے کہا، ''ہمارے دادا مرحوم کی رنگین مزاجی کی نشانی... کمرے سے باہر کا سب کچھ نظر آتا ہے لیکن باہر سے اندر کا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔'' اور وہ ہنس پڑے۔ میں مسکرا کر رہ گیا۔

ظفر بھائی نے اب تفصیلات شروع کر دی تھیں اس زمانے کی... کیسے انگریز بہادر کی قوم ان دنوں مرادمنزل کی مہمان رہا کرتی تھی... ''آٹھ دس لوگ جب تک مہمان نہ ہوں، دادا میاں ٹھیک سے کھانا نہیں کھا پاتے تھے... اور اب، تصور کیجیے اُن دنوں کے عالم کا جب یہاں دعوتیں ہوا کرتی تھیں اور وہاں حوریں غسل کرتی تھیں...'' ظفر بھائی کی آواز پانی میں چمکتی رنگ برنگی مچھلی کی طرح چلی جا رہی تھی، ہلکے ہلکے سے خم لیتی ہوئی۔ یادِ ماضی، فخر، طنز، رہ رہ کر ایک نیا رنگ چمک اٹھتا تھا۔

وہی خمیدہ کمر ضعیفہ جسے میں نے کل سب سے پہلے دیکھا تھا، باورچی خانے کی طرف سے ہاتھ میں ایک پیالہ لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ ظفر بھائی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بولے، ''آؤ بوا!'' پھر مجھ سے بولے، ''تم نے تو نہیں پہچانا ہوگا؟ حلیمہ بوا!... انھوں نے تو تمھیں گود میں کھلایا ہے۔'' اور وہ ہنسنے لگے۔

''ارے ہاں میاں، بالکل کھلایا ہے،'' حلیمہ بوا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے سلام کیا اور پھر دھیرے سے بولا، ''معاف کیجیے گا بوا، میں کل پہچان نہیں پایا۔''

''جیتے رہو، ارے نہیں بیٹا... میں تو خود ہی نہیں پہچان پائی۔ اللہ بنائے رکھے تجھے۔ قسم سے جب ظفر میاں نے مجھے بتایا تو بے انتہا خوشی ہوئی...'' بوڑھی آواز گلے میں پھنستی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ وہ پیالہ انھوں نے میری طرف بڑھایا۔ ''لے بیٹا، کھالے۔ بڑا مبارک دن ہے آج۔ خدا تیری قوم کو بڑھائے۔''

میں نے دیکھا پیالے میں نذر کی شیرینی تھی۔

''شکریہ بوا،'' میں نے کہا اور کھانے لگا۔

ظفر بھائی مسکرا رہے تھے۔ ان کی بھوری سی آنکھیں...

قریب قریب دو ہفتے گذر چکے تھے۔ زندگی میں پھر ایک سلسلہ واپس لوٹ آیا تھا۔ آفس کے بعد زیادہ تر وقت حالانکہ مرادمنزل میں ہی گذرتا تھا لیکن بالکل مہمان کی طرح وہاں رہنے کا احساس اب ختم ہو گیا تھا۔ شروع کے دو دن جو بے چینی محسوس ہوتی رہی تھی، وہ اب ختم ہو گئی تھی، یار گوں میں سما گئی تھی، شہری زندگی کی مسلسل بھنبھناہٹ جیسی آواز کی طرح۔

کئی شامیں ظفر بھائی کے ساتھ ہی گذری تھیں۔ ان کے بہت سے دوستوں سے ملنا ہوا تھا۔ دراصل

شام ہوتے ہی مراد منزل کے سامنے تین چار گاڑیاں آ کر کھڑی ہو جاتی تھیں ان کے دوستوں کی۔ ڈرائنگ روم کی کیفیت بدل جاتی تھی۔ تیز روشنی کے سیلاب میں ظفر بھائی کے دوستوں کے قہقہے رہ رہ کر ڈوبتے ابھرتے رہتے۔ کافی رات گئے تک یہ سب چلتا رہتا، اور پھر جب بوڑھے کمرے کی پسلیاں ہنس ہنس کر دکھنے لگتیں تو وہ چپ چاپ اندھیرے میں لیٹ جاتا۔

ان محفلوں میں ظفر بھائی کا چہرہ جیسے بدل جاتا تھا۔ پہلے پیگ کے ساتھ ہی ان کے گورے رنگ میں ایک دھڑکتی ہوئی سی سرخی گھل جاتی تھی۔ دھیرے دھیرے ان کی آنکھیں کمرے میں سجے ہوئے شکار کے مردہ جانوروں کی آنکھوں کی طرح چمکنے لگتی تھیں۔ جس آسانی اور بے ساختگی کے ساتھ میں ان محفلوں میں شریک کر لیا گیا تھا اس پر مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی۔ شراب سے مجھے پرہیز نہیں، یہ بات بھی ظفر بھائی نے میرے بتائے بغیر ہی جان لی تھی۔ چند ہی دنوں میں شاموں کو میری فرمائش ہونے لگی تھی۔ پچھلے تین چار روز سے کھانا بھی متواتر ظفر بھائی کے ساتھ ہی ہو رہا تھا۔ البتہ اس بیچ دو بار میں نے رفعت میاں اور بھابی جان سے ملنے کی کوشش کی تھی۔ پہلی بار تو صرف بھابی جان سے ہی ملاقات ہوئی تھی اور تھوڑی دیر بیٹھ کر میں چلا آیا تھا۔ دوسری بار میں دروازے تک جا کر چپ چاپ لوٹ آیا تھا کیوں کہ اندر سے بھابی جان کی غصے سے کانپتی ہوئی آواز باہر تک سنائی دے رہی تھی۔ صرف کچھ باتیں ہی میں نے دھیان سے سنی تھیں: ''بڑے مرد بنے پھرتے ہو۔ جائیداد تک تو رکھی نہیں گئی... دنیا تھوکتی ہے کہ بیوی کی نیم پلیٹ لگا کر رہتے ہو۔ اور وہ تو میری ہی عقل تھی کہ میں نے سب کچھ اپنے نام کرا لیا، نہیں تو میاں سڑکوں پر ٹھوکریں کھاتے پھرتے... بڑے آئے ہیں بیوی کو قابو میں رکھنے والے...''

اس کے بعد میری وہاں کھڑے رہنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

آج سنیچر تھا۔ میں نے خود ہی سوچ رکھا تھا کہ آج کی شام رفعت میاں کے ساتھ گذاروں گا۔ لیکن آفس سے لوٹتے ہوئے رفعت میاں سے پورچ میں ہی ملاقات ہو گئی اور انھوں نے خود بھی بڑے اصرار سے کھانے کے لیے کہا۔ یہ ایک عجیب بات تھی لیکن رفعت میاں جب بھی مجھ سے اکیلے میں ملتے تھے بے حد خلوص اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اس وقت نہ جانے مجھے کیوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دونوں ایک خاص ڈھنگ سے تیار ہو کر مجھ سے ملتے تھے، بات چیت وغیرہ کرتے تھے۔ کتنی ہی چیزیں گویا میری موجودگی کی وجہ سے بدل دی جاتی تھیں— بات چیت کا انداز، نظریں، چہرے۔ ایک عجیب سا چوکنا پن ماحول میں بھر جاتا تھا۔

کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے جب میں وہاں پہنچا تو رفعت میاں اپنے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ بیگم صاحبہ بھی، جن کو میں نے اب بھابی جان کہنا شروع کر دیا تھا، وہاں موجود تھیں۔

''بیگم، کوئی خریدنے والا بھی تو...'' رفعت میاں کہہ رہے تھے۔

لیکن مجھے دیکھ کر ایک دم چپ ہوگئے۔ پھر مسکراتے ہوئے بولے، ''آؤ آؤ میاں، آ جاؤ'' انھوں نے اپنے پاس والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ان کا چہرہ بدل گیا تھا۔ بھابی جان کو سلام کرتے ہوئے میں بیٹھ گیا۔

''وہاں کھانے کے لیے تو منع کروادیا ہے نا؟'' انھوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''میاں، آپ کے لیے بیگم آج خود ران پکا رہی ہیں،'' رفعت میاں نے مسکرا کر کہا۔

''آج تو بھوک بھی بڑے زور کی لگی ہے۔ اور اب تو...'' میں ہنس پڑا۔ ساتھ ہی وہ دونوں بھی ہنس دیے۔

''کوئی خاص بات چیت کر رہے تھے کیا آپ لوگ؟ اگر ایسا ہو تو...'' کچھ دیر بعد میں نے رفعت میاں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ارے نہیں، ضروری کچھ نہیں،'' بھابی جان نے جواب دیا۔ ''گاڑی کے بارے میں کہہ رہی تھی میں۔ بالکل بے کار پڑی ہے۔ اس سے اچھا ہے بیچ دی جائے۔''

''جی...'' میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ نظروں کے سامنے پورچ میں کھڑی ہوئی کالی بیوک گھوم گئی۔ آج صبح ہی کافی دیر تک کھڑا میں اسے دیکھتا رہا تھا۔ یوں آتے جاتے ہمیشہ ہی نظریں اس پر پڑتی تھیں لیکن اتنے دھیان سے اسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پورچ کے بیچوں بیچ نہ جانے کب سے وہ ویسے ہی کھڑی تھی۔ جگہ جگہ کالے رنگ کے نیچے سے جھانکتے ہوئے لال اینٹ جیسے رنگ کے چھوٹے بڑے دھبے، چٹا ہوا ونڈ اسکرین، پرندوں کی سوکھی بیٹ سے چھترائی ہوئی چھت کی چادر اور پچکے ہوئے ٹائروں پر دھول کی ایک موٹی تہہ۔ ''بیوک ایٹ''، سامنے نکل کے گرِل فرنٹ کے اوپر انگریزی کے لفظوں پر وصول اور میل جم گئی تھی۔

''بھئی سوال یہ ہے کہ اب نواب یا راجے مہاراجے تو رہے نہیں۔ تو پھر کون خریدے ہاتھی کو،'' اتنی دیر کی خاموشی کے بعد رفعت میاں نے مسکراتے ہوئے کہا اور میری طرف دیکھ کر زور سے ہنس دیے۔

میں دھیرے سے مسکرایا۔

''خیر، چھوڑیے...'' اس بار بھابی جان بولیں۔ ''یہ بتائیے کل کا کیا پروگرام ہے آپ کا؟'' انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

''کچھ خاص نہیں۔ کل تو چھٹی ہے۔''

''ہاں، اسی لیے تو۔ پکچر کا پروگرام بن رہا ہے۔ آپ بھی چلیے۔ سنا ہے بہت اچھی فلم ہے۔''

''ضرور، ویسے ہی کافی دن ہو گئے کوئی اچھی فلم نہیں دیکھی،'' میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر تک ویسے ہی بات چیت چلتی رہی۔ پھر بھابی جان باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ ہم دونوں باتوں میں مشغول رہے۔

باہر کسی نے کال بیل بجائی۔ رفعت میاں اٹھ کر باہر چلے گئے۔ مجھے کچھ نہیں سوجھا تو پاس کی الماری میں رکھے ہوئے ایک بڑے سے البم کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔ رفعت میاں کی شادی کی تصویروں کا البم تھا۔ قاعدے سے لگی ہوئی تصویروں کے نیچے سفید روشنائی سے لکھے ہوئے موزوں اشعار اور عبارتیں تھیں۔ میں البم کے صفحے پلٹتا جا رہا تھا کہ اچانک ایک تصویر پر نظریں ٹھہر گئیں۔ رفعت میاں تصویر میں سہرا پہنے کھڑے تھے۔ ان کے ایک طرف ظفر بھائی تھے اور دوسری طرف اسد بھائی — وہی لمبا چھرا ہوا جسم اور خوبصورت بے فکر چہرہ۔ ''پیتھیڈین!'

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' کمرے میں واپس آتے ہوئے رفعت میاں نے پوچھا۔ پھر البم دیکھ کر بولے، ''اچھا، ہاں، تم تو شادی پر بھی نہیں تھے۔ بس سرفراز آئے تھے۔''

''جی ہاں،'' میں نے البم بند کرتے ہوئے کہا۔ ''تصویریں بے حد اچھی کھنچی ہیں۔''

''ارے یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ تم نے موویز نہیں دیکھیں، پوری شادی کور کی تھی۔ بڑی زوردار آئی تھیں،'' رفعت میاں نے مسکرا کر کہا۔

''کیا ہیں یہیں؟'' میں نے دریافت کیا۔ نہ جانے کیوں میں انھیں دیکھنا چاہتا تھا۔

''ہاں ہاں... سب ہیں،'' انھوں نے جواب دیا۔ ''ایسا کرو، کھانے کے بعد پروگرام رکھا جائے۔ پھر آرام سے دیکھنا۔ ٹھیک ہے؟''

''جی ہاں، وہ ٹھیک رہے گا۔''

''لیکن تمھیں ذرا مدد کرنی پڑے گی،'' رفعت میاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''صندوق وغیرہ اٹھوانا پڑے گا۔''

''یہ صحت کب کام آئے گی،'' میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

''تو میرا خیال ہے پھر نکال ہی لیا جائے ساز و سامان، ورنہ پھر کھانے کے بعد تو مشکل ہوگی۔''

''جی ہاں، یہ بہتر رہے گا۔''

رفعت میاں کے ساتھ میں اندر کی طرف چل پڑا۔ بیڈروم سے ہی لگا ہوا ایک اور کمرہ تھا۔ دروازہ کھول کر رفعت میاں نے کئی بار دیوار میں لگے سوئچ کو اوپر نیچے کیا۔ پھر ''شاید بلب فیوز ہو گیا ہے،'' کہہ کر

وہ موم بتی لینے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد موم بتی کی کمزور روشنی میں میں نے دیکھا کہ وہ ایک بہت چھوٹا سا اسٹور روم تھا جس میں بہت سارے صندوق ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ رفعت میاں نے ایک خاص، لکڑی کے صندوق نما بکسے کی طرف اشارہ کر کے کہا، ''یہ ہے میاں۔ ذرا ہاتھ لگاؤ۔'' بکسا زیادہ بھاری نہیں تھا، پھر بھی ہم دونوں اسے ڈرائنگ روم تک اٹھا کر لائے۔ دھول کی ایک موٹی تہہ بکسے کے چاروں طرف اور اوپر جمی ہوئی تھی۔ رفعت میاں نے ایک کپڑا لے کر اسے صاف کیا اور پھر کھولتے ہوئے بولے، ''میرے خیال سے اسی میں ہونی چاہییں سب۔''

بکسے میں سب سے اوپر ایک طرف ایک کافی پرانا پروجیکٹر رکھا ہوا تھا۔ رفعت میاں نے اسے اٹھا کر اس پر جمی گرد کو جھاڑتے ہوئے کہا، ''تیس سال ہو گئے سوچو، اس پروجیکٹر کو۔ اور وہ تو یار دوستوں نے یہ حالت کر دی، ورنہ بے حد نفیس چیز تھی۔ کوڈک ہے۔ ابا نے خاص طور پر ہم لوگوں کے لیے منگوایا تھا۔ باقاعدہ اسکرین وغیرہ سب تھا۔ لیکن ہمارے ایک یار ہیں، وہ لے گئے تھے اور پھاڑ کر واپس کیا۔''

رفعت میاں اس کا اسپول وغیرہ فٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخر کار اسے پاس والی میز پر رکھتے ہوئے بولے، ''چلو، کام تو چلے گا۔ ذرا پکڑنا پڑے گا ہاتھ سے...''

اس کے بعد موویز کے ڈبوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ میں نے دیکھا بکسا موویز کے ڈبوں سے بھرا ہوا تھا۔ زیادہ تر بچوں کے مطلب کی کارٹون یا فیری ٹیلز فلمیں تھیں، جو شاید اسی زمانے میں ابا حضور نے خریدی ہوں گی۔

کافی دیر بعد رفعت میاں نے چھ موویز چھانٹ کر الگ نکالیں اور بکسے کو ایک طرف سرکا دیا۔ تبھی بھابی جان کمرے میں داخل ہوئیں۔ ''چلیے کھانا تیار ہے،'' انھوں نے کہا۔ پھر پروجیکٹر کو دیکھتے ہوئے بولیں، ''کیا اب فلمیں دیکھی جائیں گی؟''

''کھانے کے بعد کا پروگرام ہے،'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''چلیے، آیئے پھر...''

اور ہم لوگ ڈائننگ روم میں آ گئے۔ ڈائننگ ٹیبل بڑے قرینے سے سجی ہوئی تھی۔ سفید کلف لگا ہوا میز پوش، چاندی کے گلاسوں میں پھولوں کی شکل میں موڑ کر رکھے ہوئے نیپکن۔ کراکری البتہ پرانی تھی لیکن بہت اچھی قسم کی تھی۔ شاید بلیو بینڈ، میں نے اندازہ لگایا۔ چاندی کی کٹلری قاعدے سے تین پلیٹوں کے آس پاس رکھی ہوئی تھی۔ میرے منھ سے نادانستہ ہی سوال نکل گیا: ''بچے نظر نہیں آ رہے ہیں؟''

''وہ لوگ اپنی ممانی کے یہاں گئے ہوئے ہیں۔ کل آئیں گے،'' بھابی نے جواب دیا۔ پھر مسکرا کر بولیں، ''اسی وجہ سے تو تھوڑا سکون ہے۔ نہیں تو ان لوگوں کے رہتے کھانا پکانا تو دور، ٹھیک سے کھانا کھانا بھی

دشوار ہو جاتا ہے۔''

رفعت میاں ٹیبل کے ایک سرے پر میزبان والی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ میں ان کی دائیں طرف والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بھابی جان میز پر کھانا لگا رہی تھیں۔ میری نظریں میز پر رکھی کٹلری کو دیکھنے لگی تھیں۔ چاندی کی چیزوں کے بیچ دو چمچ اسٹیل کے تھے جو بالکل الگ چمک رہے تھے۔ میں نے جلدی سے نظریں ہٹا کر رفعت میاں کی طرف دیکھا۔ ان کی نظریں انجانے میں انھیں چمچوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ میں بے مقصد اپنے سامنے رکھی پلیٹ کو گھمانے لگا۔

''لیجیے، شروع کیجیے'' کچھ دیر بعد بھابی جان میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ میں نے نظریں اٹھائیں تو دیکھتا رہ گیا۔ میز بالکل بھری ہوئی تھی طرح طرح کی چیزوں سے۔ بھابی جان نے سچ مچ کافی محنت کی ہوگی۔ ''اب تو لگتا ہے روز یہیں کھانا کھانا پڑے گا'' کچھ دیر بعد میں نے مسکراتے ہوئے بھابی جان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''رہنے دیجیے۔ اس کے لیے تعریف کی ضرورت نہیں ہے۔'' ان کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

''تعریف تو اس لیے بھی مشکل ہے کہ آپ سامنے موجود ہیں۔'' میں ہنس پڑا۔

''نہیں بھئی، کھانا آج واقعی کمال کا بنا ہے بیگم'' اس بار رفعت میاں نے ہڈی سے بوٹی الگ کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا، بس رہنے دیجیے۔'' بھابی جان کے چہرے پر ایک نازک سی گلابی مسکراہٹ چھا گئی تھی۔ کچھ دیر بعد انھوں نے دھیرے سے کہا، ''دراصل اب عادت چھوٹ گئی ہے ورنہ پہلے تو سچ مچ مزہ آتا تھا کھانا پکانے میں۔ ان کے دوست احباب اکثر آتے تھے... اور سب لوگ ان سب چیزوں میں...''

گذرے دنوں کا ذکر کرتے ہوئے بھابی جان کی آنکھیں اور زیادہ کالی ہو چلی تھیں۔

کھانے کے بعد ہم لوگ ڈرائنگ روم میں واپس آ گئے۔ بھابی جان پان لگانے لگی تھیں۔ رفعت میاں پروجیکٹر کے پیچھے والے صوفے پر بیٹھ کر اس میں فلم وغیرہ لگانے میں مشغول ہو گئے۔ کافی دیر تک سامنے والی دیوار پر پروجیکٹر کی روشنی کا ایک چوکور ٹکڑا کانپتا رہا۔ آخر کار فوکس ٹھیک ہوا اور رفعت میاں نے پان منھ میں رکھتے ہوئے کہا، ''ہاں بھائی، اب جما معاملہ۔ میاں تم ادھر آ جاؤ۔'' پھر بھابی جان سے بولے، ''بیگم، تم بھی ادھر ہی آ جاؤ۔'' ہم تینوں اب ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔ پروجیکٹر آن کر کے رفعت میاں نے بتی بجھا دی۔ اور سامنے کی دیوار پر پھر ویسا ہی رنگین سا دھند لکا ابھر آیا۔ اس کے بعد اس کی جگہ ایک تصویر نے لے لی۔ ہلکے پیلے رنگ کی دیوار پر تصویروں کا عکس زیادہ اچھا نہیں تھا، لیکن پھر بھی چہرے وغیرہ

صاف صاف نظر آ رہے تھے۔

''اچھا، شادی والی ہے،'' بھابی جان نے کہا۔ پھر دھیرے سے بولیں، ''ارے اسے کیا دکھا رہے ہو۔''

''بھئی یہ شادی پر کہاں تھے؟'' رفعت میاں نے جواب دیا اور پھر مجھ سے کہنے لگے۔

''یہ دیکھو... پہچانتے ہو انھیں؟ نواب رام پور ہیں۔ یہ بھی آئے تھے شادی میں... یہ اسد بھائی ہیں۔ ریسیو کر رہے ہیں...''

میری آنکھیں تصویر پر ٹک گئیں۔ اسد بھائی گہرے نیلے رنگ کی شیروانی پہنے، ہنستے ہوئے نواب صاحب کا خیر مقدم کر رہے تھے، بالکل کسی فلمی ہیرو کی طرح۔

دیوار پر تصویریں بدلتی جا رہی تھیں۔ رفعت میاں تبصرہ کرتے جا رہے تھے، ''یہ ظفر بھائی کو دیکھو... اور وہ پیچھے ابا کھڑے ہیں۔ کسی بات پر ناراض تھے ابا اس وقت... اور وہ دیکھو... ابا کے ساتھ وہ کھڑے ہیں... کیا نام ہے ان کا... ارے بڑی بھاری توپ تھے اس زمانے کے۔ ابا کے بڑے جگری تھے... اور یہ پارٹی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یہیں سامنے ہوئی تھی... باغ میں... یہ فوارہ دیکھ رہے ہو نا۔'' میری نظریں سچ مچ فوارے پر ٹھہر گئی تھیں۔ نیچے بنے حوض میں مچھلیاں تیر رہی تھیں — اسی حوض میں جس میں کھڑے ہو کر غزالہ... فوارے کی اونچائی کے بیچوں بیچ ایک چھتری سی بنی ہوئی تھی جس کی وجہ سے پانی ایک خاص ڈھنگ سے نیچے گر رہا تھا۔ چھتری کے نیچے، جیسے اس کو سنبھالتے ہوئے، پتھر میں تراشے گئے فرشتے تھے، جن کے پروں پر چھتری ٹکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

فوارے کی چھتری اب ٹوٹ چکی تھی۔ ساتھ ہی فرشتوں کے پر بھی۔

''یہ بیڈ روم دیکھو۔ اسد بھائی نے سجایا تھا... میاں نے گلاب کی پوری فصل خرید لی تھی کسی کاشتکار سے، صرف سجاوٹ کے لیے...''

سامنے رفعت میاں کا سہاگ والا بیڈ روم نظر آ رہا تھا۔ وہی کمرہ تھا جس میں میں کچھ دیر پہلے گیا تھا، لیکن بے شمار پھولوں اور گجروں سے سجا ہوا۔ سارے فرش پر گلاب کی پنکھڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔

''... یہ بیگم ہیں... ساتھ میں لبنیٰ اور وہ عرشی... اب تو دونوں بے چاری پاکستان میں ہیں... اچھا، یہ شاید ولیمے والے دن کی ہے۔ اسی کمرے میں لی تھی... دیکھو یہیں بیٹھی ہوئی ہیں جہاں تم بیٹھے ہو...''

سامنے بھابی جان کی تصویر تھی — ٹھیک اسی جگہ بیٹھی ہوئی، لال زری کی ساڑھی پہنے، بے حد خوبصورت، پتلی دبلی، نازک سی بھابی جان۔ اُن کے سامنے وہی گلاس ٹاپ ٹیبل رکھا ہوا تھا اور اس پر وہی بلجین گلاس کا خوب صورت گلدان، جس میں بڑے بڑے لمبی ٹہنیوں والے سرخ اور پیلے گلاب لگے ہوئے تھے۔ نازک، خوبصورت پھول۔

غیر ارادی طور پر میری نظر اپنے سامنے کچھ دور پر رکھی ہوئی گلاس ٹاپ میز پر چلی گئی۔ وہی میز تھی۔ اس پر لگے ہوئے شیشے میں دیوار پر پڑتی تصویروں کا ایک دھندلا ٹیڑھا میڑھا سا عکس پڑ رہا تھا۔ تصویریں بدلتی جا رہی تھیں، ساتھ ہی ان کی پرچھائیاں بھی، اور دھندلے، بھاگتے اور ایک دوسرے میں گھلتے ہوئے رنگوں کے پھیلاؤ کے بیچ گھرا ہوا وہی گلدان رکھا ہوا تھا— بیلجین گلاس کا بالکل خالی گلدان۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا جیسے اس عرصے میں بھابی جان کا چہرہ بھی اسی گلدان کی طرح خالی ہو گیا تھا۔ خوبصورت وہ اب بھی تھیں— وہی ناک نقشہ تھا، وہی گورا رنگ، لیکن کوئی چیز تھی جو اب معدوم ہو گئی تھی— لمبی ٹہنیوں والے سرخ اور پیلے گلابوں جیسی کوئی چیز۔

''...اور یہ ولیمے کی ہیں...'' رفعت میاں کہہ رہے تھے۔ ''یہ دیکھو، وہ نظام حیدرآباد کھڑے ہیں۔ اسد ہیں ان کے ساتھ...اور وہ ادھر سر رابرٹ ہیں...اور وہ...'' بہت سے مشہور و معروف نام رفعت میاں بتاتے جا رہے تھے۔ بعض چہروں کو میں پہچان رہا تھا کیوں کہ ان کی تصویریں پہلے کبھی اخباروں وغیرہ میں دیکھی ہوئی تھیں۔ اسد بھائی کا چہرہ بار بار بھیڑ کے بیچ الگ نظر آ جاتا تھا۔ تینوں بھائیوں میں ابا کی شخصیت اپنی پوری تیزی اور مزاج کے ساتھ اسد بھائی میں موجود تھی۔

''اور یہ درخت لگوا رہے ہیں ابا، بیگم سے...یہیں باغ میں...بہت سے درخت لگوائے تھے ابا نے۔ ہم سب نے لگوائے تھے...بس ایک ہی ٹھیک سے لگ پایا۔ وہ ادھر دیکھا ہوگا تم...تمھاری طرف پیچھے ایک آم کا درخت ہے نا...بس وہ...اسد میاں نے لگایا تھا...''

کچھ دیر تک صرف پروجیکٹر چلنے کی ایک عجیب سی آواز ہوتی رہی۔ پھر رفعت میاں کی آواز آئی، ''یہ بھی باغ کی ہیں...''

تصویر میں رفعت میاں اور بیگم باغ میں ٹہل رہے تھے۔

''...بھئی قسم سے، کیا عمدہ باغ تھا یہ ان دنوں۔ ولایتی گھاس تھی میاں، بالکل جیسے غالیچہ...اب تو جب سے ان سالے میونسپلٹی والوں نے پانی کے میٹر لگائے ہیں، تباہ کر دیا...''

میں چپ چاپ سن رہا تھا۔ اس کے بعد اور کئی موویز تھیں، پکنکوں کی، مہمانوں کی، شکار کی۔ ایک شاٹ جس میں رفعت میاں مردہ شیر کے اوپر ایک پیر رکھے کھڑے تھے، رائفل ٹکائے۔

''یہ میاں، آخری شیر مارا تھا،'' رفعت میاں نے بتایا۔

''جی،'' میں نے کہا۔

اور ساتھ ہی بھابی جان کی ایک طنزیہ سی ''اونہہ'' ابھر آئی۔ اس کے ساتھ ہی بتی جل گئی۔

''لیجیے میاں...'' رفعت میاں مسکرا رہے تھے۔

''بہت زور دار موویز ہیں،'' مجھے کہنے کے لیے اور کچھ نہیں سوجھا۔ رفعت میاں پروجیکٹر اور فلموں کو سنبھالنے لگے۔ میں نے بھابی جان کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے وہ چونک سی گئیں اور پھر ایک شرمیلی سی افسردہ مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل گئی۔

کچھ دیر تک رفعت میاں بہت سی اور باتیں کرتے رہے، اسی زمانے کی۔ بھابی جان زیادہ تر وقت چپ چاپ ہی رہیں۔ میں بھی چپ چاپ رفعت میاں کی باتیں سنتا رہا۔ دھیرے دھیرے انھیں بھی جمائیاں آنے لگیں۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ بارہ بج چکے تھے۔

''اچھا پھر،'' میں نے دھیرے سے کہا، ''اب چلوں۔ کافی دیر ہوگئی۔''

''ہاں، ویسے بھی بہت دنوں بعد اتنی فرصت سے بیٹھنا ہوا آج،'' رفعت میاں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''اچھا پھر...''

میں ان دونوں کو شب بخیر کہہ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی، بے ہوش سی۔

میں نے ایک بار سوچا کہ کمرے کی طرف چلوں، لیکن پھر لگا کہ ابھی نیند نہیں آئے گی۔ میں دھیرے دھیرے پورچ کے سامنے، کچھ ہٹ کر، فوارے کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا۔ سامنے زمین میں دھنسی ہوئی سی بیوک کھڑی تھی، پورچ کے اندھیرے میں۔ بائیں طرف نیچے سڑک کے اس پار جھیل نظر آ رہی تھی، دور تک پھیلی ہوئی، چاندی کی چمکتی ہوئی چادر کی طرح۔ دائیں طرف والے لمبے برآمدے میں تھوڑی تھوڑی دور پر چاندنی کے ٹکڑے بچھے ہوئے تھے، مردہ جانوروں کی نرم روئیں دار کھال کی طرح۔ برآمدے میں ہی ایک کھمبے کے پاس ایک ڈیک چیئر پڑی تھی، بالکل خالی۔ جہاز میں اوپر والی ڈیک پر ایک بوڑھا جرمن ہمیشہ ایسی ہی ڈیک چیئر پر بیٹھا رہتا تھا، دور دور تک پھیلے سمندر کی طرف دیکھتا ہوا۔ کچھ دنوں بعد ہم دونوں میں دوستی ہوگئی تھی۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں وہ اکثر بڑی خوبصورت باتیں کیا کرتا تھا۔ ایک بار سمندر کے بدلتے ہوئے رنگوں کے بارے میں میں نے کچھ کہا تھا۔ سمندر دن میں کئی بار رنگ بدلتا تھا— کبھی ہرا، کبھی نیلا، کبھی خاکستری، کبھی آسمانی اور کبھی بالکل کالا۔ جواب میں بوڑھے جرمن نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر اپنی اسی انگریزی میں کہا تھا، ''اِٹ از دا کلر آف دا اسکائے دیٹ چینجز ینگ مین، ناٹ آف دا سی...''

چھٹی کا دن تھا۔ ظفر بھائی اور رفعت میاں صبح سے ہی کسی میت میں شرکت کرنے کے لیے چلے گئے تھے۔ اب دوپہر ہو چلی تھی۔ سردی کچھ زیادہ ہی تھی یا شاید کمرے میں رہنے کی وجہ سے زیادہ محسوس ہو رہی

تھی۔

ناول لے کر باہر دھوپ میں بیٹھنے کے ارادے سے میں کوٹھی کے پچھواڑے کی طرف نکل آیا تھا۔ کچھ دنوں پہلے ہی بے مقصد گھومتے ہوئے میں نے یہ حصہ دیکھا تھا۔ آپا بیگم اور غزالہ والے حصے کے ٹھیک پچھواڑے، یہ ایک اجاڑ سا حصہ تھا جس میں ایک طرف کونے میں کسی زمانے کے اصطبل کی ٹوٹی ہوئی دیواروں اور شہتیروں وغیرہ کا ایک ڈھیر تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر گھوڑوں کو نہلانے کے لیے ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں اب کوڑے کرکٹ کا ایک بڑا سا ڈھیر تھا، اور اس سے کچھ فاصلے پر ایک بہت پرانا، بہت بڑا املی کا درخت تھا جس کے چاروں طرف ایک پکا گول چبوترا بنا ہوا تھا۔ پاس ہی ایک کٹے ہوئے درخت کا کافی بھاری بھرکم تنا پڑا ہوا تھا۔ میں اسی پر بیٹھ کر ناول پڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک مناسب سا حصہ دیکھ کر میں اسی تنے پر نیم دراز ہو گیا۔ دھوپ بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے میری نظریں آسمان پر ٹک گئیں — بالکل صاف نیلے رنگ کی وسعت۔

ناول پڑھتے پڑھتے ہی کچھ دیر بعد محسوس ہوا جیسے آس پاس کچھ حرکت سی ہو رہی ہے۔ میں نے گردن گھمائی تو دیکھا سامنے کافی دور آپا بیگم والے حصے کے پچھلے دروازے کو کھول کر غزالہ باہر نکلی تھی۔ شاید وہ نہا کر آئی تھی، کیوں کہ پھر وہ پاس ہی ایک بڑے پتھر پر اس طرف پیٹھ کر کے اپنے بالوں کو پھیلا کر بیٹھ گئی۔ غزالہ کے بال بے حد لمبے تھے۔

غزالہ سے اس بیچ بس ایک بار اور ملنا ہوا تھا۔ آپا بیگم نے اس روز کھانے پر بلایا تھا تو غزالہ بھی موجود تھی۔ اسی طرح کی معمولی رسمی بات چیت اس روز بھی ہوئی تھی۔ غزالہ کا انداز بالکل وہی تھا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ تر وقت میں آپا بیگم اور فریال سے ہی بات چیت کرتا رہا تھا۔

البتہ اس اثنا میں غزالہ کو دیکھا کئی بار تھا۔ دو تین بار اس کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ بلکہ پچھلی رات جب غزالہ کی آواز میرے کانوں میں پڑی تھی تو کافی دیر تک بھاری خاموشی جیسے میری نسوں میں گھل گئی تھی اور دیر تک خون کے ساتھ ساتھ گردش کرتی رہی تھی۔ غزالہ نے شاید آپا بیگم سے کہا تھا، اونچی آواز میں، تقریباً چیختے ہوئے، ''تو تم کیا سمجھتی ہو، تمھاری سلائی مشین سے گھر چلتا ہے؟ اور پھر تم تو جیسے سچ مچ میرا نکاح پڑھوا دو گی جو تمھیں میرے چال چلن کی اب اتنی فکر ہو گئی ہے!'' غزالہ کا وہ جملہ جیسے میرے ذہن میں بہت سی تصویروں کے نیچے ایک عبارت کی طرح چپک گیا تھا۔ پچھلے دنوں میں کئی بار ایسا ہوا تھا کہ کافی رات گئے کوئی گاڑی مراد منزل کے باہر آ کر رکتی تھی اور اس میں سے غزالہ اتر کر چپ چاپ گھر میں داخل ہو جاتی تھی — ہر بار کوئی نئی گاڑی...

بہرحال رات کو جیسے اس جملے میں مجھے غزالہ کے متعلق اپنے سارے سوالوں کے جواب مل گئے

تھے۔اس کے بعد بھی کافی دیر تک آوازیں آتی رہی تھیں، چیختی ہوئی آوازیں...

یہ ایک عجیب بات تھی لیکن اتنے دنوں کے دوران میں نے یہ کئی بار محسوس کیا تھا کہ مراد منزل کے زیادہ تر لوگ اکثر بات کرتے ہوئے چیخنے لگتے تھے۔ظفر بھائی اور رفعت میاں سے لے کر بھابی جان، غزالہ، یہاں تک کہ حلیمہ بوا کو بھی اکثر میں نے ذرا ذرا سی بات پر چیختے ہوئے سنا تھا۔کوئی بھی آپسی گفتگو، بس کچھ ہی دیر تک وہ لوگ اطمینان سے کر پاتے تھے۔ پھر اچانک آوازیں تیز ہو جاتی تھیں اور بے ساختہ مجھے جہاز کی زندگی یاد آجاتی۔ سمندر میں جب کبھی طوفان آجاتا یا لہریں تیز ہو جاتیں تو اکثر جہاز کے خلاصیوں کو ایک دوسرے سے زور زور سے چیختے ہوئے باتیں کرنی پڑتی تھیں۔ تیز طوفانی ہوا اور جہاز سے ٹکراتی ہوئی لہروں کے زبردست شور کے بیچ وہ لوگ بری طرح چیختے تھے، لیکن الفاظ بیچ میں ہی ٹوٹ کر بکھر جاتے تھے۔

میں نے ناول پھر کھول لیا لیکن پڑھنے میں دل نہیں لگا۔نظریں نہ چاہتے ہوئے بھی غزالہ کی جانب اٹھ کر اس کے لمبے لمبے بالوں پر ٹھہر گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد غزالہ اچانک ہی اٹھ بیٹھی اور اسی دوران اس کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ کچھ لمحوں تک وہ ویسے ہی کھڑی میری طرف دیکھتی رہی، پھر دھیرے دھیرے وہ اسی طرف بڑھنے لگی۔

''یہاں کیسے بیٹھے ہو؟'' اس نے نزدیک آکر اپنے اسی خاص اطمینان سے پوچھا۔

''یوں ہی، کمرے میں ذرا سردی لگ رہی تھی...''

''ہوں...''

یہ پہلا موقع تھا جب میں غزالہ کو سادے گھریلو سے لباس میں دیکھ رہا تھا۔ وہ نہا کر نکلی تھی، جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر ایک دھلا ہوا سا نکھار آگیا تھا۔ مجھے پہلی بار بچپن کی اس سرخ گالوں والی گول مٹول سی لڑکی اور اس غزالہ میں ایک خاص یکسانیت سی نظر آئی۔

''تمھاری نوکری کیسی چل رہی ہے؟'' غزالہ پوچھ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔''

اور اچانک میرے دل میں آیا کہ میں بھی اس سے یہی سوال پوچھوں۔ نہ جانے کیوں یکا یک میں غزالہ سے یہ پوچھ کر اسے تکلیف پہنچانا چاہتا تھا— باوجود اس کے کہ آج پہلی بار وہ مجھے اتنی اچھی لگ رہی تھی۔

''کہیں گئے نہیں آج؟'' کچھ دیر بعد ایک اور سوال۔

''ہاں کچھ طبیعت نہیں ہوئی۔''

''ہوں...''

وہ کچھ دیر خاموش کھڑی زمین کی طرف دیکھتی رہی۔

''ایک بات کہوں؟'' کچھ دیر بعد اپنے آپ ہی میرے منھ سے نکل گیا۔

''کیا؟''

''برا تو نہیں مانو گی؟''

''نہیں۔'' اس کی آنکھوں میں ایک چوکنا پن انجانے ہی لوٹ آیا تھا۔

''یہاں آنے سے پہلے سوچا تھا کہ... نہ معلوم کیوں، تم سے مل کر ایک خوشی سی ہوگی...''

وہ چپ چاپ ویسی ہی کھڑی رہی۔ پھر اسی سدھی ہوئی آواز میں اس نے جواب دیا:

''میں نے یہ نہیں سوچا تھا۔''

ہوا کے ایک تیز جھونکے نے ماحول میں ایک ہلکی سی سرسراہٹ پیدا کر دی تھی۔ املی کی خشک نازک پتیاں آہستہ آہستہ نیچے گر رہی تھیں۔ میری نظریں اوپر کی طرف اٹھ گئیں اور میں دیکھتا رہ گیا۔ املی کا یہ وہی پرانا درخت تھا جس کے نیچے بچپن میں ہم دونوں بھری دوپہری میں کھیلا کرتے تھے۔ بے حد گھنا درخت تھا جس کے نیچے دوپہر میں بھی ایک ٹھنڈا اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ لیکن اب؟ بہت تھوڑی پتیاں بچی تھیں، اور ادھڑی شاخوں کے بیچ بیچ میں سے دھوپ اور روشنی کی موٹی موٹی شعاعیں نیچے بنے چبوترے اور آس پاس کی زمین پر پڑ رہی تھیں...

فیکٹری کی کالونی میں فلیٹ ملنے کی بات حالانکہ جوائن کرتے وقت ہی ہوئی تھی، لیکن اتنی جلدی فلیٹ مجھے مل جائے گا، یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کم سے کم دو تین مہینے تو لگ ہی جائیں گے، لیکن آج پورا ہفتہ ہو چکا تھا فلیٹ خالی ہوئے۔ پندرہ دن کے اندر اندر وہاں جا کر رہنا لازمی تھا۔ پچھلے دنوں میں قریب قریب روزانہ ہی سوچتا کہ آج ظفر بھائی اور رفعت میاں سے اس کا ذکر کروں گا، لیکن ہر روز اپنے آپ ہی یہ تذکرہ اگلے دن کے لیے ٹال دیتا۔ اب دھیرے دھیرے مجھے اپنے آپ پر ہی غصہ آنے لگا تھا۔ آخر کہنا تو ہوگا ہی مجھے۔ اور پھر اس میں شرم کس بات کی؟

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی کہا، ''کون؟ دروازہ کھلا ہے۔''

''حضور! میں ہوں...'' ظفر بھائی کا نوکر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ''آپ کو یاد کیا ہے؟''

''اچھا۔ کہنا آتا ہوں ابھی۔''

''جی حضور۔''

یکبارگی میری آنکھوں کے سامنے ظفر بھائی کا ڈرائنگ روم گھوم گیا۔ ان کے دوستوں کے آنے کا وقت ہوگیا تھا۔ نہ جانے کیوں اِدھر کچھ دنوں سے مجھے ان مجلسوں سے ایک وحشت سی ہونے لگی تھی۔ ادھیڑ اور بوڑھے لوگوں کی ایک خاص طرح کی جماعت جس میں بات چیت ہمیشہ بعض مخصوص موضوعات کے گرد ہی گھومتی رہتی تھی— شراب، سیاست، بھدے لطیفے اور ایک طویل، گذرا ہوا ماضی۔ یا پھر ان لوگوں کے بارے میں عجیب طرح کی باتیں جو اس محفل میں موجود نہیں ہوتے۔ دراصل ظفر بھائی کے دوستوں میں صرف ایک سلیم میاں ہی ایسے تھے جو وہاں ہمیشہ آتے تھے ورنہ ہر بار دو تین چہرے نئے ہوتے تھے جو کچھ دنوں تک متواتر نظر آتے تھے پھر یکا یک غائب ہوجاتے تھے، جہاز کے پرندوں کی طرح۔ مجھے کئی بار یاد آیا تھا کہ جہاز جب برطانیہ سے چلا تھا تو اس پر بے شمار پرندے بیٹھے ہوئے تھے۔ سفر کے دوران میں نے اکثر دیکھا تھا کہ زیادہ تر پرندے صبح کے وقت ہی دور سمندر کی جانب اڑ جاتے تھے اور نہ جانے سارا دن کہاں غائب رہتے تھے لیکن شام ہوتے ہی وہ پھر واپس لوٹ آتے تھے— رات بتانے کے لیے۔ بعد میں اسی بوڑھے جرمن نے مجھے بتایا تھا کہ بہت سے پرندے موسم بدلنے پر جگہ بدل لیتے ہیں اور جہاز بھی اس کا ایک ذریعہ ہے۔

میں نے اٹھ کر کپڑے بدلے اور باہر نکل آیا۔ پورچ میں گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی کیوں کہ اندر چار پانچ صاحبان بیٹھے ہوئے تھے، بالکل خاموش۔ سلیم میاں نہیں تھے۔ میں سلام کرتا ہوا ایک طرف صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

شاید ظفر بھائی اندر چلے گئے تھے۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ جس طرح سے سب لوگ چپ چاپ بیٹھے تھے، مجھے لگا جیسے کسی مزار پر لوگ بیٹھے ہیں— فاتحہ پڑھتے ہوئے، خاموش۔ کمرے میں دھیمی روشنی تھی، زرد، بیماری کی سی حرارت لیے ہوئے۔ میں نے اوپر کی طرف دیکھا۔ فانوس جل رہا تھا۔ شاید اس کے شیشے پیلے پڑ گئے تھے، میں نے اندازہ لگایا۔ جہاز کا ڈائننگ روم ایک بار پھر دماغ میں گھوم گیا۔ کتنی تیز روشنی ہوتی تھی اس کی، بالکل سفید براق، زندگی کی سی چمک لیے ہوئے۔

میرے سامنے کی طرف پاس پاس بیٹھے دو آدمیوں نے دھیمی آواز میں بات چیت شروع کر دی تھی۔

کچھ دیر بعد ظفر بھائی مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ میرے سامنے بیٹھے دونوں لوگ اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور تعارف کرانے لگے۔ میں نے سنا کہ وہ لوگ نیشنل آرکائیوز سے آئے تھے۔

''اچھا اچھا...'' ظفر بھائی کہہ رہے تھے۔

اس کے بعد ظفر بھائی نے سب لوگوں سے میرا تعارف کرایا اور پھر اپنے دوستوں سے اجازت لے

کر ان دونوں آدمیوں سے بات کرنے لگے۔ پتا چلا کہ ان لوگوں کو اطلاع ملی تھی کہ ظفر بھائی اور رفعت میاں وغیرہ کے پاس کچھ بہت پرانے سیاسی اہمیت کے حامل خطوط اور دوسرے کاغذات موجود ہیں، جن کو آرکائیوز والے دیکھنا یا خریدنا چاہتے تھے۔

''ہاں جناب! ہیں تو سہی بہت سی چیزیں،'' ظفر بھائی کہہ رہے تھے۔ ''آپ لوگ کسی بھی دن فرصت سے آئیں تو دیکھ لیجیے گا۔ اصل میں ہمارے پاس تو بے شمار چیزیں ہیں۔ خطوط وغیرہ تو ہزاروں ہی سمجھیے۔ میرا مطلب ہے سب اتنے اہم تو نہیں ہوں گے لیکن بہرحال، بہت سارے ہیں۔ کچھ تو ابا جان کو ہی لکھے تھے جناح صاحب نے... ملکہ الزبتھ کا بھی ایک خط ہے... پھر گاندھی جی اور نہرو جی کے بھی ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی ہیں رفعت اللہ خاں۔ ان کے پاس بھی بہت سی چیزیں ہیں۔ آپ دیکھ لیجیے گا۔''

''جی بہت اچھا۔''

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر ظفر بھائی نے دھیرے سے پوچھا، ''اچھا، آپ لوگ... میرا مطلب ہے آرکائیوز والے کیا باقاعدہ ان چیزوں کو خریدتے ہیں؟''

''جی ہاں، جو اہم چیزیں یا دستاویزات ہوتی ہیں انھیں ہم لوگ خرید لیتے ہیں۔''

''ہوں... میرے خیال سے جس طرح سے میوزیم والے خرید لیتے ہیں۔''

''جی ہاں، ویسے ہی سمجھیے، لیکن میوزیم والے پیسہ بہت دیتے ہیں کیوں کہ وہ چیزیں اسی لائق ہوتی ہیں، جیسے پینٹنگز وغیرہ۔ ظاہر ہے ان کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔''

''ہاں ہاں، ظاہر ہے،'' ظفر بھائی نے جلدی سے کہا۔ پھر کچھ رک کر میری طرف اور اپنے دوستوں کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولے، ''بھئی، ہم لوگوں کے پاس تو نہ جانے کتنی چیزیں پڑی ہیں۔ اور کوئی پیسے کے خیال سے تو ہم لوگ انٹرسٹڈ ہیں نہیں۔ وہ تو بس یہ لگا کہ اتنی اہم چیزیں ہیں تو عوام کے سامنے آنی چاہییں، ورنہ ہمارے لیے تو...''

''جی، ظاہر ہے۔''

''آپ دیکھیں گے تو آپ کو پتا چلے گا۔ جناب، کچھ خط تو ایسے ہیں جن کی وجہ سے آدھی تاریخ غلط ثابت ہوسکتی ہے...''

''جی۔''

تھوڑی دیر تک ظفر بھائی اسی سے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ پھر وہ دونوں آدمی کسی اور دن آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

''بھئی معاف کرنا، یہ لوگ آ گئے تو...'' ظفر بھائی انھیں باہر چھوڑ کر کمرے میں واپس آتے ہوئے

بولے۔

''نہیں، ٹھیک ہے میاں...'' ان کے ایک دوست نے جواب دیا۔ ظفر بھائی نے نوکر کو آواز دی اور اس سے گلاس وغیرہ لانے کو کہا۔

جام تیار ہو چکے تھے۔ ''لو بھئی اٹھاؤ۔'' بہت سی ملی جلی آوازوں کے بیچ میں نے بھی جام اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔

سامنے بیٹھے ہوئے ایک صاحب ظفر بھائی سے کہہ رہے تھے، ''ارے میاں، ہاں، میں تو بھول ہی گیا۔ وہ عباس میاں ہیں نا، ارے وہ، ارے اپنے مولانا کے چھوٹے بھائی، وہ رائفل کے فراق میں ہیں آج کل۔ تم اپنی تھرٹی اسپرنگ فیلڈ نکالنا چاہ رہے تھے نا... کہو تو بات کروں؟''

میں ان کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کتنی آسانی سے کچھ لوگ بات کہہ دیتے ہیں— کسی بھی طرح کی بات۔ فیکٹری والا فلیٹ... مجھے دھیان آیا۔ میں نے گلاس اٹھا کر ایک اور گھونٹ لیا۔

ظفر بھائی دوسرا پیگ بنا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

ویٹر دوسری بار بیئر ڈال رہا تھا۔ تکان گھلنے سی لگی تھی۔ یہاں آ کر بیٹھنا اچھا ثابت ہوا تھا۔

آفس میں اچانک ہی لنچ کے بعد چھٹی ہوگئی تھی۔ اس وقت تو بے حد غصہ آیا تھا کیوں کہ آج صبح جب نوکر نے جگایا تھا تو آفس جانے کی بالکل ہی طبیعت نہیں تھی۔ پھر کسی طرح اپنے آپ کو تیار کیا تھا۔ بہرحال آفس میں چھٹی ہو جانے کے بعد دن کا باقی حصہ بتانا اچھی خاصی پریشانی کا سبب تھا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا تھا کہ یہاں آ کر بیئر پی جائے۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس شہر کے کسی ریستوراں میں میں اکیلا آیا تھا۔

دراصل صبح جب نیند کھلی تو محسوس ہو رہا تھا جیسے تھکن کی ایک بھاری چٹان کے نیچے جسم دبا پڑا ہے۔ بس علی الصباح کسی لمحے آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔

کافی رات گئے تک غزالہ اور آپا بیگم کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ صاف صاف کچھ نہیں سنائی دیا تھا لیکن اتنا ضرور محسوس ہوا تھا کہ کسی بہت اہم مسئلے پر کافی دیر گفتگو ہوتی رہی تھی۔ بیچ بیچ میں آپا بیگم کی گالیاں سنائی دینے لگتی تھیں یا انھیں کے رونے کی آواز آنے لگتی تھی۔ شروع میں تو میں نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی، کیوں کہ میرا خیال تھا کہ شاید بھابی جان اور رفعت میاں کے متعلق بات چیت چل رہی تھی۔ بھابی کل دن میں اپنے میکے چلی گئی تھیں۔

دراصل پچھلے تین چار دنوں میں مراد منزل کی زندگی میں ایک عجیب سی منحوسیت آ گئی تھی، بالکل جیسے خاموش ٹھہرے ہوئے سمندر میں یکا یک طوفان آ جاتا ہے۔ جمعے کی رات کو بھابی جان اور رفعت میاں میں

جھگڑا ہو گیا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ آخر کار ظفر بھائی وہاں پہنچ گئے تھے اور انھوں نے ان لوگوں کو سمجھایا تھا۔ میں بس اتنا ہی سمجھ پایا تھا کہ سارا معاملہ بھابی جان اور رفعت میاں کے کسی دوست سے متعلق تھا۔ بہرحال وہ رات اور اگلا دن انھیں باتوں میں بیتا تھا۔ گھنٹوں ظفر بھائی نے ان دونوں سے الگ الگ بیٹھ کر بات چیت کی تھی لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلا تھا۔ کل یعنی اتوار کو بھابی جان کافی بھاری بھرکم ساز و سامان کے ساتھ اپنے میکے چلی گئی تھیں۔

کل رات رفعت میاں بھی ظفر بھائی کے ڈرائنگ روم میں بہت سے لوگوں کے ساتھ آخر تک بیٹھے رہے تھے۔

بارہ بجے کے قریب میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا تھا۔ کافی دیر تک برابر سے بات چیت کی بھنبھناہٹ آتی رہی، لیکن جب آپا بیگم کے رونے کی آواز آئی تو میں چپ چاپ کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کافی دیر کھڑے رہنے کے باوجود میں سسکیوں میں پھنسی چند بھدّی گالیوں کے سوا کچھ نہیں سن پایا تھا۔

صبح کا ناشتہ ظفر بھائی کے ساتھ ہی ہوا تھا۔ زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ جب میں آفس کے لیے چلنے لگا تو ظفر بھائی بھی باہر تک آئے تھے اور پھر آپا بیگم کی طرف چلے گئے تھے۔

پانچ بج رہے تھے۔ چلنا چاہیے، میں نے سوچا۔ اور ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کر کے میں نے بچی ہوئی بیئر کے کئی لمبے لمبے گھونٹ لیے۔

مراد منزل تک پہنچنے میں شام گھر آئی تھی۔ ٹیکسی میں نے گیٹ پر رکوالی اور پھر دھیرے دھیرے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا۔ سامنے ہی پورچ کے کچھ آگے ظفر بھائی کھڑے تھے اور ان کے آگے دائیں طرف آپا بیگم والے دروازے کے باہر ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی جس پر سامان رکھا جا رہا تھا۔ میں کچھ نہیں سمجھ پایا، لیکن اس کے باوجود میرے اندر جیسے کہیں کچھ لرز سا گیا۔ میں ظفر بھائی کی طرف بڑھا۔ بجری پر میرے قدموں کی آواز سارے ماحول میں گونج رہی تھی۔

''کہو... آ گئے؟'' ظفر بھائی نے دھیرے سے کہا۔

''جی... لیکن یہ کیا؟'' میرے منھ سے نکل پڑا۔

''کچھ نہیں... غزالہ جا رہی ہے،'' انھوں نے آواز کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

''کہاں؟''

''بمبئی۔'' اور وہ چپ ہو گئے۔

اندھیرا ہر لمحے گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

تبھی دروازے سے غزالہ باہر نکلی اور اس کے ساتھ فریال، سسکیاں لیتی ہوئی۔ غزالہ کی ایک بانہہ فریال کے کندھے پر تھی۔ باہر جا کر اس نے فریال کو یکبارگی اپنے سے لپٹا کر دھیرے سے کہا، ''اری، رومت... پاگل۔'' اور پھر اس سے الگ ہو کر وہ اس طرف بڑھی۔ ظفر بھائی کے پاس آ کر اس نے ایک بار میری طرف دیکھا اور اس کے بعد ظفر بھائی سے بولی، ''اچھا، بڑے ابا...''

''اچھا بیٹے۔'' ظفر بھائی نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا اور دھیرے سے بولے۔

''خدا خوش رکھے تجھے۔''

غزالہ نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور چپ چاپ سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ اندھیرا اب اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ غزالہ کا چہرہ مجھے صاف صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک زبردست بے چینی مجھ پر طاری ہو گئی تھی کہ کسی طرح اس کی آنکھوں کو دیکھ سکوں... اس کے چہرے کو... کیا تاثر تھا اس کے چہرے پر اس وقت؟

''اچھا... خدا حافظ۔'' غزالہ مڑ گئی۔

وہ سیدھی ٹیکسی میں جا کر بیٹھ گئی۔ فریال اب بھی دروازے کے پاس کھڑی سسکیاں بھر رہی تھی۔ ٹیکسی اسٹارٹ ہوتے ہی وہ اندر بھاگ گئی۔ کچھ دیر تک ٹیکسی کے ایگزاسٹ کی آواز کانوں میں آتی رہی اور پھر تھکی ہوئی سیاہ پڑتی ہوئی شام ایک دم سے نڈھال ہو کر گر پڑی۔

ہم دونوں پورچ میں گھسے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر پورچ کی لائٹ جلائی۔ زرد روشنی جیسے یکبارگی ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی— سہمی ہوئی سی۔ ظفر بھائی نے ایک بار چونک کر میری طرف دیکھا۔ پورچ کی کمزور روشنی میں ان کے چہرے کا رنگ عجیب سا ہو گیا تھا— مٹ میلا سا زرد، کسی بہت پرانے صفحات والی کتاب کی طرح— یہاں تک کہ داڑھی کی سرخی بھی کافی زنگ خوردہ نظر آ رہی تھی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ظفر بھائی کافی بوڑھے تھے۔

ظفر بھائی اب سر جھکائے پورچ کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ میں وہیں کھڑا انھیں ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھتا رہا اور اس کے بعد اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

کمرے میں آ کر میں نے لائٹ جلائی اور کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ برابر سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید آپا بیگم ہی تھیں۔ سامنے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں آم کا وہی تنہا درخت جھکا کھڑا تھا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی۔ اور آرام کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ بند آنکھوں میں ایک مووی سی چلنے لگی تھی— پچھلے دنوں کی ایک ایک بات، ایک ایک تصویر... رفعت میاں، بھابی جان، غزالہ، ظفر بھائی...

پتا نہیں کتنی دیر میں اسی طرح بیٹھا رہا۔ جب گھڑی کی طرف دیکھا تو سات بج رہے تھے۔ ظفر بھائی شاید اکیلے ہوں گے، مجھے دھیان آیا، حالاں کہ ان کے دوستوں کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر

کپڑے وغیرہ بدلے اور باہر نکل آیا۔ رفعت میاں والے حصے میں بالکل اندھیرا تھا۔ اس کے علاوہ بھی چاروں طرف اندھیرے میں لپٹی ہوئی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بس پورچ کی لائٹ جل رہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں بھی اجالا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو دیکھا، ظفر بھائی دیوان پر بالکل سیدھے لیٹے ہوئے تھے، چھت کی طرف دیکھتے ہوئے۔ کمرے میں اگربتیوں کی بھینی بھینی مہک بھری ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا جیسے میں کسی بہت پرانے شاہی محل کے تہہ خانے میں کھڑا ہوں اور سامنے ہزاروں سال پہلے کے کسی بادشاہ کی ممی رکھی ہوئی ہے۔

قدموں کی آواز سن کر ظفر بھائی کا دھیان ٹوٹا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ''آؤ میاں...''

میں ان کے پاس والے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

ہم دونوں کی سامنے والی میز پر ایک ٹرے میں چار پانچ گلاس رکھے ہوئے تھے، ایک آئس بکیٹ اور ایک وسکی کی بوتل۔

ظفر بھائی کچھ دیر تک خاموش بیٹھے غالیچے کی طرف دیکھتے رہے، پھر دھیرے دھیرے ان کی نظریں اٹھیں۔ حالانکہ ان کا چہرہ اب کافی سنبھل گیا تھا مگر پھر بھی میں ان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

''اور سناؤ...'' انھوں نے بوتل اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ رک کر بولے، ''آج تمھارے ابا کا خط آیا تھا۔''

''جی۔'' مجھ کہنے کے لیے اور کچھ نہیں سوجھا۔

ظفر بھائی نے دو جام تیار کیے اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''اگلے ہفتے آ رہے ہیں یہاں،'' اور انھوں نے جام لے کر اوپر اٹھایا۔

میں نے بھی ایک گھونٹ لیا۔ ''جی ہاں، مجھے بھی لکھا تھا انھوں نے۔''

''اور ہاں، آں... سنا ہے تمھیں فیکٹری کی طرف سے مکان مل گیا ہے؟ کب جا رہے ہو؟'' ان کی آواز اب پوری طرح سنبھل گئی تھی۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔

''شاید سلیم آئے ہیں،'' ظفر بھائی نے کہا۔

سلیم میاں ہی تھے۔ ساتھ میں دو اور صاحبان جن کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سلیم میاں نے تعارف کرایا، اور اس کے بعد اپنا جام لے کر میرے پاس والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے، ''اور میاں امروز، کیا خبریں ہیں؟''

''جی، دعا ہے۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''یار، تمھارا نام بہت خوب ہے،'' سلیم میاں نے ایک لمبا گھونٹ لے کر پیچھے کی طرف ٹکتے ہوئے

کہا۔

''ہاں، ہاں...آں...'' ظفر بھائی نے اپنے گلاس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

''امروز، یعنی آج...نہ گذرا ہوا نہ آنے والا...بس آج،'' ظفر بھائی اپنے آپ سے ہی کہہ رہے تھے۔

''اس پر میاں ایک شعر یاد آ گیا،'' سامنے بیٹھے ہوئے صاحب نے کہا۔ اور پھر شعر سنانے لگے۔

ایک اور شام شروع ہو چکی تھی، یا اتنی ہی دیر میں ایک پوری منحوس اور بے انتہا تکلیف دہ شام بیت چکی تھی، کل وجود میں آ چکا تھا، اور ایک نئی دوسری شام شروع ہو چکی تھی۔ ظفر بھائی کا چہرہ گذری شام کے ساتھ رات بھر کے لیے رخصت ہو چکا تھا اور پھر ان کی جگہ جہاز کے کیپٹن کا چہرہ آ گیا۔

کیپٹنز بال والی رات والا چہرہ...

...جہاز جب سفر کا آخری حصہ طے کر رہا تھا تو بمبئی پہنچنے کے پہلے کیپٹنز بال ہوا تھا— کیپٹن کی طرف سے سفر سلامتی سے ختم ہونے کا خاص جشن۔ جہاز کا بڑا ڈائننگ ہال بالکل بھر گیا تھا۔ سب کچھ کیپٹن کی طرف سے تھا— شراب، کھانا، سگریٹ، سگار۔ اور سب مسافروں کے درمیان کیپٹن کا مسکراتا چہرہ...

ظفر بھائی کے گلاس میں تھوڑی سی شراب اور بچی تھی۔ میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ان کے ٹھیک پیچھے آتش دان کے برابر ایک اسٹینڈ پر ایک کافی بڑا قد آور چیتا رکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے ظفر بھائی کے اوپر چھلانگ لگا دے گا— ایک جھوٹی چھلانگ۔

اچانک آتش دان کے اندر سے ایک بڑا سا چوہا نکل کر دروازے کی طرف بھاگا۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔

جہاز پر اسی بوڑھے جرمن نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ جب کوئی جہاز ڈوبنے لگتا ہے تو چوہے بری طرح سے بھاگتے ہیں... باہر نکلنے کی کوشش میں...

اُدے پرکاش

ہندی سے ترجمہ: اجمل کمال

دلّی کی دیوار

یہ کہانی دراصل ایک اوٹ ہے جس کے پیچھے چھپا ہوا میں آپ کو ایک راز کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ جیسے حالات ہیں ان میں افواہیں ہی اطلاعات کی شکل میں آپ تک پہنچ رہی ہیں۔اور حالات ایسے بھی ہیں کہ پتا نہیں کب میں اپنے سے میں اچانک غائب ہو جاؤں۔

پان کی دکان سے کھلتی سرنگ کی شہریت، فقیر کے آنسو اور تھوک

میرے فلیٹ سے سنجے چورسیا کے پان کے ٹھیلے کی دوری آدھا کلومیٹر سے بھی کم تھی۔اس کے ٹھیلے کے بغل میں ہی رتن لال کا چائے کا ٹھیلا تھا۔ سنجے پرتاپ گڑھ کے پاس کے ایک گاؤں بیسی پورہ سے دلّی آیا تھا اور چائے والا رتن لال سہسرام سے۔ دونوں کی دکانیں ٹھیلے پر اس لیے تھیں کہ اگر کبھی میونسپلٹی والے ادھر آس پاس دِکھیں تو فوراً ٹھیلا گھسیٹتے ہوئے یہاں سے رفو چکر ہو لیا جائے۔ حالانکہ موٹر سائیکل پر گشت لگاتے پولیس والے اکثر اُدھر سے نکلتے رہتے تھے، لیکن ان سے خطرہ کم تھا کیونکہ ان کا ہفتہ بندھا ہوا تھا۔ چائے والا رتن لال پولیس کو پانچ سو اور سنجے ساڑھے سات سو روپے مہینہ دیتا تھا۔

''چین ہے۔ کہیں پکی دکان لیتے تب بھی تو کرایہ دینا ہی پڑتا، ہے کہ نہیں؟ جب آدمی دال روٹی کھاتا ہے تو چار گسّے (نوالے) کتے کو بھی ڈالتا ہے، ہے کہ نہیں؟'' سنجے مسکراتے ہوئے کہتا۔ لیکن جیون کس کا کتے جیسا ہے؟ میں یہ سوچنے لگتا۔

وہاں اور بھی ریہڑی والے تھے۔ دس قدم ہٹ کر سائیکل کا پنکچر لگانے والا مدن لال، اس کے

سامنے سڑک کی دوسری طرف موچی دیوی دین، کچھ دور جا کر اسکوٹر اور آٹو رکشا کی مرمت کرنے اور پنکچر لگانے والا سنتوش۔ سنتوش سیتامڑھی سے چار سال پہلے دلّی آیا تھا۔ مدن لال اور دیوی دین پاس سے ہی ہریانہ کے کسی گاؤں سے یہاں تک آتے تھے۔ وہ زمین پر ہی اپنا ٹھیا جماتے تھے۔ شام ہوتے ہوتے کوالٹی آئس کریم والا برجیندر بھی اپنا بجلی اور گلاس فائبر کی باڈی والا انگریزی میں لکھا رنگین ٹھیلا لے کر وہاں پہنچ جاتا تھا۔ شام کو وہاں ابلے انڈے بیچنے والی راج وتی اپنے پتی گلشن اور تین بچوں کے ساتھ آ جاتی تھی۔ اس کی دکان سے کچھ پیچھے اینٹوں کی دیوار کا ایک احاطہ تھا۔ وہ جگہ سنسان ہوتی تھی۔ رات میں وہاں کار والے آ جاتے اور گلشن سے وِسکی یا رَم منگاتے۔ تب تک شراب کی ساری دکانیں بند ہو چکی ہوتی تھیں، اس لیے گلشن سائیکل سے جا کر کہیں سے بلیک میں اڈھایا پوا لاتا۔ کچھ گاہک ابلے انڈے کے علاوہ چکن تکہ بھی منگاتے۔ وہ اگلی لال بتی کے پاس سردار تلے سنگھ کے ٹھیلے میں ملتا۔ گلشن وہ بھی لاتا۔ اسے ٹپ میں تھوڑی سی شراب اور کچھ روپے مل جاتے۔ راج وتی اس کو پینے سے منع نہیں کرتی تھی کیونکہ پھوکٹ میں ملنے والی انگریزی شراب اپنے پیسے سے خرید کر ملنے والے لوکل ٹھرے سے لاکھ گنا اچھی تھی۔ ٹھرے کے پاؤچ میں ملاوٹ ہوتی تھی، جسے پی کر کئی بار لوگ یا تو اندھے ہو جاتے تھے یا مر جاتے تھے۔

اس جگہ پر رکشے والے بھی ستانے کو اور سواریوں کے انتظار میں آ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اسی لیے وہاں چہل پہل رہتی۔ زیادہ تر رکشے والے بہار اور اڑیسہ کے ہوتے تھے۔ کچھ دنوں تک احاطے کے پاس ہی نالندا سے آیا ہوا طفیل احمد اپنی سلائی مشین لے کر بیٹھنے لگا تھا۔ طفیل احمد کے رہنے کا کوئی ٹھیک پتا ٹھکانا نہیں تھا اس لیے اس کے پاس سلائی کا کپڑا کوئی نہیں چھوڑتا تھا۔ زیادہ تر اسکولی بچوں کے بستے یا مزدوروں یا رکشے والوں کا ٹرپائی اور آلٹر کا کام ہی اس کے پاس آتا۔ ان دنوں لگ بھگ پندرہ بیس دنوں سے وہ وہاں نہیں آ رہا تھا۔ کوئی کہتا تھا وہ بیمار ہے، کوئی کہتا وہ نالندا لوٹ گیا، اور کسی کا کہنا تھا کہ یہاں آتے ہوئے راستے میں وہ کسی بلولائن بس کے نیچے آ گیا اور مر گیا، اس کی سلائی مشین تھانے کے پچھواڑے پڑی ہوئی ہے۔ اسی طرح راج وتی کے انڈے کے ٹھیلے کے پاس رات میں ابلا چنا مسالا اور دن میں چھولے کلچے بیچنے والی نتھو اور اس کے پتی مانگے رام کا پتا کئی مہینوں سے نہیں چل رہا تھا۔ کسی نے بتایا تھا کہ مانگے رام کے پیٹ میں کینسر ہو گیا تھا جس کی دوا دارو میں نتھو برباد ہو گئی اور اس کے مرنے کے بعد اپنے دونوں بچوں کے ساتھ جمنا پار کے کسی کلچے والے کے پاس چلی گئی۔

یہاں ایسا ہی ہوتا تھا۔ یہ کسی قاعدے کی طرح تھا۔ یہاں ہر روز آنے والا آدمی اچانک ہی ایک دن غائب ہو جاتا، اور پھر مستقبل میں کبھی نظر نہ آتا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگوں کا کوئی یقینی پتا نہیں ہوتا تھا کہ ان کے بارے میں کوئی معلومات حاصل کی جائے۔ مثال کے طور پر راج وتی اپنے پتی گلشن اور بچوں

کے ساتھ یہاں سے چار کلومیٹر آگے بائی پاس کے قریب ایک سولھویں صدی کی عمارت کے کھنڈر میں رہتی تھی۔ کرنال اور امرتسر کی سمت جانے والی نیشنل ہائی وے سے کبھی آپ نے اگر جنوب کی طرف نظر دوڑائی ہو، جس طرف نکاسی کا گندا نالا بہتا ہے، تو اس کے کنارے اس گول گنبد والی پرانی عمارت کو آپ نے ضرور دیکھا ہوگا۔ کائی لگے مٹیالے پتھروں اور کتھئی پرانی اینٹوں والی، گنبددار، ٹوٹی پھوٹی عمارت۔ کوئی سوچ نہیں سکتا کہ وہاں کوئی آدم زاد رہتا بھی ہوگا۔ دلّی سے لاہور یعنی ہندوستان سے پاکستان جانے والی مشہور سدبھاؤنا بس اسی ہائی وے سے ہو کر گذرتی ہے۔

اس کھنڈر میں اور لوگ بھی رہتے تھے۔ لیکن زیادہ تر کنبے والے ہی تھے۔ صرف دو لوگوں کو چھوڑ کر۔ ایک تھا رضوان جس کا داہنا پیر اور داہنا ہاتھ کوڑھ سے گل گیا تھا۔ اور دوسرا سنیہی رام جو اتنا بوڑھا ہو گیا تھا کہ نالے کے پاس ہی اگے ایک نیم کے پیڑ کے نیچے دن بھر سوتا رہتا تھا۔ سنیہی رام کو رام چرت مانس اور سور ساگر پورا یاد تھا۔ ڈھولا مارُو کی کتھا اور آلھا وہ ایسے گلے سے گاتا تھا کہ سننے والے پر سحر طاری ہو جاتا تھا۔ اس کھنڈر میں رہنے والے کنبوں میں سے ہی کوئی نہ کوئی اسے روٹی دے جاتا تھا۔ رضوان صبح صبح بائی پاس کی طرف چلا جاتا۔ وہاں گوپال دھنکڑ کے ٹھیلے میں چائے پیتا، مٹھی یا بند کھاتا، اور بس اسٹاپ پر بیٹھ کر شام تک بھیک مانگتا۔ بھیک اچھی مل جاتی تھی۔ رضوان کے چہرے پر کھچڑی داڑھی تھی اور اس کا چہرہ دیکھ کر فلم ''کابلی والا'' کے بلراج ساہنی کی یاد آتی تھی۔

سولھویں صدی کے اسی کھنڈر میں راج وتی کی بہن پھولو آزاد پور سبزی منڈی کے نکاس پھاٹک پر مونگ پھلی بیچنے والے جگ راج کی پتنی سومالی اور لال قلعے کے آس پاس چرس بیچنے والے مشتاق کی پھپیری بہن سلیمن، جواب اس کی پتنی بھی تھی، رہتی تھی۔ وہ تینوں دھندا کرتی تھیں۔ سومالی تو کھنڈر میں ہی رہ کر وہاں اکثر آ جانے والے اسمگلے تلک، دھوسن اور آزاد کے لائے ہوئے گاہکوں کو نمٹاتی تھی۔ لیکن سلیمن اور پھولو شام کو رکشا لے کر سڑک پر گاہکوں کی کھوج میں بھی گھومتی تھیں۔ پھولو کبھی کبھی پارٹی میں بھی رات رات بھر کے لیے باہر جایا کرتی تھی۔ وہ کبھی کبھی آزاد کے ساتھ سوتی بھی تھی، حالانکہ اس کے لیے اس کی بہن راج وتی اور بہنوئی گلشن نے منع کر رکھا تھا۔ ''گھر کے لوگوں کے ساتھ نہ دھندا نہ اُدھاری،'' یہ گلشن کہا کرتا تھا۔ گلشن، راج وتی اور پھولو، اس کھنڈر کے باسیوں میں سب سے امیر تھے اور پچھلے سال بھر سے، جب سے پھولو گاؤں سے یہاں رہنے آ گئی تھی اور دھندا کرنے لگی تھی، ان کی کمائی اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ لونی باردڑ کی طرف گھر بنانے کے لیے پلاٹ دیکھنے کئی بار جا چکے تھے۔

''اگر تو وہاں گئی تو میں بھی اُسی طرف کوئی کام پکڑ لوں گا،'' یہ آزاد نے کہا تھا۔ لیکن پچھلے کچھ دنوں سے اس کا جسم لگاتار کانپتا رہتا تھا اور رات میں اینٹھنے لگتا تھا۔ گلشن نے کہا تھا، اب یہ زیادہ دن نہیں چلے گا۔

سارے اسمیکیوں کی یہی گت ہوتی ہے۔ آزاد کا چہرہ کسی بچے کی طرح معصوم تھا۔ اس کا رنگ گورا تھا۔ تلک کہتا تھا کہ آزاد فتح پور کے کسی زمین دار گھر کا لڑکا ہے۔ ماں باپ مر گئے تو بھائی اور بھابی نے ساری زمین جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ بھائی کے سالے نے سازش کے تحت اسے اسمیک کی لت لگا دی۔ پھر اس کی ایسی حالت کر دی کہ اسے اپنے گھر سے بھاگنا پڑا۔ کہتے ہیں آزاد پہلے کتابیں بہت پڑھتا تھا۔

میں نے آزاد سے دیر دیر تک بات کی تھی۔ وہ بہت صاف ستھری زبان بولتا تھا۔ بدیسی پرفیوموں اور دیسی عطر اور گھوڑوں کے بارے میں اس کی جانکاری سے میں دنگ رہ جاتا تھا۔ کس سے کیسی بات کی جائے، اسے اس کا پورا علم تھا۔ اسمیک کی لت کے علاوہ اس کے پورے وجود میں دوسرا کوئی بھی عیب نہیں تھا۔ لیکن اب پچھلے کچھ دنوں سے اس کا جسم اس طرح کانپنے لگا تھا جیسے ملیریا کے تیز بخار میں کانپا کرتا ہے، یا جیسے پارکنسن روگ میں۔ میں اندر اندر اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک دن جب میں اس کھنڈر کی طرف پہنچوں گا تو پھولو، تلک یا سلیمن میں سے کوئی کہے گا، ''پتا ہے وِنا یک، چار دن سے آزاد نہیں دِکھ رہا۔ چار روز پہلے سویرے سویرے گیا تھا۔ پھر آج تک لوٹا ہی نہیں۔ تم کو تو نہیں دِکھا کہیں؟''

یہی ہوتا ہے ان سب کے ساتھ۔ آزاد اب کبھی نہیں لوٹے گا۔ لیکن میں؟ میں، وِنا یک دتاتریہ — میں بھی کتنا محفوظ ہوں؟ حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں کہ میں ایک ڈراؤنی بے روزگاری میں گھرا ہوا گھنٹوں اسی پنواڑی کے ٹھیلے کے پاس بیٹھا رہتا ہوں — نکما، بے چین اور بدحواس۔ تو میں دراصل اب اُسی جیون کا حصہ تھا۔ گھر لوٹنے پر بیٹے اور بیوی کی آنکھوں کی تاپ کا سامنا کرنے کی ہمت میرے اندر نہیں بچی تھی۔ رات میں جب میرا بیٹا روٹی کے نوالے منھ میں رکھ کر دھیرے دھیرے چباتا تو مجھے لگتا وہ کسی اندھیرے کی سیڑھیاں اتر رہا ہے اور میں اب آئندہ اس کا چہرہ کبھی نہیں دیکھ پاؤں گا۔ میرے اندر کی آتما جیسی چیز چپ چاپ روتی۔ میں اس بدنصیبی کے لیے جتنی بار اپنے اندر کمیاں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا، یقین مانیے مجھے ساری خامیاں اس پورے نظام میں دکھائی پڑتیں جس کو بنانے میں یقیناً کنھیں شیطانوں کا ہاتھ تھا۔ یہ طے تھا کہ اچانک ایک کسی دن میں بھی اس نکڑ پر دِکھنا بند ہو جاؤں گا۔ جناتوں اور دولت مندوں کے اس شہر دلّی سے ایسے ہی غائب ہوتے ہیں درویش، غریب، بیمار اور معمولی لوگ۔ پھر وہ کبھی نہیں لوٹتے۔ وہ کہیں نہیں لوٹتے۔ اس شہر میں ان کی یادیں تک نہیں باقی رہتیں۔ وہ کسی بدقسمت فقیر کے آنسو کی طرح ہوتے ہیں جو جب جاتا ہے تو اس جگہ کی زمین پر جہاں اس کا وجود ہوتا تھا، صرف ایک چھوٹی سی نمی اور تھوڑا سا گیلا پن چھوڑ جاتا ہے۔ یہ نمی اس کے وقت کی ناانصافی کے برعکس اس کے خاموش آنسوؤں اور دھوپ کی ہوتی ہے۔

تاریخ کی پھوٹی مورتیاں اور کورونیشن پارک سے نکلتا جھنڈ

لیکن لگتا ہے ہم بھٹک گئے تھے۔ بات میرے فلیٹ سے تھوڑی ہی دور، نکڑ کے نجے چورسیا کے پان ٹھیلے کی چل رہی تھی اور ہم ادھر بائی پاس کے قریب سولھویں صدی کے کھنڈر تک آ پہنچے۔ لیکن اصلیت یہی ہے کہ اگر آپ اپنے فلیٹ سے باہر نکل کر کسی بھی نکڑ کی زندگی کو غور سے دیکھیں تو آپ دھیرے دھیرے ایک ایسی سرنگ میں داخل ہو جائیں گے جہاں ایک بالکل الگ ہی آبادی بستی ہے۔ یہاں ایک الگ طرح کی شہریت کا بسیرا ہوتا ہے۔ یہاں کے حادثوں اور وقوعوں کی کوئی خبر اخبار میں نہیں چھپتی۔ دراصل اخبار ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ وہ یہاں کی خبروں اور حادثوں کو چھپائیں۔

اگر آپ دلّی میں ہیں اور کوئی ایسا جیون جی رہے ہیں جس میں اکثر رات بھر نیند نہیں آتی اور آپ اچانک تین یا چار بجے اٹھ کر سڑکوں پر یوں ہی بھٹکنے لگتے ہیں تو آپ نے کبھی نہ کبھی کنگزوے کیمپ سے راج گھاٹ جانے والی سڑک کا منظر ضرور دیکھا ہوگا۔ کنگزوے کیمپ کا نام بدل کر وِجے نگر کر دیا گیا ہے۔ اگر آپ وجے نگر چوراہے سے اندر کی طرف نرنکاری کالونی یا مکھرجی نگر جانے والی سڑک پر چلیں تو دھیرے دھیرے اس اجاڑ سی جگہ تک پہنچ جائیں گے جسے کورونیشن پارک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ حالانکہ اب اسے ایک خوب صورت بڑے سے پارک میں بدل دیا گیا ہے، لیکن یہی وہ جگہ ہے جس کی بنا پر یہ علاقہ کنگزوے کیمپ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ انگریزوں کے زمانے میں جب جارج پنجم ہندوستان آئے تھے تو یہاں کے دیسی ریاستوں کے راجا رجواڑوں کے کیمپ اسی جگہ پر لگے تھے۔ وہ ولایت کے اپنے سمراٹ کا سواگت کرنے یہاں اکٹھے ہوئے تھے۔ کہتے ہیں وہ سواگت کچھ کچھ ویسا ہی تھا جیسا ابھی کچھ سال پہلے امریکہ کے پریذیڈنٹ بل کلنٹن کا سواگت تھا۔ اسی جگہ پر دیسی ریاستوں کے راجا رجواڑوں نے اپنے انگریز سمراٹ کی تاج پوشی کی تھی، جسے انگریزی میں کورونیشن کہتے ہیں۔ اور ولایتی سمراٹ نے یہاں جو تقریر کی تھی، اس کے جانے کے بعد اسے قومی دستاویز خانے میں رکھ دیا گیا تھا۔ تقریر کے اس متن کو ہندوستان کی تاریخ کی ایک اہم دستاویز مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سمراٹ کی ایک مورتی انڈیا گیٹ کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت چھتری کے نیچے کھڑی کر دی گئی تھی۔ بعد میں، جب ۱۹۴۷ء میں انگریز انگلینڈ لوٹ گئے اور کچھ سالوں بعد جب ایک دن ایک مخالف پارٹی کے لیڈر نے جارج پنجم کی ناک کو چینی سے کاٹ ڈالا تو اُس وقت کے پردھان منتری، کانگریس پارٹی کے جواہر لال نہرو کو چنتا ہوئی اور وہ مورتی انگریز حکمرانوں کی تمام مورتیوں کے ساتھ اسی کنگزوے کیمپ کے کورونیشن پارک میں رکھ دی گئی۔

آزادی کے بعد کے سالوں میں یہ پارک دھیرے دھیرے بھک منگوں، پاگلوں، کوڑھیوں، لولے

لنگڑوں، نشئیوں اور لاوارث غیر شہری انسانوں کی آوارہ آبادی کا اڈا بن گیا۔ چولھا چکی، دھن ہتھوڑا، سل بٹا اور پتا نہیں کن کن ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ان لوگوں نے سمراٹ سمیت سارے انگریز حکمرانوں کی مورتیوں کے انگ بھنگ کر ڈالے۔ کوئی سمراٹ کا سر توڑ کر لے بھاگا، کوئی ہاتھ، کوئی پیر۔ باقی مورتیاں بھی اب صرف ڈراؤنے دھڑوں کے روپ میں یہاں وہاں زمین پر بے ترتیب اگی جنگلی گھاس اور جھاڑیوں کے بیچ بکھری پڑی تھیں۔ رات گھرتے ہی پوری دلّی کے کونے کونے سے ایسے لوگوں کی آبادی اس پارک میں سمٹ آتی اور جگہ جگہ بکھری انھی ٹوٹی پھوٹی مورتیوں کے بیچ سو کر رات گذارتی۔

تو، جیسا میں نے کہا تھا، اگر آپ دلّی میں ہیں اور ایک ایسی زندگی جیتے ہیں جس میں اکثر اندیشوں کی بے انت ڈراؤنی فلم ساری رات آپ کے دماغ کے اندر چلتی رہتی ہے اور کسی بے چینی اور بدحواسی میں بھر کر آدھی رات یا بالکل تڑکے یہاں کی سڑکوں پر بے مقصد بھٹکنے لگتے ہیں تو آپ نے کنگزوے کیمپ کے کورونیشن پارک سے نکل کر دھیرے دھیرے مال روڈ پر راج گھاٹ کی طرف رینگتے انسانوں کے اس بے کنار جھنڈ کو ضرور دیکھا ہوگا۔ رات کا اندھیرا ابھی پوری طرح مٹا نہیں ہوتا، صبح کا کہرا منظر میں ایک دھندلی پراسراریت بھرتا رہتا ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ فیلینی یا انتونیونی کی کسی فلم کے کسی سرریئلسٹ شاٹ کی طرح ٹوٹے پھوٹے معذور اپاہج چھتو چھت آدھے ادھورے انسانوں کا بہت بڑا جھنڈ راج دھانی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ لگتا ہے پچھلی صدی کی کسی بڑی جنگ میں کسی شہر پر ہوئی بھیانک بمباری کے بعد زندہ بچے گھائل اور معذور لوگوں کی آبادی اُس قتل عام کے ملبے سے نکل کر کسی محفوظ زندگی کی پناہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کسی آخری جنگل کی طرف۔ یہاں سے رینگتے ہوئے وہ سورج کے نکلتے نکلتے ساری راجدھانی کے کونے کونے میں بکھر جاتے ہیں۔ انھیں آپ اسٹیشن، بس اڈے سے کر درگاہوں، مندروں، اور شہر کے ہر چوراہے اور پٹری پر دیکھ سکتے ہیں۔ یہ آبادی جھگیوں میں رہنے والی آبادی سے بالکل الگ ہے اور اس کی تعداد آزادی کے بعد لگاتار بڑھتی گئی ہے۔

نجے چورسیا کے پان والے ٹھیلے کے پاس کے نکڑ پر کبھی کبھار رنگین کاغذ کے پھول اور ہوا میں گھومنے والی پھرنگیاں بیچنے والی کانی اور سفید کوڑھ سے بھرے جتی دار چہرے والی رُوپنا منڈل بھی کنگزوے کیمپ کے اسی کورونیشن پارک میں آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی آنے والا بنا بازوؤں والا سات آٹھ سال کا بچہ سوہنا بھی اسی ناجائز آبادی کا حصہ ہے۔

تو دیکھا نا آپ نے، کہ کیسے نجے چورسیا کے پان ٹھیلے والے نکڑ سے جو سرنگ شروع ہوتی ہے وہ بائی پاس کے کھنڈر سے ہوتی ہوئی کنگزوے کیمپ تک اور پھر وہاں سے پوری راجدھانی کے کونے کونے تک پھیل جاتی ہے۔ اگر آپ اس سرنگ میں داخل ہو جائیں اور چپ چاپ چلتے چلے جائیں تو آپ

پائیں گے کہ یہ سرنگ زمین کے اندر اندر پورے ملک، اور سمندر کے اندر اندر سے گذرتی ہوئی ساری دنیا تک پھیلتی جاتی ہے۔ یہ ایک الگ طرح کا گلوبلائزیشن ہے جو اتنے ان دیکھے اور خفیہ طریقے سے ہو رہا ہے کہ اس کے بارے میں کوئی بھی سماجیات کا ماہر ابھی زیادہ نہیں جانتا۔ جو جانتے ہیں وہ چپ رہتے ہیں اور آنے والے وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس سرنگ کی شروعات سنجے چورسیا کی جس دکان سے ہوتی ہے وہ دکان میرے فلیٹ سے بس کچھ ہی قدموں کی دوری پر ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ آپ اپنے فلیٹ یا الگ تھلگ بنے کسی مکان سے باہر نکل کر کسی ایسے ہی ٹھیلے یا ریہڑی کے پاس کے جمگھٹ کو غور سے دیکھیں تو ہو سکتا ہے اس سرنگ کا کوئی دہانہ آپ کو بھی مل جائے۔

رام نواس سے ملاقات اور راز کی شروعات

اسی نکڑ پر میری ملاقات رام نواس پسیا سے ہوئی تھی۔ وہ الٰہ آباد کی ہنڈیا تحصیل کے ایک گاؤں شاہی پور سے بیس سال پہلے اپنے پتا بلّا پسیا کے ساتھ دلّی آیا تھا۔ بلا پہلے روہتک روڈ کے ایک ڈھابے میں برتن مانجھنے کا کام کرتا تھا۔ پھر آگے چل کر اس نے تندوری روٹی بنانے اور دال سبزی میں تڑکا لگانے کا کام سیکھ لیا۔ پانچ سال پہلے جنوب مغربی دلّی کے سے پور بادلی گاؤں کی جھگّی بستی میں اس نے بھی اپنی ایک جھگّی ڈال لی تھی اور اس طرح اس کا پریوار دلّی کا نواسی بن گیا تھا۔ حالانکہ وہ بستی جہاں اس کی جھگّی تھی، ناجائز بستی تھی اور کبھی بھی اس پر میونسپلٹی کا بلڈوزر چل سکتا تھا۔ لیکن پچھلے سال انتخابات کے بعد راشن کارڈ بن جانے کے بعد یہ امید بندھ گئی تھی کہ اب انھیں یہاں سے ہٹایا نہیں جائے گا۔

رام نواس پسیا کی عمر مشکل سے ستائیس اٹھائیس سال کی تھی۔ اس علاقے کے کونسلر رام لال شرما کی سفارش سے اسے نئی دلّی میونسپلٹی میں مقامی صفائی کارکن کا کام مل گیا تھا۔ اس کی ڈیوٹی جنوبی دلّی کے ساکیت علاقے میں لگی تھی۔ صبح آٹھ بجے وہ جھولے میں پلاسٹک کی لفن اور اندر روٹیاں رکھ کر ڈی ٹی سی کی بس سے دھولا کنواں کے لیے نکل جاتا اور پھر وہاں سے دوسری بس لے کر ساکیت پہنچتا۔ دفتر میں حاضری لگانے کے بعد وہ جھاڑو اور صفائی کا دوسرا سامان لے کر اس علاقے میں پہنچ جاتا جہاں اس کی ڈیوٹی ہوتی۔ دوپہر بھوک لگتی تو کسی کلچے والے سے دو روپے کے چھولے لے کر گھر سے لائی روٹی کے ساتھ بھر پیٹ کھا لیتا۔ روٹیاں اس کی پتنی بیبا بناتی تھی۔ بیبا سے اس کی شادی تب ہوئی تھی جب اس کی عمر سترہ برس کی تھی۔ اب وہ دو بچوں کا باپ بن چکا تھا— ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ اگر ایک بیٹا مر نہ گیا ہوتا تو یہ تعداد تین ہوتی۔

رام نواس سے میری ملاقات سنجے کے ٹھیلے کے پاس ہی ہوئی تھی۔ ہمارے علاقے میں اس کے آنے کی ایک خاص وجہ تھی۔ دراصل اس کا سشما نام کی لڑکی سے کچھ چکر چل رہا تھا۔ سشما گھروں میں

برتن کپڑے کا کام کرتی تھی اور سمے پور بادلی سے روز یہاں آتی تھی۔ رام نواس کئی بار اس کے ساتھ ساتھ آ جاتا اور جب تک وہ گھروں میں کام کرتی تب تک وہ نجے کے ٹھیلے سے بیڑی یا سگریٹ خرید کر سٹے کھینچتا یا رتن لال کے ٹھیلے پر چائے پیتا۔ سشما کی عمر مشکل سے سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہوگی، یعنی وہ رام نواس سے کم سے کم دس برس چھوٹی تھی۔ سانولے رنگ کے رام نواس کا جسم اکہرا تھا اور اگر فلمی ایکٹر جتیندر تھوڑا کالا، دبلا اور غریب ہو جاتا تو وہ بالکل رام نواس کی طرح ہی دِکھتا۔ سشما اسے پسند کرتی تھی، یہ دونوں کو ساتھ دیکھنے ہی سے پتا چل جاتا تھا۔

رام نواس کے ساتھ جو قصہ جڑا ہوا ہے اسی میں وہ راز ہے جو میں آپ کو بتانے جا رہا ہوں۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ آپ کسی کو بھی یہ نہ بتائیں کہ اس راز کی جانکاری آپ کو کس نے دی ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ پہلے سے ہی تمام مصیبتوں میں گھرا ہوا میں اس کے بعد کتنے بڑے جوکھم میں پھنس جاؤں گا۔

سشما کو کل بھی میں نے دیکھا تھا۔ وہ آج بھی ہمارے علاقے کے کئی گھروں میں کام کرتی ہے۔ وہ ابھی بھی پہلے کی طرح ہی ہر روز یہاں آتی ہے۔

لیکن رام نواس؟

رام نواس کئی مہینوں سے اس نکڑ پر نہیں دِکھا۔ اب وہ کہیں نہیں دِکھے گا۔ سشما بھی اس کا کوئی ذکر نہیں کرتی۔ میں نے پہلے ہی بتایا تھا کہ یہ ایک ایسا جیون ہے جس میں کبھی بھی ہر روز دکھائی دینے والا آدمی ایک دن اچانک غائب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ کبھی نہیں دکھتا۔ بعد میں اس کی یاد بھی باقی نہیں بچتی۔ اگر آپ اسے کھوجنا بھی چاہیں تو اُس زمین پر جہاں کبھی اس کا وجود ہوا کرتا تھا، وہ تھوڑا سا گیلا پن، ذرا سی نمی بھر آپ کو مشکل سے ملے گی، جو اس حقیقت کا نشان ہوگی کہ اس جگہ پر کبھی نہ کبھی ایک انسان کا جیون ضرور ہوا کرتا تھا جو اب نہیں رہا، جو اَب کبھی نہیں ہوگا۔

میں آپ کو اسی رام نواس کے بارے میں مختصراً بتانا چاہتا ہوں، یعنی رام نواس کے نہ ہونے کا سادہ سا بیان، اور اسی میں اس راز کا پہلا سرا موجود ہے جسے جاننا اس وقت ہم سب کے لیے بہت ضروری ہے۔

پچھلے سے پچھلے سال کی مئی کی پچیس تاریخ تھی۔ دن تھا منگلوار۔ اس روز ہمیشہ کی طرح رام نواس صبح ساڑھے سات بجے اپنے گھر سے تیار ہو کر ساکیت جانے کے لیے نکلا۔ اس کے گھر سے ساکیت کی دوری لگ بھگ بیالیس کلومیٹر تھی۔ اس کی پتنی بیا نے اس کے جھولے میں آج روٹیوں والے پلاسٹک کے ٹفن ڈبے کے علاوہ اسٹیل کا ایک ڈبا اور بھی رکھا تھا۔ اس میں آلو اور چھولے کی ایک مسالے دار سبزی تھی جو رام نواس کو بہت پسند تھی۔ رام نواس جب بس اسٹاپ پر پہنچا تو وہاں سشما پہلے سے ہی کھڑی تھی۔ اس

نے آج اپنا لال چنّیوں والا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور چہرے پر کریم لگا رکھی تھی۔ وہ سندر لگ رہی تھی۔ پچھلے ہفتے سنیچر کے دن وہ رام نواس کے ساتھ پہلی بار فلم دیکھنے اپنا سنیما گئی تھی اور انٹرول میں دونوں نے باہر چاٹ پاپڑی کھائی تھی۔ سنیما ہال کے اندر اور بعد میں گھر لوٹتے ہوئے بس میں رام نواس اس کے ساتھ لگا تار سٹار ہا تھا۔ وہ اس سے ہامی بھرنے کے لیے ضد کر رہا تھا۔ سشما لگا تار ٹال رہی تھی۔ لیکن بس سے اتر کر جب وہ اپنے گھر جا رہی تھی تو موڑ پر رام نواس نے کہا تھا کہ اگر وہ منگلوار کو سویرے اس بس اسٹاپ پر نہیں ملی تو سب ختم، مطلب کہ وہ رام نواس کو پسند نہیں کرتی۔

آج منگلوار ہی تھا۔ ہر روز صبح نہانے کے بعد رام نواس بیا سے رات کی بچی باسی روٹی مانگ کر کھا جاتا تھا۔ آج اس کے پیٹ میں بھوک کی جگہ ایک عجب سی بے چینی بھری ہوئی تھی جسے وہ بیا سے چھپانے کی لگا تار کوشش کر رہا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس کا دل ڈوب سا رہا تھا۔ رام نواس کو اکثر شک رہتا تھا کہ سشما اس کے بارے میں کئی طرح کی دبدھاؤں سے گذر رہی ہے۔ اسی لیے آج اسے بس اسٹاپ پر پہلے سے کھڑا دیکھ کر وہ اتنا زیادہ خوش ہوا تھا کہ سشما سے بس کے بجائے آٹو رکشا سے چلنے کی ضد کرنے لگا۔ بہت ضد کرنے پر بھی سشما اس کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ ''فالتو پیسہ پھینکنے اور کمائی میں آگ لگانے سے کیا فائدہ؟ ایسے ہی چلتے ہیں،'' سشما نے کہا۔ رام نواس اس سے مایوس ہوا کیونکہ اس کا ارادہ آٹو رکشا کی پچھلی سیٹ پر سشما سے چپکنے اور اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا تھا۔ اس کے باوجود چونکہ سشما نے آج بس اسٹاپ پر آ کر ایک طرح سے رام نواس کے لیے ہامی بھر لینے کا سگنل دے دیا تھا اس لیے اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ سچ مچ بہت خوش تھا۔ اسے اپنی اب تک کی زندگی بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔

اپنی پتنی بیا سے اس کی ہر روز چخ چخ ہوتی رہتی تھی۔ وہ بچوں کو سنبھالنے اور گھر کے کام سے ہی فرصت نہیں پاتی تھی۔ دونوں بچوں میں سے کوئی نہ کوئی ہمیشہ بیمار رہا آتا تھا۔ بڑے والے روہن کو تو اس نے شاید ہی کبھی ہنستے اور کھیلتے کودتے دیکھا ہو۔ بیا کو تو رام نواس کی تنخواہ بھی کبھی پوری نہیں پڑتی تھی، حالانکہ اس میں قصور بیا کا نہیں ان کے کنبے کی ضرورتوں کا تھا۔ پھر بھی رام نواس کو غصہ بیا پر ہی آتا۔ ''تمھارے ہاتھ میں برکت نہیں ہے۔ گوپال کو دیکھو۔ چار بچے ہیں۔ ماں باپ ہیں۔ اوپر سے ناتے رشتے دار جمع رہتے ہیں۔ مجھ سے کم تنخواہ ہے۔ لیکن تب بھی مزے سے گذارا چلتا ہے۔ اور ادھر تم، دن رات ہائے ہائے، ہائے ہائے،'' یہ وہ اکثر بیا سے کہتا۔ بیا چپ رہتے ہوئے ایسی آنکھ سے اسے گھورتی جو سارے دن رام نواس کے دماغ کے اندر چپ چاپ سلگتی رہتی۔ اسی آنکھ کے کارن وہ ایک ایک پیسہ اپنے دانتوں میں دباتا۔ بھوک لگتی تو پیٹ مسوس لیتا۔ چائے کی طلب ہوتی تو کسی کے پاس طرح طرح سے جگاڑ جماتا۔ ڈی ٹی سی میں اکثر بنا ٹکٹ سفر کرتا۔ وہ بیا کی اس کے دماغ کے اندر ہر پل سلگتی آنکھ ہی تھی جس کے کارن رام نواس کبھی ہنس نہ پاتا۔

اس منگلوار کو رام نواس نے سشما سے کہا کہ آج وہ ڈیوٹی سے جلدی لوٹ آئے گا اس لیے وہ آج دو بجے تک نجے کے ٹھیلے کے پاس اس کا انتظار کر لے۔ دونوں ساتھ ساتھ واپس لوٹیں گے۔ سشما نے پہلے تو کہا کہ وہاں پر انتظار کرنا اسے اچھا نہیں لگتا کیونکہ اسکوٹر مکینک سنتوش اس کے ساتھ ایسی ویسی بات کرتا ہے اور نجے بھی مسخری کرتا ہے، مگر بعد میں وہ اس کے لیے تیار ہو گئی۔ لیکن آج پہلی بار سشما نے رام نواس سے دھیرے سے یہ کہا کہ وہ ساکیت سے لوٹتے ہوئے انوپم سنیما کے پاس سے مرچی پکوڑی ضرور لے آئے۔ رام نواس کئی بار اس سے وہاں کی مرچی پکوڑی کا ذکر کر چکا تھا۔ سشما نے جب آج اس سے ایسا کہا تو رام نواس کو اس کی آواز میں اس پر حق جمانے جیسا اپنا پن لگا جو اس کو اچھا لگا۔ اس نے ''ہاں ہاں، دیکھوں گا، دیکھوں گا'' کہہ کر بڑی مشکل سے اس اچھا لگنے کو سشما سے چھپایا۔

جھاڑو کی موٹھ، کوٹھی کا جم سنٹر، اور گرُو کو گھورتا منگل

رام نواس اس دن کافی خوش تھا اور فلم ''کچھ کچھ ہوتا ہے'' کا گانا گا رہا تھا۔ اس نے دفتر میں اپنی حاضری لگانے کے بعد چوپڑا صاحب سے کہا کہ آج وہ جلدی گھر چلا جائے گا کیونکہ بیوی کی طبیعت خراب ہے اور اسے اسپتال لے جانا ہے۔ چوپڑا صاحب اس دن آسانی سے مان گئے تھے جبکہ ہمیشہ وہ اس میں چک چک کرتے تھے اور چھٹی کی اپیلی کیشن دینے کی ضد کرتے تھے۔ ''آج کا دن بہت قسمت والا ہے،'' رام نواس نے من میں سوچا۔

وہ ایک کوٹھی کا بڑا سا ہال تھا جس میں وہ جھاڑو لگا رہا تھا۔ اس میں جھاڑو لگانا اس کی ڈیوٹی میں شامل نہیں تھا کیونکہ وہ کوٹھی سرکار کی نہیں تھی۔ لیکن چوپڑا صاحب نے کہا تھا کہ چونکہ اس کوٹھی میں صاحب لوگ اور ان کے بیوی بچے کسرت کے لیے اور اپنا مٹاپا کم کرنے کے لیے روز آتے ہیں اس لیے رام نواس اس کو بھی صاف کر دیا کرے۔ دراصل وہ ایک جم سنٹر تھا۔ اس میں پیٹ گھٹانے، چربی چھانٹنے، کمر پتلی اور مٹاپا دور کرنے والی طرح طرح کی مشینیں رکھی تھیں۔ ساکیت میں رہنے والے بڑے بڑے لوگ اور ان کے خاندان والے اس میں صبح شام آ جاتے اور گھنٹوں چہل پہل رہتی۔ اسی کوٹھی کی پہلی منزل پر ایک بیوٹی پارلر اور ایک مساج سنٹر بھی کھل گیا تھا۔ ادھیڑ اور ادھ بوڑھے رئیس مساج سنٹر میں آ کر اپنی مالش کراتے، اور کبھی کبھی ان میں سے کچھ لڑکیوں کو اپنی کار میں باہر بھی لے جاتے۔ اس نے کئی پولیس افسروں اور نیتا لوگوں کو بھی یہاں آتے دیکھا تھا۔ سُنیلا نام کی لڑکی باہر جانے کا پانچ ہزار لیتی تھی، یہ سامنے کی نکڑ کے چائے والے گووند نے بتایا تھا۔ پتا نہیں سالے صاحب لوگ یہاں کیا کیا کرتے ہیں۔ رات بھر پارٹی چلتی ہے۔ آس پاس کی کوٹھیوں کی کئی لڑکیاں اور لڑکے اس میں رات میں آتے ہیں۔ گووند نے بتایا تھا کہ اس جم سنٹر

سے اس کی آمدنی بڑھ گئی تھی کیونکہ رات میں اکثر پیپسی اور سوڈا کی مانگ وہاں سے ہوتی۔ وہ لوگ رات میں وہاں موج مستی کرتے اور شراب پیتے۔ یہی وجہ تھی کہ رام نواس کو صفائی کے دوران وہاں کئی بار ایسی اوٹ پٹانگ چیزیں مل جاتیں جنھیں ٹھکانے لگانا بھی آسان نہ ہوتا۔

''کیا زندگی ہے صاحب لوگوں کی۔ کھا کھا کے پھول گئے ہیں اور چربی کی چھانٹ نہیں چھٹتی۔ اور کہاں اپن! گندے نالے کی مچھلی کھا لینے سے ایک بیٹے کی موت ہوگئی۔ دوسرا دوائی کے بھروسے سانس کھینچ رہا ہے،'' رام نواس نے سوچا۔ تبھی اسے سشما کی یاد آئی۔ وہ دو بجے تک نجے کے ٹھیلے پر اس کا انتظار کرے گی۔ وہ جلدی جلدی سارا کام نپٹانے کے پھیر میں لگ گیا۔

رام نواس جم سنٹر کے بڑے سے ہال کے فرش پر جھاڑو لگا رہا تھا۔ جھاڑو کی موٹھ پر بندھی ستلی کی گسان ڈھیلی پڑ گئی تھی اس لیے جھاڑو کی سینکیں بار بار کھسک جاتی تھیں۔ رام نواس پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے ہال کی دیوار پر جھاڑو کی سینکوں کو برابر کرنے کے لیے اس موٹھ کو ٹھونکا تو چونک پڑا۔ اس نے دیوار کو دوبارہ ٹھونکا تو اس کا شک پکا ہوگیا۔ عجب بات تھی، ٹھونکنے پر دیوار سے کھٹ کھٹ کی نہیں، دھپ دھپ کی آواز آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ دیوار وہاں پر کھوکھلی تھی۔ اس کے اندر پول تھا، بس اوپر سے پلستر چڑھا دیا گیا تھا۔ جس جگہ وہ دیوار تھی وہاں دو کرسیاں، ایک میز، اور جوٹ کے دو بورے رکھے ہوئے تھے۔ رام نواس نے انھیں کھسکا کر جگہ بنائی اور جھاڑو کی موٹھ کو زور سے دیوار کی اس جگہ پر ٹھونکنے لگا۔

جیسا کہ ہونا ہی تھا، پلستر میں پہلے دراڑیں پڑیں، پھر اس کے چلٹھے اکھڑنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑا سا چھید وہاں کھل گیا۔ فنائل یا کیمیکسن کی تیز بو وہاں سے چھوٹ رہی تھی۔ رام نواس نے اس کے اندر جھانک کر دیکھا تو اس کی سانس رک گئی۔ وہ ساکت رہ گیا۔ اندر نوٹ ہی نوٹ تھے — سو سو اور پانچ پانچ سو کی گڈیاں۔

اس نے اپنی آنکھیں چھید کے اور نزدیک سٹائیں۔ دیوار کے اندر کا پول بہت بڑا تھا۔ کوئی لمبی سرنگ جیسا کھوکھل اس دیوار کے اندر موجود تھا اور اس میں دور دور تک نوٹوں کی گڈیاں بھری تھیں، یہاں سے وہاں تک۔ آگے جہاں اندھیرا گہرا ہوتا تھا اس میں وہ گڈیاں ڈوب رہی تھیں۔ اندھیرے کی کالک انھیں اپنے اندر چھپا رہی تھی۔ رام نواس کا دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔ اس نے ڈرتے ہوئے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ صرف وہ تھا، اکیلا، اور ساکیت کی اس کوٹھی نمبر اے ایون، ڈی ایکس ۳۳ کے جم سنٹر کے بڑے سے ہال کی وہ دیوار اس کے سامنے تھی جس میں ایک ایسا کھوکھل اس کی جھاڑو کی موٹھ کی ٹھوکر سے اچانک کھل گیا تھا جس میں ان گنت نوٹوں کی گڈیاں بھری پڑی تھیں۔ کالا دھن... کالا دھن... کالا... کالا... کالا... اس کے کانوں میں جیسے کوئی پھسپھسا رہا تھا۔ اس کے جسم کا رواں رواں سہر

رہا تھا۔ جس چیز کے بارے میں وہ صرف سنا کرتا تھا اس وقت وہ اس کی آنکھوں کے ٹھیک سامنے سانس بھر کی دوری پر سچ مچ موجود تھی۔ یہ نہ کوئی سپنا تھا نہ کوئی قصہ۔ یہ ایک سچائی تھی جو اتفاق سے اس کی آنکھ کے سامنے اس وقت آ گئی تھی۔

رام نواس کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اس نے جنوبی کونے کی میز پر رکھا اپنا جھولا اٹھایا اور ادھر ادھر اچھی طرح دیکھ کر پانچ پانچ سو کے نوٹوں کی دو گڈیوں کو اس میں ڈال لیا۔ اس کے بعد اس نے اس کھوکھل کو ڈھکنے کے لیے وہیں پڑے جوٹ کے بورے کو کھسکا کر سٹا دیا اور اس کے سامنے میز کرسی لگا دی تاکہ کسی کو اس بارے میں پتا نہ چلے۔ پھر اس نے فرش پر اچھی طرح سے جھاڑو لگا کر پلستر کی جھاڑن اور دھول گرد کو صاف کیا اور اطمینان سے باہر نکل کر گووند کی دکان پر آ گیا۔ وہاں اس نے ایک کپ کڑک چائے پی اور دو مٹھیاں کھائیں۔

''آج گرمی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی لگ رہی ہے۔ کل تو پھر بھی ٹھیک تھا،'' اس نے گووند سے کہا۔ گووند زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا کیونکہ تبھی وہاں ایک جیپ آ کر کھڑی ہو گئی تھی جس میں بیٹھے لوگوں نے پانچ چائے اور پانچ مٹھی کا آرڈر دیا تھا۔ جیپ سرکاری تھی۔ ''گرمی تو ابھی اور بڑھے گی،'' گووند نے صرف اتنا کہا اور پتیلے میں چائے ابالنے لگ گیا۔ ابھی تک صرف ساڑھے گیارہ بجے تھے اور اس علاقے کی صفائی کا آدھا کام ابھی باقی تھا۔ لیکن رام نواس وہاں سے سیدھا اپنے دفتر پہنچا، جھاڑو جمع کی اور یہ کہہ کر کہ ''بیوی کی طبیعت کافی بگڑ گئی ہے، گھر سے فون آیا ہے،'' وہ نکل گیا۔

نوٹوں کے ایک بنڈل میں دس ہزار روپے تھے۔ یعنی رام نواس کے جھولے میں اس وقت بیس ہزار روپے موجود تھے۔ اتنا روپیہ اکٹھا اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ڈر رہا تھا، اس لیے ساکیت سے روہنی تک کے بس کے سفر میں اس نے جھولے کو کس کر اپنے پیٹ سے چپکائے رکھا۔ اگر کسی بھی شخص کے پاس تھوڑی فرصت ہوتی اور وہ رام نواس کے چہرے پر غور کرتا تو جان سکتا تھا کہ وہ کتنی گھبراہٹ اور تناؤ کی حالت میں ہے۔

بس اسٹاپ سے رکشا لے کر جب وہ سنجے کے ٹھیلے پر پہنچا تو سشما وہاں کھڑی تھی اور اسکوٹر مکینک سنتوش سے ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی۔ رام نواس کو تھوڑا سا غصہ آیا، لیکن اسے دیکھتے ہی جب سشما نے کہا کہ ''کہاں سے تجوری ہاتھ لگ گئی؟ رکشے کی عیش ہو رہی ہے آج تو،'' تو وہ گھبرا گیا۔ سشما نے پھر پوچھا، ''تم نے تو دو بجے آنے کو کہا تھا، اتنی جلدی چھٹی کیسے مل گئی؟ ابھی تو ایک بھی نہیں بجا،'' تو رام نواس ہنس پڑا۔ سشما کو دیکھ کر اور غالباً اس جگہ پہنچ کر اسے کچھ تسلی سی ہو رہی تھی۔ اس کی گھبراہٹ اچانک کم ہو گئی تھی۔

خواب میں آٹو رکشا اور مزے داری کا انوکھا پیڑ

''بھاگ آیا میں جلدی،'' اس نے کہا اور سشما کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔ سشما بھی ہنسنے جا رہی تھی لیکن اچانک اسے لگا کہ رام نواس کے ایسا کہتے ہی سنجے اور سنتوش اس کی طرف دیکھنے لگے ہیں تو وہ پہلے کی طرح ہی رہی آئی۔ ''چاے پیو گے تم لوگ؟'' رام نواس نے جب سنتوش اور سنجے سے پوچھا تو دونوں کو تعجب ہوا۔ ''بات کیا ہے بھائی؟ آج تو اوور ٹیم ملا لگتا ہے،'' سنتوش نے کہا۔ سشما کو بھی تھوڑی حیرت ہوئی کیونکہ رام نواس کو پیسے کے معاملے میں وہ مکھی چوس مانتی تھی۔ چاے یا بیڑی کے لیے جب وہ ان لوگوں کے سامنے طرح طرح کی حرکتیں کرتا تو اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن رام نواس نے اس دن سنجے اور سنتوش کو ہی نہیں، موچی دیوی دین اور سائیکل والے مدن کو بھی ایک ایک اسپیشل چاے پلائی۔

سشما نے بہت منع کیا کہ پیسے میں کیوں آگ لگاتے ہو، لیکن رام نواس نہیں مانا۔ اس نے ایک آٹو رکشا کرائے پر لیا اور سشما کے ساتھ قرول باغ، کملا نگر اور دیپ مارکیٹ گھومتا رہا۔ سشما کو اس نے پیپسی پلائی، چاٹ پاپڑی کھلائی، قرول باغ سے اس کے لیے ایک لیڈیز پرس خریدا اور کملا نگر کے کوٹلا پور روڈ سے اس کے لیے پانچ سو روپے کا شلوار سوٹ اور ایک جوڑی چنی خرید کر دی۔ سشما کو یہ سب کچھ سپنے جیسا لگ رہا تھا۔ جب جب وہ رام نواس کی طرف دیکھتی یا وہ اسے چھوتا، خوشی کا ایک تیز جھرنا اچانک پھوٹ کر اس کو اندر باہر سے نہلا ڈالتا۔ کل تک کا اداس اور پریشان رام نواس، جس کے بارے میں کئی بار وہ سوچنے لگتی تھی کہ وہ اس سے ملنا جلنا بند کر دے گی، آج کسی ناقابل یقین، سکھوں اور بے شمار رنگوں سے بھرے سپنوں کے نایک میں بدل گیا تھا۔ حالانکہ اس کی داڑھی ابھی بھی بے ترتیب بڑھی ہوئی تھی، ٹھونٹھ اگ رہے تھے، اور منھ سے تیز بیڑی کی باس آ رہی تھی، لیکن آٹو رکشا کی پچھلی سیٹ پر جب جب وہ اسے چومتا، سشما کو لگتا جیسے پھولوں کے کسی باغیچے نے اسے اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔

سشما نہیں جان پائی کہ رام نواس میں ایسی حیرت ناک تبدیلی ہوئی کیسے۔ اسے لگتا آج منگلوار کو سے پور بادلی کے بس اسٹینڈ پر آ کر اس نے ایک اچھا کام کیا، جبکہ آنے نہ آنے کے بارے میں وہ رات بھر سوچتی رہی تھی۔ اس کا فیصلہ آخر ٹھیک ہی نکلا کیونکہ اب وہ یہی سوچ کر خوشی سے سہرا اٹھتی تھی کہ دنیا میں کوئی اسے اتنا پیار کرنے والا موجود بھی ہے، اور اس سے وہ اسی کے ساتھ ہے۔ رام نواس اسے بہت بھولا اور اس کے لیے کسی چھوٹے سے بچے کی طرح بے تاب لگ رہا تھا۔ سشما جب کچھ دنوں کے بعد رام نواس کے ساتھ سونے لگی اور بعد میں اس کے بچہ بھی ٹھہرا جسے انھوں نے ناہر پور کے متل کلینک میں گروایا تب بھی آٹو رکشا کا وہ سفر اس کی یاد میں ہمیشہ رہا آیا۔ یہ ایک خواب تھا جس میں سشما اور رام نواس دو

سال پہلے مئی مہینے کی پچیس تاریخ کے اس منگلوار کو اچانک داخل ہو گئے تھے جس منگلوار کو رام نواس کو ساکیت کی کوٹھی نمبر اے ایون، ڈی ایکس ۳۳ کی دیوار کی کھوکھل میں چھپے ہوئے روپے ملے تھے۔

ہر خوشی کی جڑ نوٹوں میں ہی چھپی ہوتی ہے۔ وہیں سے مزے داری کا پیڑ پنپتا ہے جس میں سکھ اور مستی کے پھل لگتے ہیں۔ نوٹوں کی گڈیوں میں ہی شاید آدمی کی ساری اچھائیاں بھی بند ہوتی ہیں، رام نواس اکثر سوچنے لگتا۔ وہ اب بالکل نیا آدمی بن چکا تھا۔ اس کا رہنے سہنے کا ڈھنگ بدل گیا تھا۔ پہلے کے غریب، پھٹیچر اور اداس جتیندر کی جگہ اب وہ چمک دار، رنگین اور باتونی گووِندا نظر آنے لگا تھا جس کے دانت ہمیشہ نکلے رہتے تھے۔ اس کے گھر کی بھی حالت سدھر گئی تھی۔ اس کی پتنی بیبا اب ہمیشہ خوش رہتی۔ گھر میں اچھا کھانا بنتا۔ ہفتے میں کم سے کم دو بار وہ گوشت کھاتے۔ انڈا تو روز ہی جب من پڑتا وہ لے آتا۔ بچے آئس کریم مانگتے اور پاتے۔ کوئی مہمان آتا تو ہلدی رام کے نمکین برٹینیا کے بسکٹ بیبا طشتری میں رکھتی اور کہتی، ''بھائی صاحب، تھوڑا سا تو لیجیے۔'' صوفہ، ٹی وی، وی سی آر، ڈبل بیڈ، فرج وغیرہ خرید لیا گیا تھا۔ رام نواس پالیکا بازار سے ایک بد یسی سی ڈی پلیئر بھی لے آیا تھا اور کہتا تھا کہ جلد ہی بچوں کے لیے کمپیوٹر خرید لائے گا۔ وہ بتاتا تھا کہ لوگ کہتے ہیں آج کے زمانے میں کمپیوٹر سیکھے بنا کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ اپنے بچوں روہن اور اُرمیلا کے لیے وہ کمپیوٹر کورس کے بارے میں پتا لگاتا رہتا۔ وہ پلان بناتا کہ دونوں کو امریکہ بھیجے گا جہاں وہ کسی کمپنی میں کام کریں گے اور ہر مہینے کئی لاکھ کی تنخواہ پائیں گے۔

رام نواس کے ناتے رشتے دار جو کبھی اس کے پاس پھٹکتے نہیں تھے، وہ اب اکثر بال بچوں سمیت اس کے یہاں آ جاتے۔ ان کو پہلے کے گھٹیے اور پھٹیچر رام نواس میں اب سنسار کے سارے گن دکھائی دیتے جن کا بکھان وہ بیبا اور خود اُس کے سامنے اکثر کرتے۔ ذات برادری میں رام نواس کی پوچھ بڑھ گئی تھی۔ شادی بیاہ کے معاملے میں اس کی صلاح لی جاتی تھی۔ اس کے پاس چٹھیاں اور شادی بیاہ کے دعوت نامے آتے۔ وہ کہیں جاتا، کہیں نہ جاتا۔ جہاں جاتا اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی۔ ''سب اپنے ہیں بھائی، میں نے سب کو معاف کیا،'' وہ اکثر کہتا۔ اور لوگوں کی مدد کرتا۔ محاورے میں ترمیم کر کے کہیں تو یہ کہ اب رام نواس کے دن پھر گئے تھے۔

لیکن رام نواس اِدھر روز پینے لگ گیا تھا۔ سشما کے ساتھ اس کا ملنا جلنا روز کا کام ہو گیا تھا۔ بیبا ان کے تعلقات کے بارے میں جان گئی تھی لیکن چپ تھی۔ وہ رام نواس کے سبھاؤ کو اچھی طرح سے جانتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو وہ اس کو اور اپنے بچوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ اسی لیے وہ بے فکر تھی۔ کئی بار رام نواس آدھی رات کے بعد گھر لوٹتا۔ کئی بار دو تین دنوں تک کے لیے غائب رہتا۔ انھی دنوں سشما بھی اپنے گھر سے باہر ہوتی، لیکن بیبا کو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ محلے میں رام نواس کی عزت اور رتبہ بڑھ

گیا تھا۔ وہ اب سیدھے سشما کے گھر پہنچتا اور اس کی اماں بلاڑی بائی جو گھروں میں جھاڑو پوچھا اور برتن مانجھنے کا کام کرتی تھی، اس کے سامنے ہی اس سے فلم دیکھنے کے لیے چلنے کی بات کرنے لگتا تھا۔ سشما کے پاس کئی جوڑے شلوار سوٹ، سینڈل اور گہنے ہو گئے تھے۔ پہلے وہ رام نواس سے برابری کے جھگڑے کر لیتی تھی لیکن اب وہ اس کی کئی باتیں چپ چاپ برداشت کر جاتی تھی۔ اسے ڈر لگتا کہ کہیں رام نواس اس سے ناراض نہ ہو جائے۔ سشما کی اماں کئی بار اس سے کہتی، ''ایسا کب تک چلے گا؟ تو اس پر اپنا حق بنا لے۔ لوگ باتیں کرنے لگے ہیں۔'' لیکن سشما کہتی، ''اماں، کسی دوسری عورت کا بنا بنایا کھونٹا مجھ سے اجاڑا نہ جاتا۔ وہ بھی بال بچوں والا۔ ایسے ہی چلنے دے جب تک چلے۔'' اندر اندر اسے کہیں یہ یقین تھا کہ ایسا ہمیشہ چلتا رہے گا، تب تک جب تک وہ اور رام نواس دونوں زندہ رہیں گے۔

لوگ اگر رام نواس سے پوچھتے کہ اتنا پیسہ اچانک اس کے پاس کہاں سے آیا تو وہ کہتا کہ وہ ساکیت میں پانچ لاکھ کی کمیٹی چلا رہا ہے، یا یہ کہ وہ آج کل سٹے بازاری کی کمائی کر رہا ہے۔ کسی سے کہتا کہ اس کی لاٹری نکل آئی ہے۔ کسی کسی سے اس نے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ مسجد موڑ کے پاس اسے سادھو مہاراج ملے تھے جنھوں نے ایک ایسا منتر اس کے کان میں پھونکا تھا کہ سٹے کا کھلنے والا نمبر آنکھیں بند کرنے پر اسے صاف صاف دکھ جاتا ہے۔ رام نواس سے کئی لوگوں نے وہ منتر اپنے اپنے کان میں پھکوایا لیکن کسی کو وہ نمبر آنکھ موندنے پر نہیں دکھا۔ رام نواس کہتا، ''تم لوگوں کا دل صاف نہیں ہے اس لیے تمھیں نمبر نہیں دکھتا۔ کسی سے ڈاہ نہ کرو، نہ کسی کی چغلی کھاؤ، کسی کا نقصان نہ کرو، تو پھر دیکھو۔ سٹے اور لاٹری کا نمبر اپنے آپ تمھارے دماغ کے پردے پر ناچے گا،'' وہ کہتا۔

جب بھی اس کا من ہوتا، وہ اس کوٹھی کی دیوار سے نوٹوں کی گڈیاں اپنے جھولے میں بھر لاتا۔ تعجب تھا کہ اتنے دن ہو گئے تھے، ابھی تک نہ تو اس کو کسی نے ٹوکا یا پکڑا تھا، نہ اس کھوکھل سے ان گڈیوں کو اِدھر اُدھر کیا تھا۔ اتنے دن بے روک ٹوک ان روپوں کا استعمال کرتے رہنے سے رام نواس اب بے فکر ہو گیا تھا۔ اس کی ہمت بڑھ گئی تھی۔ پھر بھی کبھی کبھی اسے اندیشہ ستاتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دن ان روپوں کا اصلی مالک آ جائے اور وہاں سے اپنی چھپی ہوئی دولت لے کر چل دے۔ اسی لیے اس نے سمجھ داری اور دوراندیشی کے ساتھ دو کام کیے۔ ایک تو اس نے لونی بارڈر میں پانچ سو گز کا ایک پلاٹ اپنی پتنی بیلا پسیا کے نام خریدا، اور دوسرے اس نے تین لاکھ روپے کی فکسڈ ڈپازٹ تین چار بینکوں میں الگ الگ نام سے جمع کر دی۔ ان میں سے پچاس ہزار کی ایک ڈپازٹ سشما کے نام سے بھی تھی جس نے اب رام نواس کے ساتھ اسی طرح ہمیشہ رہ آنے کا من بنا لیا تھا۔

تاج محل میں پیار، باز کی آنکھیں اور پولیس

یہ واقعہ سات آٹھ مہینے پہلے کا ہے۔ رام نواس نے سشما کے ساتھ آگرہ اور جے پور گھومنے اور تاج محل کے سامنے فوٹو کھنچوانے کا پروگرام بنایا۔ دو تین دن وہ موج مستی کرنا چاہتا تھا۔ سشما اس کے لیے فوراً تیار ہو گئی۔ دونوں ٹرین سے آگرہ پہنچے۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی انھیں ایک ٹیکسی والا مل گیا۔ اس سے رام نواس نے کسی ہوٹل لے چلنے کے لیے کہا۔ ''کیسا ہوٹل چلے گا؟'' یہ پوچھتے ہوئے اس ٹیکسی والے نے جس نگاہ سے رام نواس کو گھورا اس سے رام نواس کو لگا وہ اسے کوئی بھک منگا یا معمولی آدمی سمجھ رہا ہے۔ ''کوئی بھی اچھا، ٹاپ کا ہوٹل۔ کسی سڑے گلے سڑک چھاپ میں مت لے چلنا،'' رام نواس نے کڑی اور رعب دار آواز میں کہا۔ ٹیکسی والے نے، جو دیکھنے میں چالیس پینتالیس سال کا کوئی خرانٹ لگ رہا تھا، جس کی آنکھیں بھوری تھیں اور ان میں کسی شکاری باز کی آنکھوں کی چمک تھی، اس کی طرف مسکراتے ہوئے طنز سے دیکھا اور کہا، ''تھری اسٹار چلے گا؟ پاس میں ہی ہے۔'' اس نے سوچا ہوگا کہ تھری اسٹار کا نام سنتے ہی رام نواس کی گرمی اتر جائے گی۔ لیکن جب رام نواس نے اس سے ٹھنڈی آواز میں کہا کہ ''لے چل میرے بھائی، جدھر بھی تیرا دل کرے۔ تھری اسٹار، فائیو اسٹار یا سکس اسٹار۔ لیکن جلدی کر۔ میرے کو ابھی ترنت نہانا ہے، گرم پانی میں اور اس کے پاس بٹر چکن سونٹنا ہے، ڈبل پلیٹ،'' تو ٹیکسی والے خرانٹ نے اسے گہری آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے بعد اتنی ہی چیرتی ہوئی چیل جیسی نظر اس نے سشما پر ڈالی اور اطمینان میں تھوڑا سا طنز ملا کر بولا، ''چلتا ہوں مالک، آپ گیزر میں نہیں گرم پانی کے ٹب میں نہانا۔ ہم آپ کو ایسے ہوٹل میں پہنچائیں گے کہ بٹر چکن ہی نہیں، جو آپ منگاؤ گے سب ملے گا۔'' اس کی اس بات پر ہنس کر رام نواس نے کہا، ''اب آ گئے نا لائن میں۔ اب چل، جلدی گڈی ہانک۔''

راستے میں ٹیکسی والے نے پھر پوچھا، ''آنا کہاں سے ہوا صاحب جی؟''

''دلّی واسی ہے اپن۔ تم ہمیں یوپی کا سمجھ رہے تھے کیا؟ یا ایم پی سی پی کا؟'' رام نواس نے تڑی ماری اور فاتح کی طرح سشما کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''آگرہ تو ہم آتے ہی رہتے ہیں۔ آفس کی گاڑی سے۔ مہینے پندرہ دن میں۔'' رام نواس ڈرا کہ اگر اب کہیں خرانٹ نے اس کی پوسٹ کے بارے میں پوچھا تو وہ کیا بتائے گا۔ چترتھ شرینی؟ سوچتا کرمی؟ جھاڑو لگانے والا مہتر؟ صفائی کرم چاری؟ لیکن خرانٹ نے آگے کچھ نہیں پوچھا۔

ہوٹل جب آ گیا اور رام نواس ٹیکسی کی ڈگی سے سامان نکلوا رہا تھا تو ٹیکسی والے نے کہا، ''آپ پہلے جا کر پتا تو کر لو کہ روم خالی ہے کہ نہیں۔ نہیں تو پھر اگلا ہوٹل دیکھیں گے۔''

رام نواس سشما کو ٹیکسی ہی میں چھوڑ کر اندر گیا۔ کاؤنٹر پر جب کمرے کا ریٹ پوچھا تو اس کا من

ایک بار تو ہوا کہ کوئی دوسرا سستا سا ہوٹل دیکھ لے، لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا اور پندرہ سو روز کے کرائے والا اے سی ڈبل بیڈ بک کرا لیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے آدمی نے اسے روم دیکھنے کے لیے اوپر بھیج دیا اور ہوٹل کے ایک لڑکے کو ٹیکسی سے سامان لانے روانہ کر دیا۔

سامان کے ساتھ سشما جب آئی تو وہ تھوڑی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ ''کیسی جگہ تم لے آئے؟ ہر چیز کانچ جیسی کچ کچ چمکتی ہے۔ لگتا ہے کسی چیز کو چھوا تو وہ گندی ہو جائے گی۔ یہ سامان لے کر آنے والا لڑکا بھی میرے کو صحیح نہیں لگ رہا تھا،'' سشما نے دھیرے سے اس سے کہا۔ ہوٹل کا لڑکا جب سامان رکھ کر اور پانی کا جگ اٹھا کر چلا گیا تو رام نواس نے سشما سے کہا، ''مست رہ اور فکر نہ کر۔ جب تک ٹینٹ میں مال ہے تب تک ڈرنے کی کیا بات ہے۔'' اس کے بعد اس نے پیار سے کہا، ''آ جا، ایک پچی دے دے اور تھیلے سے بوتل نکال۔''

رات کے ساڑھے دس بجے ہوں گے جب کسی نے گھنٹی بجائی۔ اس کے پہلے دن میں رام نواس سشما کے ساتھ تاج محل دیکھ آیا تھا، وہاں الگ الگ پوز میں اس کے ساتھ فوٹو کھنچوائے تھے اور راستے میں انٹ شنٹ خریداری بھی کی تھی۔ سشما کے لیے اور چیزوں کے علاوہ اس نے فیروز آبادی چوڑیوں کے سیٹ بھی لیے تھے جس سے وہ بہت خوش تھی۔

''اتنی رات میں کون آ مرا؟'' رام نواس سوچ رہا تھا۔ اس نے روم کا دروازہ کھولا تو دو پولیس والے وہاں کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک انسپکٹر تھا، دوسرا سپاہی۔

''لڑکی ہے ساتھ میں؟'' انسپکٹر نے ڈانٹتی ہوئی آواز میں رام نواس سے پوچھا۔

''ہاں،'' رام نواس نے کہا۔ انسپکٹر اور سپاہی روم کے اندر آ گئے۔ انسپکٹر کی وردی پر چھاتی کی پاکٹ کے ٹھیک اوپر وی این بھاردواج کی پٹی لگی تھی۔ وہ جس بے شرمی سے سشما کو گھور رہا تھا اس سے رام نواس کو غصہ تو بہت آ رہا تھا، لیکن اس کے اندر ڈر بھی تھا۔ سشما نے گلابی رنگ کی نائٹی پہن رکھی تھی جو نائلون کی تھی جس کے اندر سے کملا نگر سے خریدی گئی کالے رنگ کی بریزیئر صاف جھلک رہی تھی۔ سشما کا رنگ بھی گورا ہی کہا جا سکتا تھا۔

''تمھاری بیوی تو نہیں لگتی۔ کہاں سے اٹھا لائے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔ لگ بھگ گول چہرے، مچمچی کائیاں آنکھوں اور خضاب سے بے تحاشا رنگے کالے بالوں اور موٹی کھال والا وہ آدمی پہلی ہی نظر میں کوئی گھاگ، چالباز اور لفنگا لگتا تھا۔

''ہمارے پڑوس ہی میں رہتی ہے۔ سالی لگتی ہے ساب،'' رام نواس نے کہا۔ اس سے جھوٹ نہیں بولا جا رہا تھا۔ اس کی آواز میں گھبراہٹ اور شرافت کے بیچ سے پیدا ہونے والی کمزوری تھی۔

''بوتل بھی ہے؟'' انسپکٹر نے میز پر رکھے ڈپلومیٹ کے ادھے کو گھورا۔ پھر چھیدتی ہوئی نگاہ سے سشما کو دیکھتے ہوئے کہا، ''بھگا کے لا رہے ہو اسے؟ دیکھنے میں تو نابالغ لگتی ہے۔ کیا عمر ہے تیری؟'' اس نے سشما سے پوچھا۔

''سترہ سال،'' سشما ڈر گئی تھی۔ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ کوئی انہونی آج ہونے جا رہی ہے جس میں وہ اور رام نواس دونوں برباد ہو جائیں گے۔

''چلو تھانے، تم دونوں۔ میڈیکل سے سب پتا چل جائے گا کہ کتنی موج مستی کی ہے۔ تین سو پچھتر چھبتر بنے گا،'' انسپکٹر نے کہا۔ اس کے بعد کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس نے رام نواس کی طرف دیکھا۔ ''پیسہ کہاں سے اُڑایا؟ تھری اسٹار کے اے سی کمرے میں رکنے کی اوقات تو نہیں لگتی تمھاری۔ کہیں سیندھ ماری کیا؟ یا کسی کو چونا لگایا؟''

رام نواس نے پی رکھی تھی۔ ایسے میں اس کی ہمت بڑھنی چاہیے تھی لیکن سشما نے اپنی عمر صحیح بتا کر اسے انجانے میں پھنسا ڈالا تھا۔ اب وہ خود کو پولیس کے جال میں الجھا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ آخر سوچ سمجھ کر وہ مسکرایا۔ ''کیا چلے گا ساب؟ ادھا تو خالی ہو گیا۔''

''وہ تو ہوٹل سے آ جائے گا۔ پر ابھی تو دونوں تھانے چلو۔ چلو تیار ہو جاؤ۔ اور کیا یہ ایسے ہی چلیں گی؟ اپنی باڈِس جھلکاتی ہوئی؟'' انسپکٹر نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''تھانے کا کیا ہے ساب۔ وہ تو جہاں آپ ہو وہی تھانہ ہوا۔ یہیں نپٹا لیتے ہیں،'' ہنستے ہوئے رام نواس نے کہا۔ اس کو اپنے اوپر تعجب ہوا۔ اب تک کہاں چھپا تھا اس کے اندر کا یہ ہنر؟ اس نے پلنگ کے پاس کھڑے سپاہی کی طرف حمایت جٹانے کے لیے دیکھا، اسے پٹانے کے انداز میں۔ سپاہی سشما کو گھورنے میں لگا ہوا تھا۔ رام نواس سے آنکھ ملنے پر اس نے تھوڑا سا سر ہلایا اور مسکرایا۔ ''چھوکرے ہیں بے چارے بھاردواج ساب۔ تاج محل دیکھنے آئے ہیں۔ کھانے پینے دو۔ اپن بھی ذرا ٹائم پاس کر لیتے ہیں ان کے ساتھ۔ بول بھائی، کوئی اعتراض تو نہیں تیرے کو؟''

رام نواس کو سپاہی کے ارادے ٹھیک نہیں لگے۔ اسے اس بے وجہ کی مصیبت کے باوجود غصہ آ گیا۔ ''دیکھو، کھانے پینے کی جہاں تک بات ہے، بھاردواج ساب حکم کریں، جو جو چاہو گے آپ لوگ، سب آرڈر ہو جائے گا۔ یہ میری سچ میں سالی لگتی ہے ساب۔ میرا یقین کرو آپ لوگ۔ قسم سے۔''

انسپکٹر پہلی بار ہنسا۔ ''کیوں بھائی، اے سی کمرے میں اپنی نابالغ سالی کے ساتھ دارو کا ادھا سونٹ کر بھنجن کر رہا تھا تو؟ اچھا چل، آرسی کی ایک فل بوتل اور کھانے کے لیے چکن شکن کا آرڈر بول کے آ جا۔ ... اچھا تو ٹھہر، میں یہیں سے بولتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر نے پلنگ پر چڑھ کر سرھانے کے انٹرکام سے ہوٹل

کے کاؤنٹر کو فون کیا اور وہیں پسر کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی بیلٹ ڈھیلی کر لی اور پھر پلنگ کے پائنتانے پر سمٹی بیٹھی سشما کی طرف دیکھ کر کہا، ''اور تو تو جا کر اس کونے کی کرسی پر اِدھر پیٹھ پھیر کر بیٹھ جا۔ دماغ مت خراب کر۔ دارو چڑھ گئی تو کنٹرول ہٹ جائے گا۔ پھر دونوں ہمارے نام کو روؤ گے۔ ویسے ہی آگرہ میں فرنگی ٹورسٹوں کو دیکھ دیکھ کر دل ڈولتا رہتا ہے سالا۔'' سپاہی اس بات پر ہنسا، زوروں سے۔

ڈیڑھ گھنٹے میں پوری بوتل خالی ہوگئی۔ رام نواس اڈھا تو پہلے ہی چڑھا چکا تھا۔ تین پیگ پولیس والوں کے ساتھ اور پی گیا۔ اسے ہوش نہیں تھا کہ وہ نشے میں کیا کیا بولتا رہا۔ انسپکٹر بھاردواج اور وہ سپاہی لگ بھگ بارہ بجے رات تک اس کے کمرے سے گئے۔ پانچ سو روپے پر بات ٹوٹی۔ بعد میں سپاہی نے بھی سو روپے الگ سے جھٹکے۔ پولیس والوں کے جاتے جاتے رام نواس تھک چکا تھا اور نشہ اس کے دماغ کو اندر سے کسی چکری کی طرح گھما رہا تھا۔ اسے چکر آنے لگا۔ سشما اسے سنبھال کر باتھ روم تک لے گئی کہ اس کے سر پر ٹھنڈا پانی ڈال دے لیکن رام نواس وہیں فرش پر بیٹھ گیا اور بے تحاشا الٹیاں کرنے لگ گیا۔ اس کے گلے سے سارا بٹر چکن، نان اور پلاؤ نکل رہا تھا۔ الٹی کرنے کے بعد جب اس نے سشما کو اپنے پاس کھینچا تو اس کی آنکھوں کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سیدھا بستر پر اوندھے منہ گرا اور اس کی ناک اور گلے سے جلد ہی ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے کسی میلوں کے سفر سے تھکے ہوئے گھوڑے کو دمے کی سینک آ رہی ہو۔

سویرے سشما نے جب اسے بتایا کہ وہ رات میں نشے میں پولیس والوں کو ساکیت کی کسی کوٹھی کی دیوار کی کھوکھل میں چھپے نوٹوں کے بارے میں بتا رہا تھا تو رام نواس کے ہوش اڑ گئے۔ کتنی ہوشیاری اور سمجھ داری سے اس نے یہ راز اب تک چھپائے رکھا تھا، یہاں تک کہ سشما اور اپنی بیوی تک کو اس نے اس کی بھنک نہیں لگنے دی تھی۔ آخر کر دیا نا دارو نے سارا گڑ گوبر۔ اس نے سشما سے طبیعت بگڑنے اور دلّی میں ایک ضروری کام کا بہانہ بنایا اور جے پور گھومنے کا پروگرام کینسل کرا اگلی ہی گاڑی سے دلّی لوٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

بدھ جینتی پارک، بنا نمبر کی ایسٹیم، اور آخری بیڑی

جیسا کہ اسے اندیشہ تھا، اگلے ہی دن سویرے سویرے جب وہ ڈیوٹی پر جانے کے لیے گھر سے نکل رہا تھا، پولیس کی جپسی گاڑی اس کے گھر آ گئی۔ ''اے سی پی صاحب نے بلایا ہے،'' اس انسپکٹر نے کہا جس کی چھاتی کی جیب کے اوپر ڈی کے تیاگی لکھا ہوا تھا۔ رام نواس نے جپسی کے اندر بیٹھے ہوئے ہی سمے پور بادلی کے اُس بس اسٹاپ کو دیکھا جہاں سے ہر روز وہ دھولا کنواں کے لیے بس لیتا تھا۔ سشما وہاں اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

سات آٹھ مہینے پہلے وہ شاید منگلوار کا ہی دن تھا۔ اُس دن ہلکے ہلکے بادل آسمان میں چھائے ہوے تھے اور کبھی بھی بوندا باندی ہو سکتی تھی۔ سنجے چورسیا کے اُسی پان ٹھیلے کے پاس رام نواس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ سشما سے ملنے آیا تھا۔ ایسے موسم میں جب بادل گھرے ہوں، بوندا باندی کے آثار ہوں اور ہوا بھاری ہو گئی ہو، رام نواس کہا کرتا تھا، ''آج تو لگتا ہے موسم سیٹی بجا رہا ہے۔'' ایسے میں وہ سشما کے ساتھ آٹو رکشا میں گھوما کرتا تھا اور دنیا بھر کی اول جلول چیزیں اسے کھلاتا رہتا تھا۔ لیکن آج وہ بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس نے تین چار سگریٹیں پھونک ڈالیں۔ بار بار کسی بے چینی میں وہ اپنی انگلیاں چٹخانے لگتا تھا۔ ایسا لگتا جیسے اس کے اندر کوئی تیز اتھل پتھل مچی ہوئی ہے۔ میں نے رتن لال سے دو اسپیشل چائے منگوائیں۔ رام نواس کتنا پریشان تھا اس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب اس نے لگ بھگ کھولتی ہوئی چائے سیدھے اپنے حلق میں انڈیل لی۔ چائے سے اس کا گلا اور منھ جل گیا۔

اس وقت دو ڈھائی بجے ہوں گے جب رام نواس نے بہت التجا بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہا، ''ونایک جی، میں ایک بہت بڑے جنجال میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے تم کسی طرح اس سے باہر نکالو۔ جب تک زندگی رہے گی تمھارا احسان مانوں گا۔''

میں نے اس سے پوچھا کہ آخر بات کیا ہے، تو اس نے مجھے اس دن جو کچھ بتایا تھا وہی میں نے آپ کو اوپر بتایا ہے۔ اس کی بات ختم ہوئی ہی تھی اور میں اس کو وہ حل بتانے ہی والا تھا جس سے وہ اس جنجال سے باہر نکل سکتا تھا، کہ ٹھیک اسی وقت سشما وہاں آ گئی۔ ''ابھی میں چلتا ہوں۔ کل سویرے تم سے اسی جگہ ملوں گا،'' رام نواس نے مجھ سے کہا، اور وہ دونوں ایک ہی رکشے پر بیٹھ کر چلے گئے۔ دونوں کی جاتی ہوئی پیٹھ رکشے پر جب تک دکھائی دیتی رہی میں دیکھتا رہا۔

رام نواس سے میری وہ آخری ملاقات تھی۔ وہ پھر اس نکڑ پر کبھی نہیں لوٹا۔ اب وہ کبھی نہیں لوٹے گا۔ اس کے بارے میں آپ یہاں کسی سے بھی پوچھیں گے تو کوئی کچھ نہیں بتائے گا۔ نہ پان کے ٹھیلے والا سنجے چورسیا، نہ چائے والا رتن لال، نہ موچی دیوی دین، نہ اسکوٹر مکینک سنتوش اور نہ سائیکل میں پنکچر لگانے والا مدن۔ آپ اگر اس نکڑ سے چل کر بائی پاس کے اس سولھویں صدی کے کھنڈر تک بھی پہنچیں تو وہاں سلیمن، سومالی، بھوسن، تلک یا رضوان سے رام نواس کے بارے میں پوچھیں تو کوئی کچھ نہیں بتائے گا۔ رنگین کاغذ کی پھرنگیاں بیچنے والی کانی اور سفید چتی دار چہرے والی روپنا منڈل، یا اپنے پتی گلشن کے ساتھ روز شام کو ابلے انڈے بیچنے والی راج وتی بھی آپ کے سوال کو ٹال جائے گی۔

یہاں تک کہ ہر صبح سے پور بادلی سے یہاں آنے والی اور اِدھر کے فلیٹوں میں برتن کپڑا کرنے والی گوری چھریری سشما بھی بنا کچھ بولے چپ چاپ تیز چال سے آگے بڑھ جائے گی۔ آج کل وہ اسکوٹر مکینک سنتوش کے ساتھ کئی بار آٹو رکشا میں گھومتی ہوئی دکھتی ہے۔ دونوں کو پچھلے ہفتے میں نے شیلا سنیما کے پاس چاٹ پاپڑی کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ جیون ایسے ہی چلتا ہے۔

اگر آپ سمے پور بادلی کے گندے نالے کے پاس بسی اس جھگی بستی تک پہنچیں اور وہاں کسی طرح اُس پٹرے کا پتا لگالیں جسے رام نواس نے پکے مکان میں بدل دیا تھا اور جہاں اس کی پتنی بیا اپنے بیمار بیٹے روہن اور بیٹی اُرمیلا کے ساتھ رہتی ہے اور اس سے آپ رام نواس کے بارے میں پوچھیں تو وہ پتھر جیسے سپاٹ چہرے کے ساتھ کہے گی، ''گھر میں نہیں ہیں، باہر گئے ہیں۔'' اگر آپ نے پوچھا کہ کب تک لوٹیں گے تو بیا ''ہمیں پتا نہیں ہے'' کہہ کر گھر کے اندر چلی جائے گی۔

ساکیت میں نئی دلّی میونسپلٹی کے دفتر میں جہاں رام نواس کام کرتا تھا، اگر آپ چوپڑا صاحب یا کسی اہلکار سے اس نام کے آدمی کے بارے میں پوچھیں تو ان کا جواب ہوگا، ''یہاں ڈیلی ویجز پر کام کرنے والے سیکڑوں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہم کس کس کا نام یاد رکھیں۔''

یہ سچ ہے کہ دلّی میں اب رام نواس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ اب وہ کہیں نہیں ہے۔ اس کا کوئی نشان کہیں باقی نہیں ہے۔ لیکن رکیے، میں آپ کو رام نواس کے بارے میں وہ آخری اطلاع دیتا ہوں جس کے اندر وہ راز موجود ہے جسے آپ تک پہنچانے کے لیے ہی میں نے اس کہانی کی اوٹ لی تھی۔

ابھی اسی سال، یعنی سن ۲۰۰۱ء کے ۲۷ جون کا دلّی سے نکلنے والا کوئی بھی ہندی انگریزی کا اخبار، ''انڈین نیوز''، ''ایکسپریس''، ''ٹائمز آف میٹرو انڈیا''، یا ''شتابدی سنچار ٹائمز'' اٹھا لیجیے اور تیسرے صفحے کو کھولیے، وہیں جہاں اس مہانگر کی مقامی خبریں چھپتی ہیں۔ اُس روز اِس صفحے پر داہنی طرف، دو کالم کی چوڑائی گھیرتا، ایک چھوٹا سا فوٹوگراف چھپا ہے اور اس کے نیچے ایک مختصر سی خبر۔ بیس پوائنٹ بولڈ میں اس خبر کی سرخی ہے: ''رابرز کلڈ ان اینکاؤنٹر''، اور اس کے نیچے سولہ پوائنٹ میں ذیلی سرخی ہے: ''پولیس ری کورز بگ منی فرام کار''۔ اس خبر کو اخبار کے مقامی کرائم رپورٹر کے حوالے سے چھاپا گیا ہے جس کے مطابق پولیس نے کل رات راجدھانی دلّی میں دھولا کنواں سے راجیند نگر اور قرول باغ جانے والی رِنگ روڈ پر بدھ جینتی پارک کے قریب ایک بنا نمبر پلیٹ والی ایسٹیم کار کو روکا۔ کار میں سوار لوگوں نے رکنے کے بجائے پولیس پر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ پولیس کی جوابی کارروائی میں دو مجرم موقعے پر مارے گئے جبکہ تین دوسرے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر بھاگنے میں کامیاب رہے۔ مرنے والوں میں ایک جالندھر کا بدنام مجرم کلدیپ عرف کلّا ہے، دوسرے کی پہچان نہیں ہو پائی ہے۔ پولیس کے ڈپٹی کمشنر سروال نے بتایا کہ پولیس

نے کار کی ڈگی سے تینیس لاکھ روپے برآمد کیے ہیں۔ اس میں بڑی تعداد میں پانچ پانچ سو کے جعلی نوٹ بھی شامل ہیں۔ یہ پچھلے کچھ سالوں میں ملنے والی پولیس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ پولیس کے ڈپٹی کمشنر نے اس سلسلے میں آگرہ پولیس سے ملی اطلاعات کو اس کامیابی کے لیے اہم قرار دیا۔

اگر آپ اس خبر کے اوپر چھپے فوٹو گراف کو غور سے دیکھیں تو پائیں گے کہ بدھ جینتی پارک کے ٹھیک سامنے جو کار کھڑی ہوئی ہے اس کے اگلے اور پچھلے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ کار کے اگلے پہیے کے پاس ایک آدمی اوندھا پڑا ہوا ہے۔ اس کے سر پر پگڑی ہے۔ اور کار کے پچھلے دروازے کے ٹھیک سامنے جو آدمی مرا پڑا ہے، اس کا سر آسمان کی طرف ہے۔ آپ اس آدمی کے چہرے کو غور سے دیکھیں، اگر لینس کی مدد لے سکیں یا فوٹو انلارج کرا سکیں تو اور بہتر ہوگا۔

کار کے پچھلے دروازے کے سامنے سڑک پر مرا ہوا آدمی جس کا سر آسمان کی طرف ہے، اور جس کا منھ کھلا ہوا ہے، پینٹ کھسک گئی ہے اور شرٹ کے بٹن کھلے ہوئے ہیں اور جس کی چھاتی پولیس کی گولیوں سے لہولہان ہے، وہ کوئی اور نہیں رام نواس ہی ہے۔ یہی وہ مجرم تھا جس کی شناخت آج تک نہیں ہو پائی ہے۔

اس کی شناخت اب کبھی نہیں ہو پائے گی کیونکہ اسے کوئی نہیں پہچانے گا۔

راز کا انکشاف، سبل، کدال اور اولیا کی درگاہ

اب آپ یہ جانیں کہ اس دن جس دن یہ پولیس مقابلہ ہوا، اس سے لگ بھگ دو گھنٹے پہلے کیا ہوا تھا۔

ساکیت کی کوٹھی نمبر اے ایون، ڈی ایکس ۳۳ کے پاس کے نکڑ پر چائے کی دکان چلانے والے گووند نے بتایا تھا کہ اُس رات لگ بھگ دس بجے پولیس کی ایک جیپی وہاں آئی تھی۔ اس میں دو پولیس والوں کے علاوہ تین سادہ کپڑوں والے لوگ بھی تھے۔ انھوں نے جم سنٹر سے لڑکے لڑکیوں کو نکال دیا تھا اور لوٹ گئے تھے۔ اس کے ایک گھنٹے بعد جب وہ اپنی دکان بند کر رہا تھا، تبھی ایک ایسٹیم یہاں آ کر رکی تھی۔ اس پر کوئی نمبر پلیٹ نہیں تھی۔ اس میں سے منجھولے قد کے ایک سردار جی اترے تھے۔

اور پچھلی سیٹ سے ان کے پیچھے پیچھے اترا تھا رام نواس۔ وہ لوگ اس کوٹھی کے اندر چلے گئے تھے اور لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے تک وہاں تھے۔ وہ دونوں اندر سے کوئی چیز بار بار ڈھو کر کار کی ڈگی اور پچھلی سیٹ کی جگہ میں بھر رہے تھے۔ سامنے ایک موڑ پر جہاں کھنہ انٹرنیشنل ٹریولز اینڈ کوریئرز کی دکان ہے، اس کے سامنے ایک لال بتی والی ایمبیسیڈر اسی وقت آ کر کھڑی ہوگئی تھی اور اسٹیم کے جاتے ہی اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی تھی۔

گووند نے بتایا تھا کہ بنا نمبر پلیٹ کی کاہی رنگ کی ایسٹیم جب اس کوٹھی سے لوٹ رہی تھی تو اس وقت وہ دکان بند کر کے گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ایسٹیم ٹھیک اس کی بغل میں آ کر رکی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھے رام نواس نے اس سے بیڑی مانگی۔ گووند نے گنیش چھاپ بیڑی کا آدھا کھلا ہوا بنڈل جو اس کی جیب میں اس وقت پڑا ہوا تھا، اسے دیا۔

گووند نے بتایا کہ رام نواس بہت گھبرایا ہوا اور پریشان لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ایسی لگ رہی تھیں جیسے مُردوں کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ وہ اس سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک جھٹکے میں ایسٹیم آگے بڑھ گئی۔ اسے وہ سردار چلا رہا تھا۔

دھولا کنواں کے چوراہے سے اگر آپ رِنگ روڈ یعنی مہاتما گاندھی مارگ کی طرف نہ مڑیں اور اس کی اگلی سڑک پر بائیں گھوم جائیں تو وہی رِنگ روڈ ہے۔ اسی پر بدھ جینتی پارک کے سامنے وہ واقعہ ہوا جس کی تصویر اور خبر اخبار میں چھپی ہے۔

رام نواس نے ساکیت کی کوٹھی نمبر اے ایون، ڈی ایکس ۳۳ کے جم سنٹر والے ہال کی دیوار کے کھوکھل کے بارے میں جو جانکاری دی تھی اس کے مطابق اس کھوکھل کا سائز کافی بڑا ہونا چاہیے۔ میرا اندازہ ہے کہ گری سے گری حالت میں اس کی لمبائی لگ بھگ بارہ فٹ اور اونچائی چار ساڑھے چار فٹ ہونی چاہیے۔ رام نواس نے بتایا تھا کہ وہ جگہ پانچ پانچ سو اور سو سو کے نوٹوں کی گڈیوں سے ٹھساٹھس بھری ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے میرا اندازہ ہے کہ اس میں کم سے کم دس پندرہ کروڑ روپے رہے ہوں گے۔

یہ انھی دنوں کی بات ہے جب پچھلی سرکار کے ایک مرکزی وزیر کے گھر اور دوسرے ٹھکانوں پر نئی سرکار نے سی بی آئی کے چھاپے ڈلوائے تھے۔ اس وزیر پر ہائی ٹیک آلات کی خریداری اور ٹھیکے کے سلسلے میں کسی غیر ملکی کمپنی سے کئی سو کروڑ روپے لینے کا الزام لگا تھا۔ اسے کچھ دنوں کے لیے جیل بھی جانا پڑا تھا۔ بعد میں وہ وزیر اسی نئی سرکار میں شامل ہو گیا تھا جو اس کے خلاف جانچ کر رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ سارا روپیہ جسے کسی آسمانی ستارے کے کسی خاص جگہ ہونے یا اپنی قسمت یا محض اتفاق کے باعث رام نواس نے اپنی جھاڑو کی موٹھ کی سینک ڈھیلی ہو جانے کی وجہ سے وہاں کی دیوار کو ٹھونکتے ہوئے اس کھوکھل کو کھوج نکالنے پر اچانک ہی اس دن دیکھ ڈالا تھا، وہ سارا روپیہ سی بی آئی کے چھاپوں اور انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے وہاں چھپایا گیا تھا۔ یعنی وہ ساری دولت ایسی تھی جس کا کوئی اندراج کہیں نہیں ہوتا۔ ان اکاؤنٹڈ منی۔ اسی کو کالا دھن کہتے ہیں۔

نجے چورسیا کے پان والے ٹھیلے کے داہنی طرف سائیکل کا پنکچر جوڑنے والے مدن کے نزدیک ہی پچھلے کچھ دنوں سے پٹری پر دری بچھا کر بیٹھنے والے جیوتشی پنڈت دین دیال اپادھیائے سے میں نے

رازدارانہ طریقے سے اس بابت بات چیت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر گرو تیسرے گھر میں ہوں اور منگل کو نہار رہے ہوں اور چھٹے گھر میں منگل شکر کو باری باری نہار رہا ہو، اور اگر مہینے کا کرشن پکش چل رہا ہو، اور اتفاق سے تتھی چترتھی یا نومی ہو، تو کدیل کی خاص کرپا ہوتی ہے اور بے شمار دھن یا گڑی ہوئی تجوری ملنے کا قوی امکان ہوتا ہے۔

پنڈت دین دیال اپادھیائے نے، جو بلیا سے آئے ہوئے ہیں، اور ناہر پور کے نالے کے پاس ایک پُرے میں کرائے پر رہتے ہیں، مجھے میری قسمت کے بارے میں بتا رکھا ہے کہ ابھی میرے ستارے ناموافق ہیں۔ مجھے لگتا ہے اُس سال پچیس مئی کے منگلوار کو غالباً رام نواس کے اوپر ایسی ہی کسی کیفیت میں کُبیر نے نظر ڈالی ہوگی جس نے اس کی قسمت کو بالکل بدل ڈالا۔ ورنہ آپ خود ہی سوچیے کہ کوڑا کچرا اور گندگی صاف کرنے والی ایک معمولی جھاڑو کی موٹھ کی تلی کی کسان ڈھیلی پڑ جانے کی وجہ سے گھاس کے تنکوں کی سینکوں کو برابر کرنے کے لیے ایک نہایت عام سی دیوار کو ٹھونکتے ہی اسے نوٹوں کی گڈیاں اچانک اس طرح کیسے مل جاتیں؟ ورنہ وہ کیسے کچھ مہینوں کے لیے اپنے سپنوں اور آرزوؤں کی دنیا میں داخل ہو پاتا، اپنی پتنی بیبا، بیٹے روہن، اور بیٹی اُرمیلا کو بھرپیٹ کھانے اور من پسند پہننے کا سکھ دے پاتا، اور اپنی نابالغ پریکا سشما کو طرح طرح کے رنگوں سے جگمگاتی دھنک کے اُس لوک میں کیسے لے جاتا جہاں ایک تاج محل بھی تھا اور جہاں دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کئی مدراؤں میں فوٹو کھنچوائے تھے۔

لیکن جیوتشی جی کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر ایسے اتفاق سے ملنے والا دھن پاپ کا، کالا، ناپاک دھن ہو تو اس کا انجام مہلک ہوتا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ چھبیس جون ۲۰۰۱ء کی رات لگ بھگ بارہ بج کر دس منٹ پر اسی پاپ کے گھات سے رام نواس اور اس کے سپنوں کا پرتشدد انجام ہوا۔

لیکن آپ پوچھیں گے کہ وہ راز کون سا ہے جو میں اس کہانی کی اوٹ کے پیچھے چھپ کر آپ تک پہنچانا چاہتا تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اُس رات رام نواس جب کلدیپ عرف کلّا کے ساتھ رج روڈ پر مارا گیا تو بنا نمبر والی ایسٹیم سے صرف تیئیس لاکھ روپے ہی برآمد ہوئے۔ اس میں بھی پانچ سو کے بہتیرے نوٹ جعلی تھے، جبکہ اصلیت یہ ہے کہ اس دیوار کی کھوکھل سے لگ بھگ بیس کروڑ روپے نکلے تھے۔ جہاں تک اس پولیس افسر کی بات ہے جس کی نگرانی میں آپریشن رام نواس ہوا، وہ بہت عزت دار اور طاقتور پولیس افسر ہے۔ اس کی کئی کوٹھیاں اور فارم ہاؤس ہیں جہاں وہ اکثر پارٹیاں دیتا رہتا ہے۔ ان پارٹیوں میں لیڈر، افسر، صحافی، دانشور، اور ممتاز ادیب آتے ہیں اور شراب پی کر اس کے قالین میں لوٹ جاتے ہیں۔ راجدھانی سے نکلنے والے اخباروں میں اس کا فوٹو آپ اکثر دیکھتے ہوں گے۔ یہ لوگ اب ہماری

آپ کی طرح آدمی نہیں رہ گئے ہیں، وہ مل جل کر ایک دوسرے ہی برانڈ میں بدل چکے ہیں۔ اگر آپ نظمیں کہانیاں پڑھتے ہوں تو آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ آج کل ان کے اندر سے شراب کی بے تحاشا بو آ رہی ہے، اور ان کے جملوں کے نیچے مرغوں، بکروں اور بے قصور انسانوں کی ہڈیوں کا ڈھیر دکھائی دے رہا ہے۔ اگر آپ اپنی جھاڑو کی موٹھ سے معاصر ادب کو ٹھونکیں تو وہی کھوکھل آپ یہاں بھی دکھائی دے گا جس کے اندر نوٹوں کی گڈیاں بھری ہیں۔ پاپ کا ناپاک کالا دھن۔

میں لگ بھگ چوتھائی صدی سے اپنے دیس کی راجدھانی دلّی میں ہوں اور ڈرا ہوا ہوں۔ مجھے شک ہے کہ رام نواس نے اس پولیس افسر کو یہ بتا دیا ہے کہ دلّی کی دیوار کے کھوکھل کا راز اس کی زبانی مجھے پتا چل چکا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ فی الحال میرا جیون کتنا خطرے میں ہے۔

اس کے باوجود جتنے بھی تھوڑے بہت دن یا مہینے یا سال اس بدحال زندگی کے باقی ہیں، میری آرزو ہے کہ میں بھی رام نواس کی طرح اپنے سپنوں کے سنسار میں کسی طرح ایک بار داخل ہو جاؤں۔

تو اس لیے آج کل ہر روز آدھی رات کو، جب ساری دلّی نیند میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے، میں کالے کپڑے پہن کر ایک ہاتھ میں کدال اور دوسرے میں ایک سبّل لے کر نکل پڑتا ہوں اور دلّی کی دیواروں کو اندھیرے میں ٹھونکتا رہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ دلّی کی زیادہ تر دیواروں میں بے شمار کھوکھل ہیں اور وہاں بے پناہ دھن موجود ہے۔ ایسا دھن جو پوری طرح ان اکاؤنٹڈ ہے۔ مجھے گہرا پچھتاوا اس بات کا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے پچیس سال فالتو میں برباد کیے۔ پچیس دن بھی اگر میں نے یہاں کی دیواروں کو ٹھونکنے میں لگائے ہوتے تو اب تک میں کروڑ پتی ہو گیا ہوتا اور ایک باعزت زندگی گذار رہا ہوتا۔

اگر آپ یہ کہانی پڑھ لیں تو سبل اور کدال لے کر فوراً دلّی کی طرف روانہ ہو لیں۔ کروڑ پتی بننے اور چھپر پھاڑ کر آنے والی دولت کا یہی ایک راستہ اب بچا ہے۔ محنت، ایمان داری، صلاحیت، لگن وغیرہ کے راستے پر چل کر اگر آپ جینا چاہیں گے تو بھوکوں مر جائیں گے اور پولیس والے آپ کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ آپ کو پتا ہی ہوگا، آنند نرائن ملّا نام کے ایک بے باک جج نے کہا تھا کہ بھارتی پولیس دراصل غنڈوں اور مجرموں کا ایک منظم قانونی گروہ ہے۔

میں فی الحال کنگز وے کیمپ کے کورونیشن پارک میں انگریز سمراٹ اور دوسرے حکمرانوں کی ٹوٹی پھوٹی مورتیوں کے بیچ کوڑھیوں، بھک منگوں، اسمگلیوں اور لاوارث غیر شہریوں کے بیچ سوتا ہوں۔ میں خود بھی انھی مورتیوں کی طرح ٹوٹا پھوٹا ہوں۔ ریڑھ کی ہڈی گل چکی ہے اور ہڈیوں کی ٹی بی کا روگ مجھے لگ چکا ہے۔ کبھی کبھی موقع لگتا ہے تو دلّی کے چڑیا گھر کے آگے حضرت نظام الدین کی درگاہ کے سنگ مرمر کے فرش پر گھنٹوں بیٹھا رہتا ہوں اور وہی جملہ دہراتا ہوں جو اولیا نے دلّی کے بادشاہ غیاث الدین تغلق سے کہا

تھا اور جس کے بعد بادشاہ تغلق شراب اور جشن میں ڈوبا فقط ایک شامیانے کے ڈھے جانے سے دلّی کی سرحد پر ہی مر گیا تھا۔ وہ جگہ اب تغلق آباد کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اولیا کا وہ جملہ تھا، ''ہنوز دلّی دور است۔'' یعنی ابھی دلّی دور ہے۔

جہاں پر اولیا کی درگاہ ہے وہیں پر امیر خسرو کا مزار بھی ہے۔ وہی امیر خسرو جو ہندی کھڑی بولی کے پہلے شاعر تھے اور جنھوں نے اپنی زندگی میں دلّی میں گیارہ بادشاہوں، ان کے درباریوں اور ان کے خوشامدیوں کا اٹھنا اور گرنا دیکھا تھا۔ آپ اگر وہاں جا کر سید حسن نظامی کا رجسٹر دیکھیں تو اس میں میرا نام لکھا ملے گا۔ یقین مانیے وہاں میں صرف اپنی ہی نہیں آپ سب کی اور اپنے پیارے وطن کی خیریت کی دعا مانگتا رہتا ہوں۔ بھروسا رکھیں، اولیا تک میری دعا ضرور پہنچ رہی ہوگی۔

اور جلد ہی، اگر پولیس اور دلّی کے طاقتوروں نے مجھے کسی جھوٹے جرم میں پھنسا نہیں دیا تو اپنی کدال اور سبل کے بل پر میں دلّی کی ان گنت دیواروں کی کھوکھلوں میں چھپی دولت کو ایک دن ضرور کھوج لوں گا۔

آپ بھی اگر اپنی قسمت سدھارنا چاہتے ہوں تو جہاں کہیں بھی ہوں دلّی کے لیے فوراً روانہ ہو جائیں۔ دلّی دور نہیں ہے، یقین کیجیے۔ کروڑپتی بننے کا یہی ایک راستہ اب بچا ہے۔ دوسرے راستے اخباروں اور میڈیا کی طرف سے پھیلائی گئی افواہیں ہیں۔

اور کچھ بھی نہیں۔

لکھنے والوں کا تعارف

پھنیشور ناتھ رینو

۱۹۲۱ء میں بہار کے ایک گاؤں میں پیدا ہوے۔ بہت کم عمری میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا اور ہندوستان چھوڑو تحریک میں شامل ہوے۔ قید اور جسمانی معذوری سے دوچار ہونے کے وجود انھوں نے اپنی ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ وہ ہندی میں نئی کہانی کی تحریک سے وابستہ نسل میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھیں ۱۹۵۴ء میں شائع ہونے والے پہلے ہی ناول ''میلا آنچل'' سے مقبولیت حاصل ہو گئی اور اس ناول نے ہندی فکشن میں ایک نئے دور کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے ادبی اور شستہ ہندی کے ساتھ ساتھ دیہاتی لہجوں کو ان کے تمام لسانی اتار چڑھاؤ کے ساتھ استعمال کیا جو ان کا منفرد رنگ ہے۔ ان کا دوسرا ناول ''پرتی پری کتھا'' ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا اور کہانیوں کے تین مجموعے شائع ہوے۔ ان کی کہانی 'تیسری قسم' پر فلم بھی بنائی گئی۔ انھوں نے ۱۹۷۷ء میں انتقال کیا۔

ہردیش

۱۹۳۰ء میں شاہجہاں پور اتر پردیش میں پیدا ہوے اور تعلیم پانے کے بعد وہیں کی ضلع عدالت میں ملازم ہو گئے۔ انھوں نے ادبی سماجیات سے الگ تھلگ رہ کر ہندی فکشن میں اپنی متواتر شائع ہونے والی تحریروں سے اپنا مقام بنایا ہے۔ ان کی پہلی کہانی ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی تھی اور تب سے کہانیوں کے پانچ مجموعے اور پانچ ناول شائع ہو چکے ہیں۔

رام درش مشر

۱۹۲۴ء میں اتر پردیش کے گورکھپور ضلع میں پیدا ہوے۔ بنارس یونیورسٹی سے انھوں نے ہندی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا اور پھر کئی سال تک دہلی یونیورسٹی میں ہندی کے پروفیسر رہے۔ ان کی تحریروں میں دس ناول، کہانیوں کے سات مجموعے، نظموں کے سات مجموعے، مضامین، تنقید اور چار سفرناموں پر مشتمل خودنوشت سوانح شامل ہیں۔

گری راج کشور

۱۹۳۶ء میں مظفر نگر، اتر پردیش، میں پیدا ہوے اور آگرہ میں تعلیم پائی۔ انھوں نے اپنے اسکول کے زمانے میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی شائع شدہ تحریروں میں دس ناول، کہانیوں کے سات مجموعے اور چھ ڈرامے شامل ہیں۔ آج کل وہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، کانپور، کے کری ایٹو رائٹنگ اور مطبوعات کے شعبے سے وابستہ ہیں۔

سنجے کھاتی

۱۸ اپریل ۱۹۶۲ء کو الموڑہ، اتر پردیش، میں پیدا ہوے۔ ہندی میں ایم اے کیا۔ ہندی اخبار ''نو بھارت ٹائمز'' سے وابستہ ہیں اور غازی آباد میں رہتے ہیں۔ مختلف رسالوں میں ان کی کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔

موہن راکیش

۱۹۲۵ء میں امرتسر، پنجاب، میں پیدا ہوے۔ ہندو کالج، امرتسر، اور اورینٹل کالج، لاہور، میں تعلیم پائی۔ انھوں نے ہندی اور سنسکرت میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد الفنسٹن کالج، بمبئی، اور ڈی اے وی کالج، جالندھر، کے ہندی شعبے میں استاد رہے۔ بارہ سال تدریس کے بعد انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے کر کل وقتی ادیب کا مشغلہ اختیار کر لیا۔ جالندھر اور دلّی میں ادارتی سرگرمیوں میں مشغول رہے اور ایک برس تک ''ساریکا''، بمبئی، کے ایڈیٹر رہے۔ موہن راکیش کی تحریر کا آغاز ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ انھیں ''نئی کہانی'' کی تحریک کی نمایاں شخصیات میں شامل کیا جاتا ہے۔ ان کے کئی ناول اور کہانیوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ہندی تھیٹر کے بھی بہت اہم رکن رہے۔ ان کا کھیل ''آدھے ادھورے'' کئی زبانوں میں کھیلا جا چکا ہے۔

راجیندر یادو

اگست ۱۹۲۹ء میں آگرہ، اتر پردیش، میں پیدا ہوے۔ وہیں تعلیم مکمل کی اور ۱۹۵۱ء میں ایم اے کیا۔ پہلی تحریر ''پرتی ہنسا'' (کہانی) ۱۹۴۷ء میں چھپی۔ تب سے لکھنا ہی کل وقتی مشغلہ ہے۔ نوکری کبھی نہیں کی۔ دس برس کلکتے میں رہے۔ ۱۹۶۴ء سے دلّی میں رہ رہے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں کتابوں کی اشاعت کی ابتدا کی اور

اپنا ادارہ ''اکھشر پرکاشن'' قائم کیا۔ ان کے ناول ''سارا آکاش'' پر اسی نام سے فلم بھی بن چکی ہے۔ ۱۹۸۶ء سے دلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''ہنس'' کے مدیر ہیں۔ ترگنیف، چیخوف اور کامیو کی تحریروں کے ہندی ترجمے بھی کر چکے ہیں۔ کہانیوں کے مجموعے: ''دیوتاؤں کی مرتیو''، ''کھیل کھلونے''، ''جہاں لکشمی قید ہے''، ''اِھیمنیو کی آتم ہتیا''، ''چھوٹے چھوٹے تاج محل''، ''کنارے سے کنارے تک''، ''ٹوٹنا''، ''ڈھول''، ''اپنے پار''، ''وہاں تک پہنچنے کی دوڑ''، ''چوکھٹے توڑتے ترِکون''۔ ناول: ''سارا آکاش''، ''اکھڑے ہوئے لوگ''، ''شہ اور مات''، ''کلٹا''، ''ایک انچ مسکان'' (منوبھنڈاری کے ساتھ)، ''ان دیکھے ان جان پُل''، ''منتر ودھ''۔ شاعری کا مجموعہ: ''آواز تیری ہے''۔ خودنوشت سوانح: ''اوروں کے بہانے''۔ اس کے علاوہ تنقید اور متفرق مضامین پر مشتمل کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ستین کمار

۲۰ اپریل ۱۹۴۴ء کو مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئے۔ ساگر یونیورسٹی سے فارمیسی کی تعلیم حاصل کی اور کئی برسوں تک گاندھی میڈیکل کالج بھوپال میں تدریس سے وابستہ رہے۔ اب آزادانہ طور پر تخلیقی کام میں مصروف ہیں۔ ان کی کہانیوں کے تین مجموعے ''جہاز''، ''برف'' اور ''ایک نام'' شائع ہو چکے ہیں۔ منظور احتشام کے ساتھ مل کر انھوں نے ایک ڈراما ''ایک تھا بادشاہ'' تحریر کیا۔ کہانی ''جہاز'' پر ان کو رسالہ ''کہانی'' کی طرف سے یش پال ایوارڈ ملا۔ گہرے مشاہدے اور جزئیات نگاری کے لیے معروف ہیں۔

اُدے پرکاش

جنوری ۱۹۵۲ء میں چھتیس گڑھ انچل کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دلی، میں تعلیم مکمل کی۔ شاعر اور کہانی کار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ٹائمز آف انڈیا پبلیکیشنز کے ہندی رسالے ''دِنمان'' کے ادارتی عملے میں شامل رہ چکے ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں نظم ''تبت'' پر بھارت بھوشن اگروال ایوارڈ اور ۱۹۸۳ء میں کہانیوں کے مجموعے ''دریائی گھوڑا'' پر اوم پرکاش ایوارڈ پایا۔ کہانیوں کے مجموعے: ''دریائی گھوڑا''، ''ترچھ''، ''اورانت میں پرارتھنا''، ''پال گومرا کا اسکوٹر''۔ ناول: ''پیلی چھتری والی لڑکی''۔ نظموں کے مجموعے: ''سنو کاریگر''، ''ابوتر کبوتر''، ''رات میں ہارمونیم''۔ مضامین: ''ایشور کی آنکھ''۔

عربی کہانیاں

انتخاب اور ترتیب: اجمل کمال

Rs.180

قرۃ العین حیدر کے خطوط

ایک دوست کے نام

ترتیب: خالد حسن

Rs.180

ہندی کہانیاں (۱)

''آج'' شمارہ ۱۸ کتاب کی صورت میں

انتخاب اور ترتیب: اجمل کمال

Rs.180

ہندی کہانیاں (۳)

''آج'' شمارہ ۳۸ کتاب کی صورت میں

انتخاب اور ترتیب: اجمل کمال

Rs.180